۲۸

میں اپنا عشق باطن کا کسے اظہار نا کر سوں
درونے میں کے باتاں کیں یکایک بھار نا کر سوں

خوشی تو مکہ دکھائی ہے و لے سوگند کھاتا ہوں
کہ جیسی منج خوشی ہوئی بی بغیر از یار نا کر سوں

نہ کرسوں آج تھے رندی نہ پی سوں مد کے پیالے کر
کیا تھا لئی برائی توبہ و لے اتبار نا کر سوں

مل اس کے زلف سوں ایک ہور تے منج کاں سکت ہوگا
تنگ دبلا کر اس تن کوں جو باریک تار نا کر سوں

خضر کے سار ہووے باج اس امرت چشمے تیئں
جھٹیں بدنام اپس کوں میں سکندر سار نا کر سوں

بڑا چنچل دو ہے نقطے تمن جیسکے سینٹر سے ۔ نا
اگر جو ند مدعیں اس کے اپس پرکار نا کر سوں

غواصی شہ کی مجلس میں نہ پا سوں تو تلک زینت
جو سر تھے پانوں لگ اپس درِ شہوار نا کر سوں

۲۹

جیالاں شاہ کے چن چن بچن نادر لیا تے ہیں
دلاں کے آسماناں کے ہو تارے جگمگاتے ہیں

غزل ہور گیت ہر یک جو کتے ہیں عاشقانہ شہ
جھرتے امرت کے ہو عشق بازاں کو جلاتے ہیں

بچن قطب جہاں کا ہر بچن کا بادشہ ہے کر
ملک آ عرش کے لک آرزو سوں لگ کہاتے ہیں

لطافت ہور نزاکت سوں بھریا سو شعر حسن شہ کا
صفا پا مرحبا بھیجیں جکوئی کامل کہاتے ہیں

علی شاہ ولایت کی عنایت کا نظیر ہے کر
نوے مضموں اپل یوں شاہ کے دل میں تہ آتے ہیں

جہاں تاں جگ میں پسرے دیکہ جوتی شاہ کے باتاں
رتن کھاناں کے ہور موتی دریا کے رشک کھاتے ہیں

بلاغت اور فصاحت میں نہیں اس شہ کوں جوڑا کر
چندر ہور سور ملکے ملک نس دن جا سرا تے ہیں

نہ کیوں قرباں ہووں اس سجن کے ہر بچن پر میں
کہ صیقل ہو کے میرے دل کے درپن کو منجاتے ہیں

جہاں اس جگت گرو شاہ کے سارے غلاماں ہیں
یہی دولت منجے بس جو غواصی کوں بلاتے ہیں

۔ اچھنا۔ رہنا ۔ دھانا۔ تیزی سے آگے بڑھنا ۔ سراہے ۔ لحو لحو ۔ زلف۔ بال ۔ نہایت ۔ ڈالنے کے بجائے ۔ باندھے ۔ دیکھو ۔ دیکھ کر ۔ درخت ۔ خوف زدہ ۔ رکھا ہیں ۔ مکر و فریب ۔ ڈوب ۔ کر ۔ قدم قدم ۔ آہستہ ۔ عمر ۔ کہاں ۔ سچ بس گیا ۔ پکڑا ۔ لاؤں ۔ سمجھانا۔ مجھ سے دیکھنا ۔ کر سکوں ۔ کیا بار ۔ ہونے ۔ محسوس ۔ چاروں طرف ۔ جب ۔ بھر لے ۔ نمک ۔ ڈال ۔ موتی ۔ کلیوں ۔ ملکوں ۔ اچھے ہیں ۔ ہمایں ۔ بجت کرو۔

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

جلد (۴۳) شمارہ (۱-۲) جنوری، فروری ۱۹۸۲ء

مدیر اعزازی : ڈاکٹر مغنی تبسم

معاون مدیر : وقار خلیل

قیمت فی پرچہ: ایک روپیہ پچھتر پیسے

ادارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

زرِ سالانہ	بیرونی ملکوں سے		
		ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
۴۰ روپے کتب خانوں سے!	مشرقِ وسطیٰ	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
۲۵ روپے	امریکہ	۱۶ ڈالر	۶ ڈالر
بذریعہ رجسٹری!	پاکستان، برما، سیلون	۸ ڈالر	۲½ ڈالر
[illegible] روپے	انگلستان	۷ پونڈ	۳ پونڈ

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان، حیدرآباد ۲۰

فہرست

ایوانِ اردو ایک نظر

۲۵ جنوری ۱۹۳۱ء: ادارۂ ادبیاتِ اردو قائم ہوا۔

۸ جنوری ۱۹۴۱ء: فراہمی زمین و عمارت کے لیے جد و جہد شروع کی گئی۔

۳۰ جنوری ۱۹۳۶ء: حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے ادارہ کی عمارت کا نام ایوان اردو تجویز کیا۔

۲۲ جنوری ۱۹۵۵ء: ادارۂ ادبیات اردو کی سلور جوبلی منائی گئی۔

۱۵ اپریل ۱۹۵۵ء: ادارہ کی مجلس انتظامی نے محترمہ تہنیت النساء (بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور) سے عمارت کے لیے زمین عطا کرنے کی خواہش کی۔

۳ اکتوبر ۱۹۵۵ء: بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور نے اس قطعہ زمین کی ادارہ کے نام بطور عطیہ رجسٹری کرادی۔

۲۵ اکتوبر ۱۹۵۵ء: مسٹر ادوکمن فیاض الدین صاحب نظامی چیف ٹاون پلانر نے نقشہ مکمل کیا۔

۹ نومبر ۱۹۵۵ء: حیدرآباد کے چیف منسٹر ڈاکٹر بی رام کرشنا راو نے سنگ بنیاد رکھا۔ حکومت ہائے ہند، کشمیر و آندھرا پردیش کے علاوہ حضور نظام کے چیریٹی ٹرسٹ، سالار جنگ اسٹیٹ، نظام شوگر فیاکٹری، سنگارینی کالریز اور عوامی عطیوں اور چندوں سے تقریباً ۵ سال کی مدت میں سوا لاکھ روپیوں کے صرفہ سے ایوان اردو کی تعمیر مکمل ہوئی۔

۲۲ مارچ ۱۹۶۰ء: جناب بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر نے اس کا افتتاح فرمایا اور جناب بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش نے افتتاحی جلسے کی صدارت فرمائی۔

اور اب ۳ مارچ ۱۹۸۲ء کو ادارہ ادبیات اردو کی گولڈن جوبلی تقاریب کا افتتاح یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر عمل میں آیا۔ جناب محمد ہدایت اللہ صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند نے فرمایا۔

سعادت سعید

ادب اور انفرادی ایمائیت

زندہ ادبی تخلیق جدلیاتی حوصلوں، ارادوں اور تمناؤں کی نقیب ہے۔ مجہولیت اور انفعالیت کے مغلوب فن کار خواب خرگوش میں مبتلا زوال پذیر معاشرتی مشین کا پرزہ بن کر زوال آفریں قوتوں کو استحکام بخشتے ہیں۔ بے عملی یا نیند میں چلنے کا عمل ان کے حقیقی جوہر کو برباد کرنے کا باعث ہے۔ کولھو کے بیل کی صورت گردش کرنا یا سائیلنسر سے نکلنے والے دھوئیں کی مانند پیچھے رہ جانا وجود کی فنا سے ہمکناری ہے۔ جن فن کاروں کا وجود فنا کے دائرے میں گرداں ہو وہ سماجی، قومی یا انسانی بقا کی خوشبوئیں کیسے بکھیر سکتے ہیں۔ جیتے جی بے گور و کفن میت بننے والے انسانی غموں میں لمحاتی شرکت تو کر سکتے ہیں استقلالی شرکت کے لیے عمل اور علم کے تجربوں کی تشکیل از بس ضروری ہے۔ ترکِ دنیا تیاگ، وجود تغیر تاریخ، تذلیل حرکت اور توقیر انجماد انسان کو شے میں بدلنے کے لیے کافی ہیں۔ شے جو عجائب گھروں کی زینت ہے، اونچی دوکان کے شوکیس میں آویزاں ہے، آتشدان پہ آراستہ ہے، طاق میں پڑی ہے، خریدی جاتی ہے بیچی جاتی ہے، استعمال میں لائی جاتی ہے۔ دیکھی جاتی ہے، سنبھال کر رکھی جاتی ہے، خود سرگرم حصہ نہیں ہوتی ہے، مشروطیت کی شکار ہے۔ مجہول ہے، منفعل ہے، بے عمل ہے، بے روح ہے۔ فہیم جوزی لکھتے ہیں ["مایوسی وجود کی ایسی صورت حال ہے جس میں معروضی صورت حال کا جبر وجود کی ......

...... موضوعیت کو کھا جائے، خارجی جبر اتنا شدید ہو جائے کہ وجود کی تخلیقی فعلیت ختم ہو جائے۔ فرد بانجھ ہو جائے، جنم دینے کے تمام امکانات ختم ہو جائیں"] [پیش لفظ احتجاج ص ۷]

انفعالیت زدہ فن کار حال کے تلخ حقائق سے مفرور یا تو مستقبل کے موہوم سایوں کا متلاشی رہتا ہے یا ماضی پرستی اور قدامت پسندی کے رویے اس کے اعصاب پر غبار کے مانند مسلط ہو جاتے ہیں۔ حال کے عذابوں، مصیبتوں اور تقاضوں سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے مشاہدے کے دریچے مقفل کر کے نارسا تمناؤں کا نوحہ خواں ہوتا ہے۔ فرقت زدہ ماضی کی المناکی کی حکایتیں کہتا ہے۔ اپنی ذات کے محبس اور چھریلے حصار میں چھپ کر اپنے [illegible] کی خواب سازی میں مبتلا رہتا ہے۔ [illegible] کو واپس لاتا ہے۔ واہموں اور [illegible] خوف بن کر اس کے [illegible] جاتا ہے۔

زندہ ادبی تخلیق یاسیت، فرار، نارسا خواہشات، مجرمانہ واردات اور منفی تشکیلات پر مبنی نہیں ہوتی۔ اس میں ایک ایسا فکری تناظر پیدا ہوتا ہے جو تضادات اور آشوب کی جانکاہ صورتِ حال میں، امید، تگ و دو، جرأت اور حوصلہ مندی کے تاثرات سے معمور، قارئین کے شعور کی نشوونما ممد ہے۔ مروجہ سماجی تنظیم کے عطا کردہ ادراک اور مابعد الطبیعات جس میں زر و مال تو مخصوص گروہوں کا مقدر ہوتا ہے اور غم و اندوہ کا ذخیرہ مجبور لوگوں کا حصہ ٹھہرتا ہے۔ جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہو وہ رذیل، گھٹیا درجۂ انسانیت سے گرا ہوا کہلاتا ہے۔ اسپ تازی پالان کے نیچے زخمی ہو جاتا ہے اور گدھوں کی گردن میں سونے کا پٹا ڈالا جاتا ہے۔ زندگی کے حوصلے اور نعمتیں صاحبِ ثروت کے لیے وقف ہوتی ہیں اور یاسیت اور انفعالیت غریب غربا کا فکری راتب! اس ادراک اور مابعد الطبیعات کو بہ آسانی ارسطا طالیسی ادراک اور مابعد الطبیعات کا نام دیا جا سکتا ہے یا زیادہ ٹھوس حوالے کے لیے ہندوؤں کے نظامِ ذات پات کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔

زندہ ادبی تخلیق میں ماحصل کی جمع پونجی میں مزید اضافہ کرنے کی جد و جہد مطعون ٹھہرتی ہے اور ماحصل میں ایمائیت کا اظہار ہوتا ہے۔ کوہکن عشق کرتا ہے تو عشرتِ تجمہ خسرو کا گرسنہ مزدور ہی رہتا ہے اور قیس رقیبِ سر و ساماں ہے اور تصویر کے پردے میں بھی عریاں نظر آتا ہے۔ لاحاصل کی ایمائیت زندہ ادبی تخلیق میں غلامی کے پرچارک انسانوں کو ملیچھ کا درجہ دیتی ہے۔ غلامی پرست گھسنہ کردار دیگر انسانوں کو انسان سمجھنے کی بجائے اشیا سمجھتے ہیں اور انھیں اپنے نجی مفادات کے حصول کا ذریعہ یا مقصد جانتے ہیں یہ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود ہوتے ہیں اور تیشے بغیر نہیں مر سکتے یعنی روایت پرست اور روایت کی ناشرم نافذ کرنے والے! زندہ ادبی تخلیق میں ایسے انسان کے طرزِ احساس و فکر کا غلبہ ہوتا ہے جس کا نصب العین آزادیٔ کامل کی تحصیل ہے۔ شر سے لے کر طمع تک کے تمام باطل انسانی رویوں کا آپریشن کیا جاتا ہے۔ آزادیٔ کامل کا تصور لفظوں کے لہو میں شامل کرنا اور اس کا بے بنیاد اشتہار مرتب کرنا دو متضاد سلسلے ہیں۔ یہ تصور اگر لفظوں کے رگ و ریشہ میں رواں ہو تو تخلیقیت کا سرچشمہ ہے اور اگر ان کا خول ہے تو نعرہ بازی ہے۔ نعرہ بازی بھی یاسیت اور انفعالیت پیدا کرنے کا ایک اور ذریعہ ہے یعنی بے معنی خواب دکھانے اور گمراہ کرنے کا ایک اور ہتھیار یا مہلک ہتھیار جو روحوں کے حقیقی حوصلوں کی بنیادوں پر حملہ آور ہوتا ہے! درجہ بند سماج میں فرد کی آزادیٔ کامل ممکن نہیں۔ اغراض پرست یا کج فکری کے شکار فن کار ذاتی خواہشات کی عدم برآری یا انسانی فطری احتیاجات کے پورا نہ ہونے پر آنسو بھی بہاتے ہیں اور بے عملی کے دائرے میں گرفتار بھی ہوتے ہیں۔ ان کے برعکس بے غرض اور صائب سوچ رکھنے والے فن کار ایسے معاشرے کی تشکیل کی تدابیر سوچتے ہیں جس میں اجتماعی، ذاتی اور فطری تقاضے پورے ہو سکتے ہیں۔ یوں وہ آزادیٔ کامل کے امکانات کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے علمی اور عملی جہاد کو احسن جانتے ہیں۔ وہ مفاد پرست

سماجی نظام اقدار کو تقویت دینے اور لاایمانیت کی زندگی گزارنے کی بجائے آزاد انسانی کردار کے ہمہ رنگی تقاضوں کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں۔

نئی شعری اور ادبی صورت حال میں مجہولیت اور انفعالیت کے ساتھ ساتھ بے یقینی، لاتعلقی اور بے معنویت کے تصورات کا بھی بڑے زور و شور سے چرچا کیا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں یہ تصورات دو صورتیں رکھتے ہیں (۱) نئی مغربی ادبی تحریکوں کے زیر اثر فیشن کے طور پر ان کا استعمال (۲) مروجہ معاشرتی تنظیم کے تضادات کے پس منظر میں ان کا فطری ابھار۔ پہلی کی نسبت دوسری صورت مقامی رنگ سے لبریز زیادہ بامعنی ہے۔ مغربی ابسرڈ ادب ([illegible]) یا تکنیک سے معمور فلسفے یا سماج سے غیر متعلق تکنیکی ادب کی طوفانی یلغار ہمیں ہمارے مسائل سے جدا کر رہی ہے۔ انتہائی درجے کے "ترقی یافتہ" معاشروں کے رویے، افکار، مسائل، جذبے اور ثقافت "ترقی پذیر" یا "پسماندہ" معاشروں سے کلی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ آئیونیسکو، سینٹ جان پرس، ورجینیا وولف، البرٹ کامیو، سیموئیل بیکٹ، ای ای کمنگز، راں ڈیمنے، اور جیمز جوائس وغیرہ کے ادبی اور سماجی تجربے ہمارے لیے حوالے کی شے تو ہو سکتے ہیں تقلیدی نمونے نہیں! یہ ادیب و شاعر جن معاشروں میں متحرک رہے ہیں وہ سائنسی اور مشینی ترقی کی انتہاؤں کو چھو رہے ہیں۔ انسان سے زیادہ کمپیوٹر پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ خلائی ساختوں سے آشنا ہیں۔ آسائشوں اور سہولتوں سے معمور ہیں۔ قیمتی کاریں، ذاتی ہیلی کوپٹر، عظیم الشان ائرکنڈیشنڈ عمارتیں، بڑے بڑے جنت نشاں ہوٹل، آرام دہ ہوائی مسافتیں، دولت کی فراوانی، آرائشات و ملبوسات کی رنگارنگی، فلم، تھیٹر، ٹیلی ویژن کی تکنیکی ترقی، تعمیر ٹھنڈی، رنگین کوٹھیوں، زندگی کی تیز رفتاری، ایٹمی کارخانوں، ہیڈروجن بموں، بین البراعظمی میزائلوں اور استحصالوں میں یکتا ہیں! سائنسی اور تکنیکی ترقی از خود کسی منفی عمل کی نشاندہی نہیں کرتی۔ اس کے غلط استعمال کی وجہ سے مغرب بے یقینی، لاتعلقی اور بے معنویت کی صورت حال سے دوچار ہے۔ یہ اشیا انسان کی بہتری اور اس کے نظام معاشرت کو پرسکون، آرام دہ اور اطمینان بخش بنانے کے لیے وجود میں آئی تھیں لیکن مفاد پرست گروہوں کی اجارہ داریوں کی وجہ سے انسانیت اپنے انسانی مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ مغربی انسان بے احترام، کرخت، بے صبر، ناشائستہ، ناراض، گرم گفتار، علاحدگی پسند، خود رحم، غصیلا، متنفر، ناامید، یاسیت کا شکار اور تشدد کا پرچارک ہے۔ نسلی برتری کا ڈھول پیٹ رہا ہے۔ افیم، بھنگ، چرس، شراب، عورت، موسیقی، جنگ اور فکری شعبدہ بازیاں اس کا مقدر ہیں۔ نیم عریاں جنسی ناچ، لذت آفریں جنسی تصویریں، غیر فطری معاشرتی حرکات اس کا نصب العین ہیں۔ جدید مغربی ادب کا بیشتر حصہ انسان کے ذہنی اعمال اور نفسی کیفیات کا داستان گو ہے۔ مشینی اور تکنیکی انقلاب کی بدولت ان معاشروں میں بڑے پیمانے پر معاشی اور سیاسی اجارہ داریاں قائم ہو چکی ہیں۔ اہل دول سماجی عزت کے حق دار قرار

دیے گئے ہیں۔ بڑے بزنس والے معاشرے کی آنکھوں کا سکھ اور کلیجے کی ٹھنڈک ٹھہرے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے اجارہ دار پسماندہ ممالک کے معاشی وسائل اور تجارتی منڈیوں کو اپنے قبضہ میں لے چکے ہیں۔ سیاسی بازی گری اور سامراجی شعبدہ بازیوں سے کون واقف نہیں ہے؟ بڑے ممالک اپنے کارخانوں کے زائد مال کو دنیا کے دیگر علاقوں میں کھپانے کے لیے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے پسماندہ ممالک کی داخلی پالیسیوں پر بھی مکمل طور پر قابض ہوتے ہیں۔ اپنا اتوسیع مقاصد کرنے کے لیے ان ممالک میں مقامی اختلافات کو ہوا دی جاتی ہے۔ زبان، کلچر، اور نسل کے مسائل زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ مقامی افراد نادانستہ طور پر باطل مسائل کے بوجھ تلے دب کر مغلوب بے معنویت غلام ادراک، درآمدی تشکیک اور مفاداتی لاتعلقی کا نشانہ بنتے ہیں۔ ان کی تخلیقی زرخیزی تباہ ہو جاتی ہے۔ آشوب اور مسائل کے نرغے میں پھنسا انسان معاشرتی زندگی سے راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔ خودکشی کر لیتا ہے۔ لاتعلق ہو جاتا ہے۔ مصالحت کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ خوف زدہ ہو کر اپنے بچے کچھے سامان سمیٹنے کی کوشش میں مصروف ہوتا ہے۔ طرح طرح کے نفسیاتی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ غالب ادراک اور خود مختار مابعد الطبیعات کے زیر اثر سماجی مسائل، مغلوب ادراک اور محبوس مابعد الطبیعات کے نتیجے میں ظہور پانے والے مسائل سے انتہائی مختلف ہیں۔ مغربی البیمہ ادب ہمارے ٹھوس وجودی مسائل سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا۔ ہماری مخصوص مقامی بے معنویت ہے۔ مخصوص مقامی لاتعلقی اور مخصوص مقامی بے یقینی! ابوالعلا معری نے لکھا ہے۔

[یقین تو زمانے سے ناپید ہو چکا ہے اور اب ہماری عقلوں کا منبع ظن و تخمین ہے۔ ہم شیر سے پوچھتے ہیں کیا تو شیر ہے؟ تو وہ جھجکتے ہوئے شکی انداز میں کہتا ہے شاید، یا ممکن ہے میں شیر ہی ہوں۔]

(افکار ابوالعلا معری)

بے یقینی، بے معنویت اور لاتعلقی کے رویے ادب میں اس لیے زیادہ مستحکم ہوتے ہیں کہ فن کار ٹھوس مسائل سے منقطع اور غیر متعلق رہ کر یا بزدلی، خوف یا کم مائیگی کی نفسیاتی الجھنوں میں الجھ کر زندگی، اشیا، معاشرے اور کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ صورت حال اقبال کے نزدیک خودی کے گم یا ضعیف ہو جانے کی صورتِ حال ہے۔ خودی گم کرنے والے فن کار کئی نوع کے ذہنی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ذہنی امراض جذباتی و فکری کشمکش، وجودی اور اقداری قید اور معاشی و سیاسی حبس سے فروغ پاتے ہیں۔ صنعتی اور زرعی قزاقیت نے جہاں دیگر انسانوں کو شکنجوں میں جکڑا ہے وہاں فن کاروں کو بھی ذہنی اور جذباتی طور پر مفلوج کر دیا ہے۔ مغلوب معاشروں سے مکمل طور پر مصالحت کرنے والے فن کاروں کے ذہنی اور جذباتی کینوس پر اجارہ دار معاشرتی اور تہذیبی اداروں کی نقاشی کا عمل دیکھا جا سکتا ہے۔

مغربی انسان کے ذہنی مسئلہ کا مشاہدہ کرنا ہو تو کیرواک کے مندرجۂ ذیل فقرے ملاحظہ ہوں۔

[ان دانشوروں کو قتل کر دو جو ناقابلِ فہم زبان
ا سکتے ہیں]
[ان لوگوں کو قتل کر دو جو پانچ منٹ تک چپ
نہ سکتے ہوں]
ان نا سمجھ لوگوں کو قتل کر دو جو ایک عورت یا
ے نوکری یا ایک نصب العین کے ساتھ سنجیدگی
ے رشتہ قائم کر سکتے ہوں]
[ترجمہ دیوندر اسر کتاب ادب جدید ذہن]

کیرواک لا ایمائیت اور بے معنویت کا اسیر
یکر ذہنی خودکشی کے عمل سے گزر رہا ہے۔ وہ معاشرتی
نتشار کے کرب کو تو شدت سے محسوس کرتا ہے لیکن
یمائیت کی تحصیل اس کے لیے ناممکن ہے۔ ایمائیت
وجہ صورتِ حال کی تبدیلی کا پیش خیمہ ہے۔ کیرواک
س صورتِ حال کو تبدیل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں
رکھتا۔ وہ فرد جو معاشرتی انتشار کو کرب اور شدت
سے محسوس تو کرتا ہے لیکن اس کے ضمیر میں اس صورتِ
حال کو تبدیل کرنے کی آرزو موجیں نہیں مارتی وہ ذہنی
خودکشی کے عمل سے گزرتا ہے۔ ایسے فرد کے پاس
زندگی کو جانچنے کا تجزیاتی طریق کار نہیں ہوتا۔ زندگی
تجزیہ کرنے کا طریق کار آگاہی بخشتا ہے کہ زندگی،
معاشرے اور انسان میں مثبت اور منفی اقدار کی
کشمکش جاری رہتی ہے۔ مثبت اور منفی اقدار میں فرد
انتخاب کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اگر صرف منفی
اقدار منتخب کر کے کوئی عمل سرانجام دیا جائے تو وہ خود
غرضی، ذاتی منفعت اور خود حفاظتی پر مبنی ہوگا اور
منفی اقدار کی غیر موجودگی کا اعلان کر کے صرف مثبت
اقدار کی ترویج و اشاعت کی جائے تو زندگی کو جانچنے
کے خلائی، ماورائی اور تصوراتی حوالے کے علاوہ اور
کچھ ہاتھ نہیں لگے گا۔ حقیقت کو پانے کا حقیقی طریق کار
تو یہ ہے کہ منفی اور مثبت اقدار کی کشمکش اور تصادم
کو جانتے ہوئے ظالم اور مظلوم، انسان اور حیوان،
اجارہ دار اور مغلوب اقدار کی واضح نشاندہی کی جائے
یہی طریقہ کار ہے جس کے وسیلے سے ذمہ داری محسوس
کرنے والا فن کار اپنے انسانی امکانات بروئے کار لاتا
ہے۔ اس کے ذہن میں معاشرتی، سیاسی، اور معاشی
صورتِ حال کو تبدیل کرنے کی تمنا مستحکم ہوتی ہے۔
خود انتخابی کی صلاحیت اور آزادی کے حصول
کے رویے پر یقین ایمائیت سے معمور جرأت اور حوصلہ
رکھنے والے فن کاروں کے حصے میں آتے ہیں۔ یہ
فن کار یاسیت، انفعالیت، فرار، بے یقینی، لاتعلقی
بے معنویت وغیرہ کے مسائل کو فیشن کے طور پر نہیں اپناتے
ان کی جڑوں کا سراغ لگاتے ہیں۔ ان کا فن حوصلے
اور تبدیلی کے تشدد کا مظہر ہوتا ہے۔ وہ معاشرے
میں غیر انسانی رویوں کو ناپسندیدہ گردانتے ہیں۔ ان
رویوں کی بنیادوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ایسے فن کار
اجارہ داروں کے ریاکارانہ عقیدوں اور اصولوں کی بجائے
سے انفرادی ذمہ داری کے کرب ناک اور دہشت خیز
تصورات اپناتے ہیں۔ سارتر کا کہنا ہے کہ انسان
غلط انتخاب کر کے اپنے جوہر کی صحیح شناخت نہیں کرپاتا
یا پھر وہ ذمہ داری کا بوجھ محسوس کر کے دیگر انسانوں
کے لیے بھی صائب راہ تلاش کرتا ہے۔

انتظار حسین

پورا گیان

منوہر کس سفر پہ نکلا تھا، کس سفر پر نکل گیا۔

برہمن بچہ تھا پھر پڑھنے سے جی اُچاٹ تھا۔ راس رنگ میں دل پڑا رہتا تھا۔ یہ دیکھ ایک دن باپ نے اسے پاس بٹھایا اور سمجھایا کہ بیٹے ہم برہمن لوگ ہیں۔ ودّیا ہمارا دھن ہے۔ گیان ہمارا گہن ہے۔ اگیانی ہونا برہمنوں کو نہیں سجتا۔ بیٹے کو باپ کی بات برچھی بن کر لگی۔ راس رنگ کو تیاگا، پستکوں پر جھک گیا۔ ویدیں، پرانیں، رامائن، مہابھارت کیا کچھ نہیں پڑھا۔ تھوڑے سمے میں سب کچھ پڑھ کر ودھوان بن گیا۔ پھر باپ کے سامنے گیا، چرن چھوئے اور چپ کھڑا ہو گیا۔

باپ نے پوچھا "بیٹا کیا کچھ پڑھا؟"

"جتنا لکھا گیا اتنا کچھ پڑھ لیا۔"

"اور جو نہیں لکھا گیا؟"

اس پر منوہر چکرا گیا۔ باپ مسکرایا اور بولا "بیٹے جتنا لکھا گیا ہے اس سے زیادہ سینوں میں بند ہے۔ اور اے بیٹے، پستکوں سے ودّیا ملتی ہے۔ پر گیان گرو بنا نہیں ملتا۔"

منوہر نے سنا اور ترنت نکل کھڑا ہوا۔ نگر نگر گھوما۔ کتنے پنڈتوں ودھوانوں کے چرن چھوئے، اُپدیش سنے۔ پر روشنی نہ ملی۔ آگے بڑھ لیا۔ آخر نگر چھوڑا، بن کی راہ لی۔ کتنے سنتوں، سادھوؤں کے چرنوں میں بیٹھا، سیوا کی پر جلدی ہی جی اکتا کر آگے بڑھ گیا۔ اور آگے، اور آگے۔ گھنے بنوں میں بڑھتا چلا گیا۔ کبھی دھوپ کبھی مینہ کبھی آندھی کبھی جاڑا پالا۔ پر اس کے پیر آگے اُٹھتے ہی گئے۔ پاؤں رستے کے کانٹوں سے خون خون ہو گئے۔ بھوک پیاس نے ستایا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ پر اسے کسی بات کا دھیان نہیں تھا۔ آتما جو بیکل تھی۔

چلتے چلتے رستے میں ایک گھنے پیپل کی چھاؤں میں ایک کنواں دکھائی دیا۔ ایک موہنی مورت و پنہارن نے کنوئیں میں ڈول ڈال رکھا تھا۔ پیپل چھاؤں میں کنواں، کنوئیں سے ڈول کھینچتی سُندر ناری یہ کچھ دیکھ اُسے اپنی پیاس کا دھیان آیا، پیاس اور تھکن کا۔ بس وہیں منڈیر پہ بیٹھ گیا۔ سندر پنہار نے اسے دیکھا اور پوچھا "اجنبی [illegible] پر کیا لینے آیا ہے؟"

"ناری پردیسی ہوں اور پیاسا ہوں۔"

"پھر پانی پی۔" اور یہ کہہ کے اس نے منوہر کی اوک میں ٹھنڈا میٹھا پانی انڈیل دیا۔ اوک میں پانی انڈیلا تو انڈیلتی ہی چلی گئی کہ اس کی نظریں تو پردیسی کے چہرے پہ جم گئی تھیں۔

"بس کر ناری"

اور تب اس ناری کو دھیان آیا کہ ادھر وہ سیر ہو بھی چکا اور وہ پانی انڈیلے چلی جا رہی ہے۔ اس نے ہاتھ روکا اور ڈول ایک طرف رکھا۔

منوہر نے پانی پیا، ہاتھ منہ دھویا۔ تھوڑی جان میں جان آئی۔ ترنت ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"جا رہا ہے؟"

"ہاں"

"اچھا جا" اس کی آواز مری مری سی تھی۔

اسے جاتے ہوئے تب تک دیکھا کہ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ پر منوہر نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ تو اپنی دھن میں تھا۔ آتما کی بیکلی اسے بنوں میں کھینچے لیے جا رہی تھی۔ بس اسی طور چلتے چلتے ایک گھنی بن میں جا نکلا۔ دیکھا کہ ایک گھنے برگد تلے ایک بوڑھا سادھی لگائے بیٹھا ہے۔ کھال جھری، پسلیاں ایک ایک کر کے گن لو، ڈاڑھی مونچھ کے الجھے گھنے بالوں کے بیچ ہونٹ چھپے ہوئے، آنکھیں موندی ہوئیں، سر کے بال لمبی جٹائیں سفید پٹسن جیسی۔

اس نے سوچا کہ یہ تو کوئی بڑا رشی ہے۔ دل نے کہا کہ اسی کے چرنوں میں بیٹھ جاؤ۔ جٹاؤں کے بیچ چڑیا نے کہ وہاں گھونسلہ بنائے بیٹھی تھی اجنبی کو دیکھ کر چوں چوں کی، پھریری لی اور پھر سے اڑ گئی۔ یہ سمپورنانند رشی تھے۔ آنکھیں کھولیں۔ اسے گھور کر دیکھا۔ پوچھا "بالک، کیسے آنا ہوا؟"

"پربھو، لینے آیا ہوں۔"

"کیا لینے؟"

"گیان کی مایا۔"

"مورکھ، گیان کی مایا من کی شانتی سے ملتی ہے۔"

"پھر من کی شانتی ملے۔"

"من کی شانتی؟ وہ باہر سے نہیں ملتی۔ اندر سے پھوٹتی ہے۔ جا تپ کر۔" اور یہ کہتے کہتے سمپورنانند جی نے دور کھڑے گھنے پیپل کی طرف اشارہ کیا۔

منوہر کہ دھوپ میں چل چل کر مرجھا گیا تھا ایک دم سے کھل اٹھا۔ دل نے کہا کہ گورو مل گیا، اب گیان بھی ملے گا۔ بتائے ہوئے پیپل کی طرف گیا اور اس کی چھاؤں میں بیراسن مار کر بیٹھ گیا۔ دم سادھ لیا، آنکھیں موند لیں، اور دنیا کے خیالوں وچاروں کو دل اور دماغ سے جھٹک کر ایسے الگ کیا جیسے دامن جھٹک کر گرد جھاڑتے ہیں۔ پر جب اس نے آنکھیں موند لیں اور دنیا کے خیالوں وچاروں کو دل اور دماغ سے نکال چکا تو دھیان میں ایک مورت ابھری۔ یہ اسی پنہارن کی موہنی مورت تھی جس نے اسے پانی پلایا تھا۔ بس وہ تو بیکل ہو گیا۔ کتنا اس نے اپنے دھیان کو باندھا۔ مگر وہ مورت کسی نہ کسی اس کے دھیان میں آ جاتی اور اندر سماتی چلی جاتی۔ برس بیتا، دو برس بیتے، برس بیتے چلے گئے۔ دل اسی طرح ڈانواں ڈول تھا

کی وہی بیکلی۔ ہار کر اپنی جگہ سے اٹھا اور سمپورنانند جی کے چرنوں میں جا بیٹھا۔

سمپورنانند جی نے دیر بعد آنکھیں کھولیں، دیکھا۔ پوچھا "بچے کیا حال ہے؟"

ہاتھ جوڑ کر کہا "گورو من بیاکل ہے۔ آتما دکھ میں ہے۔"

"کارن؟"

"واسنائیں۔"

"واسناؤں کو مار۔"

"نہیں مرتیں۔ ستاتی ہیں۔"

"کیسے ستاتی ہیں؟"

"ایسے کہ جب میں آنکھیں موند کر پرماتما سے لو لگاتا ہوں تو ناری دھیان میں آجاتی ہے اور اپنی اور بلاتی ہے۔"

"یاد رکھ اُس اور گیا تو خراب ہوگا۔"

"کیسے خراب ہوں گا؟"

"جیسے راجہ ہرچرن ناری کی اور گیا اور کیسے خراب ہوا۔"

"مورکھ تجھے اس کا پتہ نہیں؟"

"نہیں۔"

"اچھا تو سن کر راجہ ہرچرن کیسے ناری کی چھایا میں گیا اور پھر کیسے اس چھایا نے اُسے چھل دیا" اور سمپورنانند جی نے منوہر کو راجہ ہری چرن کے ناری کی اور جانے اور خراب ہونے کی کہانی سنائی۔

تھوڑی چھایا لمبی دھوپ

ایک تھا راجہ ہرچرن۔ اس کے دیس میں ہر طرح سے سکھ چین تھا۔ دھن برستا تھا۔ دولت کی گنگا بہتی تھی۔ نر ناری سب خوش تھے۔ پرجا اپنے راجہ کو چاہتی تھی۔ راجہ اپنی رانی کو چاہتا تھا۔ بس اسی کے سنگ مگن تھا۔ پرائی ناری کو کبھی بری نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔

ایک دفعہ کیا ہوا کہ راجہ شکار کے لیے نکلا۔ جنگل میں گھومتا پھرتا تھا کہ ایک ہرن دکھائی دیا۔ ہرن کیا چھل بل والا تھا کہ راجہ اسے دیکھ کر لوٹ پوٹ ہوگیا۔ تیر کمان میں جوڑ کر چلا اس کے پیچھے۔ مگر وہ ہرن تو چھلاوا بن گیا۔ راجہ اس کی ٹوہ لیتا ہوا دور تک گیا۔

بہت دور جا کر درختوں کے پرے ایک پرچھائیں سی نظر آئی۔ راجہ نے جانا کہ ہرن ہے۔ پھرتی سے آگے بڑھا مگر درختوں کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ہرن تو کوئی نہیں، ہاں ایک ناری چھیل چھبیلی ایک گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھی ہے راجہ اسے دیکھ کر موہت ہوگیا۔ جہاں تھا وہیں جم گیا جانو کہ بت بن گیا۔ ناری نے اسے اس حال میں دیکھا اور پوچھا "مرد وشے تیری کیا نیت ہے؟"

بولا "سندری، میں لمبی یاترا سے آرہا ہوں۔ دھوپ میں کتنا چلا ہوں۔"

"پھر چاہتا کیا ہے؟"

"چھایا۔"

ہنسی اور بولی "پھر آجا چھایا میں۔"

یہ سن راجہ پھرتی سے گھوڑے سے اترا اور اس کنج میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اور وہ

بھی اس پہ ایسے چھا گئی جیسے آسمان پہ گھٹا چھا جاتی ہے وہ تو سدھ بدھ کھو بیٹھا۔ پتہ ہی نہ چلا کہ کب دن ڈھلا کب رات پڑی۔ ہاں جب دن چڑھا تب اسے ہوش آیا۔ ہڑبڑا کر اٹھا۔ آنکھیں مل کر ادھر دیکھا ادھر دیکھا ناری کو کہیں نہ پایا۔ ڈھونڈتا ہوا دور تک گیا، کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف اس کا پتہ کہیں نہ پایا۔ بس بیکل ہو گیا۔ بیکلی سی بیکلی۔ راج پاٹ گھر بار سب بھولا۔ دن کا آرام گیا۔ رات کی نیند گئی۔ اس بن میں بھٹکتا پھرتا تھا اور پکارتا تھا

"اے میری ٹھنڈی چھایا میں دھوپ میں ہوں۔"

منوہر نے یہ کہانی سنی۔ چپ رہا جیسے کسی ادھیڑ بن میں ہو۔ پھر بولا "گورو، میں کچھ نہیں سمجھا من اور بیاکل ہو گیا۔"

سمپورنانند جی بولے "بالک اگر تو نہیں سمجھا تو پھر سمجھاتا ہوں۔ تو نے کہا اس ودیارتھی کی کہانی سنی ہے جس نے وہی کیا جس سے ودھوان نے اسے منع کیا تھا۔"

"گورو جی، ودھوان نے کس بات سے منع کیا تھا اور ودیارتھی نے کیا کیا؟"

سمپورنانند جی نے کہا کہ اگر تو نے یہ کہانی نہیں سنی ہے تو پھر سن۔" اور انھوں نے ودیارتھی اور ودھوان کی کہانی سنائی۔

ودھوان اور ودیارتھی

ایک ودیارتھی ایک جٹا دھاری ودھوان کے پاس پہنچا اور کہا کہ ودھوان جی مجھے شکشا دو۔

ودھوان نے کہا کہ لڑکے میں تجھے شکشا دوں گا مگر ایک بات پلے میں باندھ رکھ کہ تجھے ناری سے بات نہیں کرنی ہے۔

ودیارتھی نے اچنبھا کیا اور پوچھا کہ "ناری سے بات کروں گا تو کیا ہو جائے گا؟"

ودھوان نے کہا "ناری تجھ سے بات کرے گی تو مسکرائے گی۔"

"ناری مسکرائے گی تو پھر کیا ہو جائے گا؟"

"پھر تو بھی مسکرائے گا۔"

"میں مسکراؤں گا تو پھر کیا ہو گا؟"

"پھر ناری تجھے مدھ بھرے نینوں سے دیکھے گی اور تجھے لالسا آئے گی۔"

"ناری مجھے مدھ بھرے نینوں سے دیکھے گی اور مجھے لالسا آئے گی تو پھر کیا ہو گا؟"

"پھر تو ناری کے پیچھے دوڑے گا۔"

"ودھوان جی، میں ناری کے پیچھے کیسے دوڑوں گا؟"

"جیسے پرجاپتی ادشا کے پیچھے دوڑتے تھے۔"

"پرجاپتی ادشا کے پیچھے کیسے دوڑے تھے؟"

"پرجاپتی ادشا کے پیچھے ایسے دوڑے تھے کہ وہ ان کی لالسا بھری نظروں کو دیکھ کر ہرنی بن گئی اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ پرجاپتی ہرن بن کر اس کے پیچھے دوڑے اور اس سے ملے۔ پھر وہ مورنی بن گئی اور اڑ گئی۔ پرجاپتی مور بنے اور اس کے پیچھے پیچھے اڑے آخر کو اسے جا لیا اور اس سے ملے۔ پھر وہ گائے بن گئی اور پھر اک کر بھاگی۔ پرجاپتی سانڈ بن کر اس کے پیچھے بھاگے۔ اسے جا دبوچا اور اس سے ملے۔ ادشا نے سو بچھڑے جنے اور سو روپ لیے۔ پھر پرجاپتی نے بھی

اتنے ہی بھیس بدلے، اتنے ہی روپ لیے اور اتنی ہی بار اس سے ملے "

ودیارتھی یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ سارے دن اسی سوچ میں رہا۔ بدھی میں کچھ نہ آیا کہ ودھوان نے جو بات کہی وہ ہوتی کیسے ہے۔

اب سنو کہ جس گلی میں وہ رہتا تھا اسی گلی میں ایک کنیا اس کے برابر والے گھر میں رہتی تھی کہ نام اس کا سرسوتی تھا۔ سرسوتی پر اس نے کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ آج جو اُسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہا۔ دل میں سوچا کہ اس سے بات کر کے تو دیکھوں۔ جب سرسوتی سے بات کی تو سرسوتی مسکرا پڑی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر سرسوتی لجائی اور اسے مدھ بھرے نینوں سے دیکھا۔ سرسوتی کی یہ ادا دیکھ کر اس کا جی اس پر للچانے لگا۔ اس کی للچائی نظروں کو دیکھ کر سرسوتی ایسے بھڑکی جیسے جنگل کی ہرنی پتے کے کھڑکنے پہ بھڑکتی ہے۔ بس وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس کے بھڑکنے اور بھاگنے سے ودیارتھی کی لالسا بھڑک اٹھی۔ لپک کر اس کے پیچھے چلا۔

دوسرے دن ودھوان نے ودیارتھی کا بہت رستہ دیکھا۔ پر وہ نہ آیا۔ وہ تو سرسوتی کے پیچھے ۔ ہوا تھا۔ سرسوتی نے کیا کیا روپ بدلے۔ مگر وہ بھی کم نہیں تھا۔ جتنے اس نے روپ بدلے اتنے ہی اس نے سوانگ بھرے۔ کبھی وہ ہرنی تو یہ ہرن۔ کبھی وہ مورنی تو یہ مور

جب سمپورنانند جی کہانی سنا چکے تو منوہر سوچ میں پڑ گیا۔ چپ رہا، پھر بولا "گورو جی میں کچھ نہیں سمجھا۔ من اپنا اور بیاکل ہو گیا "

گورو جی پیار سے بولے " اچھا بالک پھر سمجھاتا ہوں۔ تو نے وشوامتر جی کی ہتیا میں بھنگ پڑنے کی کہانی تو سنی ہوگی "

منوہر بولا " گورو وہ کیا کہانی ہے "

" اچھا وہ کہانی تو نے نہیں سنی ہے تو لے سن " اور گورو نے چیلے کو وشوامتر جی کی تپیا میں بھنگ پڑنے کی کہانی سنائی۔

تپ میں بھنگ

ایک بار وشوامتر جی نے ایسی تپ کی کہ دیولوک میں کھلبلی پڑ گئی۔ انھیں ڈر پڑ گیا کہ وشوامتر اسی طرح تپ کرتا رہا تو وہ دیوتا بن جائے گا اور پھر وہ ان کی برابری کرے گا۔ وہ سر جوڑ کر بیٹھے اور سوچنے لگے کہ وشوامتر کو دیوتا بننے سے کیسے روکا جائے۔ ایک نے بہت سوچ کر کہا کہ " وشوامتر کی تپ کا کاٹ ناری ہے "

" ناری؟..... وہ کیسے "

" مترو، منش جاتی کی ایک ہی تو کمزوری ہے۔ ناری۔ کیسا کیسا لوہا لاٹھ آدمی ناری کے سامنے موم ہو جاتا ہے "

دیوتاؤں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ انھوں نے مانکا اپسرا کو پھسلایا۔ سمجھایا کہ تو دھرتی پہ جا کے وشوامتر کو رجھا اور اس کی تپسیا میں کسی طرح بھنگ ڈال۔

مانکا دیوتاؤں کے بہلاوے میں آ گئی ..... دیوستھان سے اتر کر اس بن میں پہنچی جہاں وشوامتر جی تپ کر رہے تھے۔ مانکا اشلوک پڑھتی ان کے

سامنے آئی اور اپنا جوبن ایسا دکھلایا کہ وشوامترجی کا دل بیکل ہو گیا۔ سوئی ہوئی کامنا جاگی۔ جو پھر یہ پالن ہوئے، تب سے جی اچاٹ ہوا۔ سمادھی سے اٹھے، نکا کے پاس جا کے بولے کہ اے بھاری کولھوں گاؤ دم رانوں والی ناری، تو مجھ سے مل۔ وہ اٹھلا کر بولی "رشی جی، کیسی بات کرتے ہو۔ نہ کوئی اوٹ نہ کوئی پردہ۔ اوپر سے دیوستھان والے نیچے دھرتی والے سب ہمیں دیکھیں گے۔"

"سندری، اس کی چنتا مت کر۔ ابھی اوٹ ہوئی جاتی ہے۔" یہ کہتے کہتے وشوامترجی نے بادلوں کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔ بادل ترنت دیوستھان اور دھرتی کے بیچ چھا گئے۔ انھوں نے پھر بادلوں کو اشارہ کیا۔ اب بادل ارد گرد منڈلانے لگے۔ وشوامترجی بادلوں کے بیچ منکا سے ملے۔

مل تو لیے پر اس کے بعد کیا ہوا۔ وشوامترجی کی ساری تپ پہ پانی پھر گیا۔ محنت اکارت گئی۔ ان میں جو دیوتاؤں والی شکتی پیدا ہو چلی تھی وہ جاتی رہی۔

سمپورنا نند جی یہ کہانی سنا کر چپ ہو رہے۔ سمجھے کہ اب بالک کی سمجھ میں بات آ گئی ہو گی۔ پر منوہر سوچ میں پڑ گیا۔ چپ رہا۔ پھر بولا "گورو جی میں کچھ نہیں سمجھا۔ من اور بیکل ہو گیا۔"

گورو نے غصے سے چیلے کو دیکھا۔ بولے "مورکھ میں نے تجھے اتنا سمجھایا، تو نہ سمجھا کہ کام واسنا نے تیری مت مار دی ہے۔ نہیں سمجھیں تو میرا آچھا چھوڑ اور جا ناری کے پاس۔ اب وہی تجھے سمجھائے گی اور سمجھائے گی۔"

منوہر نے اس بات کو گورو کی آگیا جانا۔ وہاں سے اٹھ جی سے ایسے نکلا جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔ دنوں کا فاصلہ گھنٹوں میں، گھنٹوں کا فاصلہ پلوں میں طے کیا۔ پھر اسی کنوئیں پہ پہنچا۔ کنوئیں کی من پہ پانی سے ڈول بھر کے وہ سندری ایسے بیٹھی تھی جیسے کسی کا رستہ دیکھ رہی ہو۔ اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔

"ہاں سندری میں آ گیا۔"

"کیسے آ گیا؟"

"بس پیاس لگی۔ میں آ گیا۔"

"وہ سچ مچ آ گیا تھا۔ بس اس کے پاس آ کر پسر گیا۔ ترستی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور التجا بھرے لہجہ میں بولا "اے میری میٹھی ندی، میں پیاسا ہوں۔"

وہ ناری سچ مچ ندی کی طرح امنڈی۔ منوہر کو گلے لگا لیا ہو۔ دن ڈوبا، رات آئی۔ پھر دن چڑھا، پھر رات آئی۔ جانے کتنے دن آئے اور بیت گئے۔ کتنی راتیں پڑیں کبھی اندھیری کبھی چاندنی۔ کتنی صبحیں چڑھیں کبھی گرم کبھی ٹھنڈی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کتنے دن گزر گئے، کتنا سمے بیت گیا۔ بس ایک دن اچانک چونکا جیسے گہری نیند سے جاگا ہو۔ باپ کا خیال کیا۔ ماں کی بات یاد آئی۔ دل میں کہا کہ میں کس سفر پہ نکلا تھا اور کس رستے پہ چل پڑا۔ تڑپ کر اس ناری کے پاس سے اٹھا اور چل کھڑا ہوا۔

منوہر پھر اسی جنگل کی طرف چلا جس جنگل سے رستہ تڑا کر وہ یہاں آیا تھا۔ اس جنگل میں سمپورنا نند جی اسی طرح پیپل تلے بیٹھے تھے۔ مگر اب ان کی کشا تی میں کمزوری پڑ چکی تھی۔ اندر ہی اندر انھیں سوال بھر

اٹھارہے تھے۔ وشوامترجی نے کیوں ایسا کیا۔ اچھے بھلے دیوتا بن چلے تھے۔ ایسی شکتی پائی تھی کہ دیوتاؤں کو اپنی فکر پڑ گئی تھی۔ مینکا سے ناری سواد کے پیچھے دیوتائی کھو بیٹھے سمپورنانند جی اندر ہی اندر بہت کڑھے۔ پھر بڑبڑائے کہ دیو رشی نے یہ اچھا نہیں کیا۔ مگر اتنا کہہ کر وہ خود شک میں پڑ گئے۔ کیا دیو رشی بات کی اونچ نیچ کو نہیں سمجھتے تھے۔ ضرور سمجھتے ہوں گے۔ تو پھر؟ اور اچانک سمپورنانند جی کو اس مہارشی کا دھیان آیا جنھوں نے جمنا جی کے بیچ ستیاوتی کو ناؤ چلاتے دیکھا اور اس پہ ریجھ گئے۔

"اے مچھلی ایسی تڑپتی رانوں والی ناری مجھ سے مل۔"

اور بے چاری ستیاوتی شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ ناؤ کھینا بھول۔ اس کی اپنی ناؤ ڈولنے لگی تھی۔ چکر میں پڑ گئی۔ دونوں طرح سے مشکل تھی۔ مانے تو کیسے مانے نہ مانے تو رشی کا اپمان ہوتا ہے۔ اس نے سراپ دے دیا تو بڑی مشکل سے بات بنائی کہ دیو رشی میں تمہاری داسی پر جمنا کے دونوں کناروں پر کتنے جوگی کتنے رشی کھڑے ہیں۔ وہ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ رشی جی نے یتن پرنت اپنے اور ستیاوتی کے ارد گرد دھند پیدا کی اور ستیاوتی پر چھا گئے۔

سمپورنانند جی سوچ میں پڑ گئے۔ کیسا کیسا رشی ناری کو دیکھ کر ڈول گیا۔ دنیا کو کس طرح تیاگ کر بستی کو چھوڑ نرجن بنوں میں باس کیا۔ اس کے باوجود مایا نے جھکولا پایا۔ پر ناری کی ایک چھب نے [illegible] کو ملیا میٹ کر دیا۔ مگر کہیں ایسا تو ہے۔ [illegible] نے اس گتھی کو سلجھانے کی بہت کوشش کی مگر جتنا سلجھانے کی کوشش کی اتنا ہی الجھتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ [illegible] ہو گیا۔ کب سے [illegible] جگہ [illegible] پربت بنے بیٹھے تھے [illegible] [illegible]

الیا؟ نہ یہاں آنے میں کی شانتی؟ آتما کا شکھ؟ دنیا کے جھیڑے موقوف کر جاتے۔ پر اب وہ برگد اپنی جگہ سے ہلا ہوا تھا۔

"گورو، میں آ گیا ہوں۔" منوہر اچانک آن دھمکا۔ سمپورنانند جی نے چیلے کو دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ کتنا اچنبھا ہو رہا تھا انھیں۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو اس کی آتما کتنی دکھی تھی اور اس کے من میں کتنی بیکلی تھی۔ اب اس کا چہرہ ہی بدلا ہوا تھا۔ اپنے آپ میں مگن۔ بیکلی کی جگہ آنند۔ چرنوں میں آکر ایسے بیٹھا جیسے اب مکشا کے لیے اس کے دل کے دماغ کے سب دروازے کھلے ہوں۔ سمپورنانند جی کو پہلے اچنبھا ہوا۔ پھر سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ایکا ایکی اپنے استھان سے جہاں وہ جانے اس جگ سے پربت سمان جمے بیٹھے تھے ایک بیکلی کے ساتھ اٹھے۔ منوہر سے بولے "شش" تو اس استھان پہ بیٹھ میں چلا۔" منوہر گورو کا منہ تکنے لگا۔ چکرا کر بولا "گورو جی، میں تمہارے چرنوں میں آیا۔ اور تم جا رہے ہو۔ پر کس یاترا پہ جا رہے ہو؟" "گیان یاترا پہ۔"

"گیان یاترا پہ"؟ منوہر اور چکرایا "ہے گنی گیانی، گیان کی اب کونسی یاترا تمہارے لیے رہ گئی ہے۔"

بولے "شش، پورا گیان کسے ملا ہے۔ سو مانو کو چاہیے کہ چلتا رہے۔"

اور سمپورنانند جی منوہر کو اپنے استھان پہ بٹھا اس بن سے نکلے اور جمنا ندی کی طرف چل پڑے۔

سمپورنانند جی جمنا ندی کے کنارے کنارے چلے جاتے تھے۔ اِس کنارے اور اُس کنارے کتنے منی اور کتنے رشی سمادھی لگائے نظر آنے پر سمپورنانند جی کی نظر پڑی تو ان ناؤوں کو ٹٹول رہی تھیں جو جمنا کے بیچ ڈولتی [illegible]

جگن ناتھ آزاد

بزمِ سخن سے دور

آج وہ لمحہ
کہ تھا ایک برس پر حاوی
ہاتھ سے نکلا
تو اک عمر کا غم دے کے گیا
تھا تو اک لمحہ مگر
جاتے جاتے مجھے صدیوں کا الم دے کے گیا
کتنا شاداب تھا یہ سارا سفر اے آزاد!
وہ گلستان وہ میدان وہ دریا وہ پہاڑ
گرچہ ایسا بھی ہوا
شہرِ محبوب سے نکلا تو لگا ہیں تمیں اُجاڑ

اس کے باوصف نہیں بھولا ہوں
اے وطن! میں تری شاداب بہاروں کا سماں
وہ ترے مشرق و مغرب کے سمندر کے نظاروں کا سماں
تیرے دریاؤں کے صد رنگ کناروں کا سماں
کارخانے ترے مصروف
کہ امروز کے چہرے پہ چمک آ جائے
رُخِ فردا پہ رنگ آ جائے
زندگانی کے گلستاں میں ذرا اور مہک آ جائے
[illegible] راز کہ مستور ہے سینے میں ترے

یہ ہے اک گوہرِ نایاب خزینے میں ترے
ریل کا پہیہ کہ پٹڑی پہ اُترنے سے بہت قبل کہیں
عالمِ تشکیل میں ہے
اِک عجب نشۂ تکمیل میں ہے!
اور جب گھومتا ہے
تشنہ لب وقت کا ہر لمحہ اسے چومتا ہے
اے وطن! تو کہ ہے کشمیر سے کاویری تک
نور ہی نور، تجلّی ہی تجلّی تجھ کو
اپنی اک عمر میں دیکھوں بھی تو کیسے دیکھوں
تیرے پُرکیف نظاروں کا لکھا کیا کہنا
تیری شاداب بہاروں کا لکھا کیا کہنا
ایک احساس زباں سے لیکن
کہ نہاں خانۂ دل سے جو نکلتا ہی نہیں
میں ہوں اس وقت جہاں اس سے بہت دور کہیں
اے وطن! جشن ہے برپا تری آزادی کا
میرے احباب، مرے دوست، رفیقانِ قلم
تیرے شاعر ترے فن کار، سخن ور تیرے
جن سے ہے مرتبۂ شعر و سخن، شانِ قلم
میں ہوں اس وقت جہاں اس سے بہت دور کہیں
سب ترے جشن میں ہیں محو، وہی شوق
اور اک میں ہوں کہ [illegible]
لے کے آنکھوں میں اک [illegible]
دشت میں [illegible] پھرتا ہوں [illegible] کی صورت ▲▲

فضا ابن فیضی

○

جدا سا نقطہ ہے کچھ، دائرہ الگ سا ہے
مرے شعور کا ہر زاویہ الگ سا ہے

بنا ہے ترک تعلق ہے روز کا ملنا
کہ قربتوں میں بھی اک فاصلہ الگ سا ہے

میانِ روح و بدن اب بھی ہے وہی دوری
جو روشنی میں ہے وہ رابطہ الگ سا ہے

علوم دانش و دیں، معتبر سب اپنی جگہ
یہ آگہی کا ہے جو مسئلہ الگ سا ہے

یہیں پہ ٹوٹتے رشتوں کی معنویت ڈھونڈھ
نفس سے تا بہ نفس سلسلہ الگ سا ہے

دراصل تو یہی بنیاد کی ہیں پہلی اینٹ
روایتوں سے کہاں تجربہ الگ سا ہے

نہ ہو، خیال مکمل نہیں جو بے ترسیل
یہاں تو عکس سے اب آئنہ الگ سا ہے

ہے لفظ لفظ، کوئی سوچتا ہوا چہرہ
مرا ادب کے تئیں فلسفہ الگ سا ہے

عجب بات ہے، کہ یاقوت سا لہو حرف کو
کمالِ خوش ہنری کا صلہ الگ سا ہے

تابش صدیقی

ردا

زمیں کے سینے پہ،
سبز اور نیلگوں ردا اک
بچھی ہوئی ہے:
جلیل صبحوں کے اولیں قافلے
جب اس کو جلو میں لے کر
زمیں پر اترے،
زمیں نے اپنی تمام تر چاہتوں سے
اپنے کشادہ بازو بڑھائے،
اور اجنبی کو
اپنی محبتوں سے گداز سینے کی
بے کراں وسعتوں کی آغوش میں اتارا
یہ سبز اور نیلگوں ردا اب،
زمیں کی رعنائیوں کی جاں ہے
یہ اجنبی حسن جاوداں ہے

(۲)

ردا کے اوپر ہر ایک جانب،
طویل رستے بچھے ہوئے ہیں
نگہ سے اوجھل بھی اور عیاں بھی
تمام رستے،
حیات کی رونقوں سے

یوں چھپا رہے ہیں،
فضا کی نیلاہٹوں میں جیسے
دھنک سے بڑھ کر،
حسین و خوش رنگ طائروں کی
طویل ڈاریں چہک رہی ہوں
اور ان کے نغموں کے زیر و بم سے
ہوا کی لہریں کھنک رہی ہوں

(۳)

بچھے ہوئے راستوں کے اوپر
ہر اک مسافر کی اپنی منزل
کسی کی آنکھوں سے
حسنِ بازارِ مصر کو دیکھنے کی خواہش
اُبل رہی ہے
کسی کے چہرے پہ
چین و ماچین کی طلب تمتا رہی ہے
جو اُس کی منزل ہے
ماہ کنعاں کی بھولی بسری جمال گاہیں،
تو علم کی جستجو اُسے گدگدا رہی ہے
کسی کے لب پر درود جاری
قدم قدم پر صدائے لبیک اللہ رہی ہے
بچھڑ رہا ہے کوئی کسی سے
کوئی محبت بھرا ہوا دل لیے
پھر اپنی پرانی منزل کو جا رہا ہے
جہاں کوئی اس کا منتظر ہے
وہاں، وہ اُس دھڑکتے دل کا
سکوت بنے گا

(۴)

ردا کے نیچے
ہزاروں عالم ہمک رہے ہیں
فسانوی منظروں کے سینے میں
وہ خزینے دھڑک رہے ہیں،
جو حدِ ادراک سے پرے ہیں
عجیب سے بھی عجیب تر
بے بہا نوادر چھپے ہوئے ہیں
کہیں نباتات کے عجائب
اُگے ہوئے ہیں
کہیں ہیں مرجان کے جزیرے
یہ حسن کے مرغزار جانے،
مہیب گہرائیوں میں کب سے،
حیات بخش آفتاب عالم فروز کی
ایک اک کرن کو ترس رہے ہیں
یہ منزلِ ارتقا کے راہی
ردا کے جادو کے سخت پنجے سے
جب کبھی پائیں گے رہائی،
اچھل کے ابھریں گے،
ظلمتوں کی تہوں سے باہر،
اور اپنے خوابوں کی روشنی میں
نہال ہوں گے
کہیں صدف ہائے دُرفشاں ہیں
اور اُن میں گوگوے بے خزاں ہیں
نگاہ کو خیرگی کا پیغام دینے والے
سہانی قوسِ قزح کے ...

رنگین خواب نگاروں کی وادیاں بھی یہیں چھپی ہیں
مچلتے پھولوں کا
تیرتا اور رقص کرتا ہوا جہاں،
شانِ بے نیازی اس طرح کھلا رہا ہے،
کہ آنکھ دیکھے تو دیکھتے ہیں
طویل عمریں بھی بیت جائیں
ردا کے نیچے کوئی چراغاں ہے
اللہ! اللہ!!
چراغ جلتے ہیں لمحہ لمحہ!
چراغ بجھتے ہیں لمحہ لمحہ!
کہیں سے جیسے،
کروروں جگنو اڑے اور آکر
ردا کی تہہ میں اتر گئے ہیں
ردا کی تہہ میں بکھر گئے ہیں
عجیب محشر ہے دلکشی کا
ردا کے نیچے وہ زندگی ہے
ردا سے اوپر کی زندگی کو بھی
جس پہ رہ رہ کے
رشک آئے

(۵)

ردا کے نیچے
کچھ ایسی لہریں بھی مضطرب ہیں
جو اس کے چہرے پہ
رقص کرتی ہیں
لمحہ بھر کے لئے، کبھی تو،
کمالِ حسن و جمال بن کر،
کبھی پہاڑوں کی
رفعتوں کا جلال بن کر
یہ جانِ صد اضطراب لہریں،
وہ چاند شہزادیاں ہیں،
جو ایک شفاف اور براق شب کی
خاموش چاندنی میں
ردا کے سینے پہ رقص کرنے کو
چاند کی سرزمیں سے اتریں،
مگر ردا کے حسین زنداں کی
دلکشی کے فسوں کے باعث
وطن کو واپس نہ جانے پائیں
فضا سے جب چودھویں کا چاند
ان کو جھانکتا ہے،
قرار و صبر و سکون کھو کر،
تڑپ کے اٹھتی ہیں اس کی جانب
مگر کہاں چاند اور کہاں یہ
ردا کی زندانی محبت
یہ کوششِ بے قرار ان کی
سدا سے جاری ہے اور رہے گی
ابد کے دن تک

(۶)

ردا کی گہری تہوں کے نیچے
عجیب اسرار پل رہے ہیں
نگار پیکر،
ہزار پہلو!
ہر ایک سرِ نہاں،

بھنور کا نقاب اوڑھے،
تجسس ناصبور بن کر،
اُس آنکھ کو ڈھونڈتا ہے پیہم،
جو اس ردا کی
عمیق سربستہ وادیوں کے
سکوں میں اترے،
اور ان میں پوشیدہ،
ناتراشیدہ، حسن پاروں کو
بے نہایت، طویل تنہائیوں کی
بے کیف زندگی سے نجات دیدے
سحر کا عزم حیات دیدے

(۷)

ردا کے احسان تہہ بہ تہہ ہیں
ردا نے کیا کچھ نہیں دیا ہے؟
ردا نے کس کو نہیں دیا ہے ؟
حیات کو چاندنی عطا کی
ہواؤں کو نغمگی کی ٹھنڈک
جہاں کو رعنائیوں کی نعمت سے سرفراز
سفینہ آئے سفینہ جائے
حیات کا حسن جگمگائے

(۸)

ردا کے دامن میں
زندگی کی حرارتیں ہیں
ردا کے دامن میں وسعتیں ہیں
ردا کا دامن اِک ایسا دل ہے،
نہ اس کی پہنائیوں کی حد ہے
نہ اس کی گہرائیوں کی حد ہے

(۹)

ردا سہانا سا نام ہے اک
بہت پُرانا، بہت سہانا
یہ نام ایسا ہے،
جس میں،
لاکھوں حلاوتوں کا فسوں نہاں ہے
یہ نام پایندہ و جواں ہے
سمندروں کا بسیط دنیا کا استعارہ
نہ جانے کتنے ہی قلزموں کی
روایتیں اس میں چھپی ہوئی ہیں
نہ جانے کتنے ہی نام
اس میں سمو گئے ہیں
اور اس کے با وصف
یہ اکائی ہے ایک ایسی
کسی سے بھی جو کبھی نہ ٹوٹی
ازل سے اب تک

(۱۰)

ردا کی دنیا کے ہر کنارے پہ
کوئی مخلوق خیمہ زن ہے
یہ ایک عجوبہ ہے،
عقل و دانش کے شعبدوں کا
سنا گیا ہے، یہ ساری مخلوق،
ایک آدم کی صلب سے ہے،
اور ایک حوا کی کوکھ سے ہے

یہ نوعِ انسان کا گھرانہ
یہ حُسنِ تخلیق بے کرانہ،
تمرا کبھی نہ بننے پایا
پڑا نہیں اس پہ جیسے ہرگز
کسی بھی لمحے ردا کا سایہ

(۱۱)

عجب گھرانہ ہے یہ کہ اِس نے
جبالِ آسا بلند لہروں کے
رقص کو نو ہمیشہ دیکھا
اور اس سے رہ رہ کے حظ اٹھایا
مگر نہ دیکھا
ردا کا یہ حُسنِ جاویداں ہی
کہ ہر قیامت میں بھی،
ردا کی اکائی پر آنچ تک نہ آئی
بپھرتی لہروں نے،
زلزلوں نے،
اور ایٹمی کاوشوں نے،
کیا کیا نہ سر اٹھایا،
مگر ہر اک بار منہ کی کھائی

(۱۲)

ردا جو کل تھی، وہ آج بھی ہے
ردا پرانی ہے اور نئی بھی
حسین، شفاف۔ آئینہ دار، رخشاں
ردا کے چہرے پہ،
سلوٹوں کے نشاں نہیں ہیں
گزرتے لمحوں نے اس کے چہرے پہ
جانے کتنی ہزار صدیوں کی داستانیں
رقم تو کی ہیں،
مگر کہیں بھی تو،
کہنگی کا نشان نہیں ہے
وہی ہے سب آب و تاب اس کی
وہی ہے رعنائی بہارِ شباب اس کی
وہی سخاوت کی بارشیں ہیں
وہی کرم کی نوازشیں ہیں
وہی عنایات کا خزانہ،
وہی ردا ہے وہی فسانہ
اور اس کے برعکس
نوعِ انسان کا گھرانہ،
ازل کی روحِ قدیم کا بے کراں گھرانہ،
جو عمر میں ہے ردا سے کم تر
بٹا ہوا ہے،
اور اپنے ہاتھوں ہی
اپنی اک اک شکستگی کا فسانہ خواں ہے
مریض ہے اور سسک رہا ہے
کچھ ایسے لگتا ہے،
چند روز اور پھر نہ جانے کیا ہو
مریضِ انسان کے گھرانے کا
کوئی آخر علاج بھی ہے؟
کوئی بتائے،
علاج بھی ہے؟

(۱۳)

ذرا سنو تو

سوادِ کعبہ سے
ایک آواز آرہی ہے
خدا بڑا ہے
بہت بڑا ہے
رحیم ہے وہ
کریم بھی ہے
کریم نے یہ کرم کیا ہے
کہ اپنے روشن صحیفۂ آخرین و دائم میں
ہر زمانے کے،
ہر مرض کی،
دوا رکھی ہے
مریض انسان کے گھرانے سے
کوئی کہدے
مرض نہیں لاعلاج کوئی بھی
شفا کی راہیں کھلی ہوئی ہیں
حرم کی باہیں کھلی ہوئی ہیں

۸۸

ڈاکٹر کے مدنا منظر

بے خبری

رات اندھیری
ایک تجلی
آئی کسی کی
کس کو خبر تھی؛

گونج اٹھی تھی
ساری فضا ہی
کس نے صدا دی
کس کو خبر تھی؛

شور یہاں ہے
نور وہاں ہے
فصل کہاں ہے
کس کو خبر تھی؛

اُف بھی نہ کرنا
آہ نہ بھرنا
دل نے کہا تھا
کس کو خبر تھی؛

بات ضروری
باہم ہوگی
کس نے پہل کی؟
کس کو خبر تھی؛

پیت ہے ساگر
غوطہ لگا کر
لا گوہر
کس کو خبر تھی؛

مستِ جنوں تھا
گھور اندھیرا
نور کہاں تھا
کس کو خبر تھی؛

نام نہ جانے
بعد ہمارے
روز آتا ہے
کس کو خبر تھی؛

ایک تھا میں بھی
ایک تھا ساتھی
کون تھا کس کی
کس کو خبر تھی؛

۸۸

سارلوف پرگنس گلمن

تلخیص: خالد قادری

پیلا دیواری کاغذ

ایسا کم ہی دیکھنے میں آتا ہے کہ میرے اور جان جیسے متوسط طبقے کے لوگوں کو گرمیاں گزارنے کے لیے آبائی حویلیاں میسر آئیں ۔ مقبوضہ نوآبادیات پر پرانے حاکموں کے وسیع بنگلوں نما مکان جو ذہن کو کسی ما فوق الفطرت روحانی دنیا کی طرف لے جاتے ہوں ۔ دراصل ہمارے لیے تو اس قسم کی خواہش تقدیر سے کچھ زیادہ ہی مانگنے کے مترادف ہے ۔ مگر اس بار ہم جس مکان میں رہنے کے لیے آئے ہیں وہ اسی قسم کا ہے ۔ حویلی نما عجیب و غریب اور پُراسرار سا ۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اتنے عرصے سے خالی پڑا تھا اور ہمیں بہت ہی معمولی کرائے پر حاصل ہو گیا ہے ۔

جان اکثر میری باتوں پر ہنستا ہے کیوں کہ اُسے میرے خیالات حماقت آمیز لگتے ہیں ۔ وہ ایک انتہا درجہ کا پریکٹیکل آدمی ہے ۔ فوق الفطرت چیزوں کے تصور اور اندھے عقائد سے سخت چڑ ہے ۔ وہ ہر اس بات کو قابلِ تمسخر سمجھتا ہے جس کی بنیاد منطقی دلائل پر نہ رکھی جا سکے یا جو عام حالات میں دیکھی یا محسوس نہ کی جا سکتی ہوں ۔

میرا شوہر جان ڈاکٹر ہے اور شاید یہی وجہ ہے میں اب تک صحت یاب نہ ہو سکی (اپنے اس احساس کا اظہار میں کسی کے سامنے نہیں کر سکتی)

جان کا خیال ہے کہ مجھے قطعاً کوئی بیماری ہے ہی نہیں ۔ یہ سب بس اعصابی تکان اور ذہن کی ہسٹریائی کیفیت کا نتیجہ ہے ۔ اور پھر میرا بھائی جو خود ایک اچھا ڈاکٹر ہے یہی رائے رکھتا ہے ۔

یہ لوگ مجھے دوا و ٹانک وغیرہ استعمال کراتے ہیں اور تازہ ہوا، تبدیلیٔ ماحول اور ہلکی ورزش وغیرہ کی تاکید کرتے رہتے ہیں اور مجھے کسی قسم کا کوئی بھی کام کرنے سے منع کرتے ہیں ۔

مجھے ان لوگوں کی رائے سے اختلاف ہے میں محسوس کرتی ہوں کہ مجھے اگر ایسے کام کرنے کی اجازت دے دی جائے جس سے مجھے دلچسپی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ آزادی اور فرحت بخش ماحول میسر آئے تو میں بہت تیزی سے صحت یاب ہو سکتی ہوں ۔ مگر میں مجبور کر دی گئی ہوں ۔

ان لوگوں سے چھپ کر میں کبھی کبھی کچھ لکھ لیتی ہوں مگر وہ بھی زیادہ دیر تک نہیں کیوں کہ ان کے اچانک آجانے اور مجھے لکھتے دیکھ لینے

خوف۔ میرے اعصاب کو بہت جلد تھکا دیتا ہے میں نے اکثر سوچا ہے کاش مجھے ایسا ماحول ملا ہوتا جس میں میری ہمت افزائی ہوتی اور میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کر سکتی مگر جان کا کہنا ہے کہ میرا اپنا اور اپنے ماحول وغیرہ کے بارے میں زیادہ سوچنا ہی ساری تکلیفات کی جڑ ہے۔ اگر میں صحت مند رہنا چاہتی ہوں تو سوچ بچار کم کر دوں۔ ایسے وقت میں میں اس کی بات مان کر ذہن کو اکیلا چھوڑ دیتی ہوں اور گھر گرہستی کی عام باتیں کرنے لگتی ہوں۔

یہ مکان جس میں ہم لوگ رہتے ہیں گاؤں سے تین میل دور سڑک کے عقب میں ایک الگ تھلگ اکیلا مکان ہے۔ اس کے ساتھ ایک وسیع باغ بھی ہے جس میں باڑھ دار روشیں اور جگہ جگہ انگور کی بیلوں سے گھری پتھر کی نشستیں ہیں۔ یہ باغ بھی مجھے مکان کی طرح ہی کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ ایک رات جب کھڑکی سے باہر باغ میں پھیلی ہوئی چاندنی میں یہ جگہ بڑی عجیب اور پراسرار سی لگ رہی تھی اور میں نے اس کا ذکر جان سے کیا تو اس نے جھٹ اٹھ کر کھڑکی بند کر دی اور مجھے آرام کرنے کا مشورہ دینے لگا۔ میرے پاس اس وقت چپ چاپ بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

مجھے اپنا سونے کا کمرہ بالکل پسند نہیں۔ میں دراصل نیچے کے کمرے میں رہنا چاہتی تھی جس کے دریچے پر گلاب کی بیلیں جھکی ہوئی ہیں مگر جان نے میری بات نہیں مانی۔ وہ کہتا ہے کہ وہ کمرہ ایک ہی کھڑکی ہونے کی وجہ سے زیادہ ہوادار نہیں اور پھر اس میں دو آدمیوں کے سونے کے لیے مناسب جگہ بھی نہیں ہے۔ اس کا اصرار ہے کہ میری دیکھ بھال کے لیے اس کا میرے قریب رہنا ضروری ہے۔ جان واقعی میرا بہت خیال رکھتا ہے یہاں تک کہ وہ مجھے آپ اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے نہیں دیتا۔ میرے دن بھر کا روزنامچہ بھی وہی تیار کرتا ہے۔ میں اپنا وقت کیوں کر گزاروں اس کا مشورہ دیتا رہتا ہے۔ اس سب کے باوجود مجھے کبھی کبھی اس پر غصہ آجاتا ہے تو بعد میں مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے اور میں اپنے آپ کو خود غرض اور احسان فراموش سمجھنے لگتی ہوں۔

میرا کمرہ مکان کے اوپری حصہ میں ہے۔ یہ ایک لمبا چوڑا کشادہ اور ہوادار کمرہ ہے جس کی کھڑکیاں ہر سمت کو کھلتی ہیں۔ یہ شاید کبھی بچوں کی نرسری رہا ہوگا کیوں کہ اس کی کھڑکیوں میں سلاخیں لگی ہیں اور دیواروں پر لگے کاغذ اور پینٹ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

میرے سرہانے کی طرف دیوار پر کا کاغذ کافی بڑی جگہ میں بیچ بیچ سے اکھڑا ہوا ہے اور سامنے کی طرف کی دیوار کا بھی یہی حال ہے میں نے کسی مکان کی دیواروں کا ایسا برا حال اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ بس ایسا لگتا ہے جیسے بہت سے بچوں نے مل کر ان دیواروں پر غیر ضروری اور نازیبا حرکتیں کی ہوں۔

مجموعی طور پر جگہ جگہ اکھڑا ہوا یہ کاغذ دیواروں پر چپکا

قسم کے واہیات زاویے اور ہیئت بناتا ہے وہ ذہن میں چڑ، نفرت اور حقارت پیدا کر دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی ان کو کچھ دیر تک غور سے دیکھتا رہے تو یہ لنگڑے لولے خطوط ایک دوسرے کے تعاقب میں تیزی سے ہوا گئے ہیں اور پھر اچانک کسی موڑ پر پہونچ کر چھلانگ لگا کر خودکشی کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کاغذ کا رنگ بھی دھندلا، گندا پیلا رنگ ہے جو خود اپنے آپ نفرت، اکتاہٹ اور کراہیت پیدا کرنے والا ہے۔ یقیناً میری ہی طرح اس کمرے میں رہنے والے بچوں کو بھی اس اکھڑے ہوئے کاغذ سے نفرت پیدا ہوئی ہوگی۔

شاید جان آ رہا ہے! اب مجھے لکھنا بند کرنا ہوگا کیوں کہ وہ مجھے ایک لفظ بھی لکھتا دیکھ کر آگ بگولہ ہو جاتا ہے۔

مجھے یہاں آئے ہوئے اب تین ہفتے ہو چکے ہیں پھر بھی میں پہلے دن کے بعد سے اب تک کچھ نہیں لکھ پائی۔ نہ جانے کیوں میرا جی نہیں چاہا!

اس وقت میں اپنے اس واہیات کمرے میں کھڑکی کے قریب بیٹھی ہوں اور خود اپنی جسمانی کمزوری کے علاوہ میرے لکھنے کے راستے میں کوئی اور چیز حائل نہیں۔ جان اپنی معالجانہ مصروفیات میں دن اور کبھی کبھی راتوں کو بھی باہر رہتا ہے۔

میری اعصابی تکلیفات شدید ہو گئی ہیں میرے شوہر کو اس کا علم نہیں۔ اس کے خیال سے میرے تکلیف میں ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ تو غنیمت ہے کہ میرے بچے کی دیکھ بھال کے لیے جینی جیسی شفیق اور ذمہ دار عورت موجود ہے اور مجھے اس کی کوئی فکر نہیں کرنی پڑتی ورنہ میرے اعصاب کا نہ جانے کیا حال ہوتا۔ میرے لیے تو مختلف موقعوں پر مناسب لباس پہننا، لوگوں سے ملنا یا ضرورت کی چیزیں منگانا بھی ایک آزمائش سے کم نہیں۔ دیوار پر لگے اس تکلیف دہ کاغذ سے ایک دن جب میں نے اپنی شدید بیزاری کا اظہار کیا تو وہ خوب ہنسا۔ پہلے اس نے اسے بدل دینے کی بات کی مگر پھر یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ اگر ویسا کیا گیا تو مجھے چھوٹی چھوٹی چیزوں سے اکتاہٹ اور بیزاری کی عادت ہو جائے گی جو میرے لیے ٹھیک نہیں۔ مناسب یہی ہوگا کہ میں اس کاغذ کے وجود کو غیر اہم سمجھ کر اسے اپنے اعصاب پر طاری نہ ہونے دوں۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کاغذ بدل دیا گیا تو پھر مجھے اپنا پلنگ بے ہنگم دکھائی دے گا اس کے بعد کمرے کی کھڑکیاں اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

میں بھی کسی بات کو زیادہ طول دے کر اسے پریشان کرنا نہیں چاہتی مگر یہ حقیقت ہے کہ دیوار کے اس اکھڑے ہوئے کاغذ کے علاوہ مجھے کمرے کی کوئی اور چیز ناپسند نہیں ـــ میری خواہش ہے کہ میں جلد صحت مند ہو جاؤں ـــ مگر نہیں ـــ مجھے اس سلسلے میں زیادہ سوچنا نہیں چاہیے۔

اس وقت یہاں لیٹے ہوئے سامنے کی دیوار پر اکھڑے ہوئے کاغذ کے خطوط ایک کٹا ہوا سر

کر اُبھر رہے ہیں جس میں سے دو آنکھیں باہر
رف نکلی پڑ رہی ہیں۔ یہ آنکھیں مجھے دیکھ رہی
— اوپر سے نیچے تک میرے سارے جسم
پھیل رہی ہیں — بغیر پلکیں جھپکائے۔ میں نے
بے جان چیزیں اپنے وجود کے اظہار کی اتنی
ت اب تک نہیں دیکھی (ویسے ان چیزوں میں
طرح کی کتنی بے پناہ قوت ہے! بچپن میں
ے کی ننگی دیواروں اور عام گھریلو فرنیچر سے ایسی
عجیب الخلقت شکلیں اُبھرتی تھیں جو جانوروں
بھی شاید ہی کہیں دیکھنے کو ملیں)۔

ہمارے کمرے کا فرش بھی جگہ جگہ سے اکھڑا
ا ہے اور یہ بھاری پلنگ جو یہاں آنے پر ملا
ما ہے کتنی ہی لڑائیاں دیکھ چکا ہے مگر ان سب سے
ے وہ وحشت نہیں ہوتی جو اس دیواری کاغذ سے
تی ہے۔ شاید جان کی بہن آ رہی ہے! اسے یہ معلوم
یں ہونا چاہیے کہ میں کچھ لکھ رہی تھی ——

آج چار جولائی کا دن بھی ختم ہو گیا۔ ماں اور
اور بچے جنہیں جان نے میرے دل بہل جانے
خیال سے بلا لیا تھا واپس چلے گئے۔ حالاں کہ
ان دنوں کچھ بھی نہیں کرنا پڑا مگر پھر بھی میں اپنے
پ کو پہلے سے زیادہ تھکا ہوا محسوس کر رہی ہوں
ے وجہ بے وجہ رونا آتا ہے۔ نہ جانے مجھے
یا ہو گیا ہے! —— جان اپنے کام کے سلسلے میں
باہر رہتا ہے اور جینی میری مرضی بھانپ کر مجھے
تنہا چھوڑ دیتی ہے۔ میں کبھی کبھی باغ میں کچھ
ہ گھومتی ہوں یا گلاب کی بیلوں کے نیچے بھی

رہتی ہوں اور پھر کمرے میں آکر لیٹ جاتی ہوں۔

مجھے اس بدنما دیواری کاغذ کے باوجود کمرے
کی تنہائی پسند ہے یا پھر شاید اس کی وجہ یہ کاغذ
ہی ہو کیوں کہ اب یہ میرے ذہن کا ایک حصہ بن گیا
ہے۔ میں گھنٹوں بیٹھے بیٹھے دیکھا کرتی ہوں۔ میری
نگاہیں مسلسل ان نقوش میں الجھی رہتی ہیں یا ان کے
ساتھ ساتھ چلتی رہتی ہیں جو اس جگہ جگہ سے پھٹے
ہوئے کاغذ سے اُبھرتے ہیں، بھاگتے دوڑتے
ہیں، اور پھر کسی موڑ پر ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے
ان کو گھنٹوں اس طرح مسلسل دیکھتے رہنا ایک
وحشت ناک الجھاوے پر جا کر ختم ہوتا ہے —
اور اس کے بعد میں اس بری طرح تھک جاتی ہوں
کہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ یہاں تک کہ مجھ
سے کچھ لکھا بھی نہیں جاتا۔

جان اس قسم کی باتوں کو واہیات اور لغو
کہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مجھے اپنی قوت ان
چیزوں کے سوچنے میں نہیں ضائع کرنی چاہیے
اور صحت مند رہنے کے لیے کاڈ لیور آئل اور دوسرے
ٹانک اور اچھی غذا پر توجہ دینی چاہیے۔ وہ ایسے
موقعوں پر بڑی شفقت سے مجھے اپنی باہوں میں
لے کر جھکتا ہے اور کہتا ہے میں اس کی بہت ہی
پیاری پیاری بیوی ہوں اس کی زندگی کا سرمایہ
ہوں، اپنی خاطر نہ سہی تو کم سے کم اس کی خاطر ہی
میں اپنی صحت کا خیال رکھوں ——

میں اکثر خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میرا بچہ
صحت مند ہے اور آیا کے ساتھ الگ رہتا ہے

اور اسے اس بھیانک منظر کا سامنا نہیں کرنا ہے جو تنہائی میں یہ پھٹا ہوا دیواری کاغذ سامنے لاتا ہے اگر جان میرے بجائے میرے بچے کو اس کمرے میں رکھتا ...... ! نہیں۔ نہیں۔ اس تصور ہی سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ویسے ان باتوں کا ذکر میں کسی سے نہیں کرتی۔ یہ باتیں بس اس کاغذ تک ہی محدود ہیں اور شاید کسی کو کبھی بھی نہ معلوم ہو سکیں گی ــ

دیوار پر کاغذ سے بننے والے نقوش روز بروز واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ اب تو میں صاف طور پر دیوار کے اس پھٹے ہوئے کاغذ کے پیچھے کسی عورت کو گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ مجھے اسے اس طرح چلتا ہوا دیکھ کر وحشت ہو رہی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جان مجھے یہاں سے کہیں اور لے چلے مگر اس سے اپنے اس مسئلہ پر بات کرنا بہت مشکل ہے کیوں کہ وہ مجھے بہت پیار کرتا ہے ــ کل رات نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے ایسی باتیں لکھنی پڑیں۔ کل چاندنی رات تھی۔ ایسی راتیں میرے اعصاب پر بھاری ہوتی ہیں اور تمام رات گھبراہٹ اور خوف میں گزرتی ہے۔ چاندنی دھیرے دھیرے رینگ رینگ کر آگے بڑھتی رہتی ہے اور پھر پچھلی کھڑکی سے ایک دم اندر آ جاتی ہے۔ اس کے اس طرح اچانک پیچھے آ موجود ہونے کے خیال سے ہی میں لرز جاتی ہوں اور مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہیں کر پاتی اگر کسی طرح ہمت سے کام لے کے وہ کھڑکی بند بھی کر دوں تو کسی لمحہ میں مجھے غافل پا کر وہ پھر کسی دوسری کھڑکی یا دروازے سے عقب میں آ دھمکتی ہے۔

اس دن میں لیٹی ہوئی دیوار کے کاغذ پر چاندنی کو رینگتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کے اس طرح رینگنے سے مجھے سخت نفرت ہو رہی تھی اور میرا اعصابی تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر میں جان کو جو میرے بازو میں سو رہا تھا جگانا نہیں چاہتی تھی ــ پھر مجھے لگا کہ پھٹے ہوئے کاغذ کے پیچھے رہنے والی عورت باہر نکلنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ میں آہستہ سے بستر سے اٹھی اور دیوار کے قریب جا کر کاغذ کو چھو کر دیکھنے لگی کہ کیا وہ واقعی ہل رہا ہے !! اور جب میں بستر پر واپس آئی تو جان ــــ وہ جاگ چکا تھا اور مجھے حیرت سے تک رہا تھا۔ میں اس سے نظریں چار کرنے کی ہمت نہ کر سکی اور چپ چاپ بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ جان تھوڑی دیر بعد مطمئن ہو گیا کہ میں سو گئی تھی مگر میں صبح تک جاگ کر یہ جاننے کی کوشش کرتی رہی کہ دیوار کا کاغذ کہاں کہاں سے کیسے ہل رہا تھا۔

دیوار پر ابھرنے والے یہ نقوش دن اور رات کے مختلف حصوں میں روشنی کے گھٹنے بڑھنے کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ علی الصبح سورج کی کرنیں جب مشرقی کھڑکی سے اندر داخل ہو کر دیوار پر پڑتی ہیں تو یہ نقوش کچھ الگ قسم کے ہوتے ہیں۔ اور پھر دن بھر گھٹتی بڑھتی دھوپ کے ساتھ یہ بدلتے رہتے ہیں۔ مگر جس رات آسمان پر چاند ہوتا ہے اور چاندنی کمرے کے اندر آ کر دیوار پر پھیلتی ہے تو یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ وہی کاغذ ہے جسے دن میں دیکھا تھا۔ ایسے وقت یہ نقوش مکمل

طور پر واضح ہو جاتے ۔ کاغذ سلاخوں میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کے پیچھے گھٹنوں کے بل سہمی ہوئی چھپ چھپ کر آگے بڑھتی ہوئی عورت صاف دکھائی دینے لگتی ہے ۔ دن کی روشنی میں یہ شبیہہ دھندلی اور غیر واضح رہتی ہے ۔

ادھر کچھ دنوں سے تو میری عجیب حالت ہو گئی ہے ۔ میں کمرے سے باہر کہیں بھی زیادہ دیر نہیں رہ سکتی ۔ موقع ملتے ہی بھاگ کر یہاں آجاتی ہوں اور کاغذ کے پیچھے وہ عورت کیا کر رہی ہے یہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگتی ہوں ۔ اس طرح بستر پر لیٹے لیٹے گھنٹوں گزر جاتے ہیں اور آنکھیں دیوار سے لگی رہتی ہیں ۔ اس دوران مجھے کھانے پینے سونے کسی بات کا ہوش نہیں رہتا ۔ جان میرے اس طرح کمرے میں بند رہنے کی بات سن کر مطمئن ہے کیوں کہ اس کے خیال میں سونا اور آرام کرنا میری صحت کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے ۔

مجھے جان سے خوف آنے لگا ہے اور جینی بھی کبھی کبھی مجھے عجیب نظروں سے دیکھتی ہے ۔ میرا خیال ہے اس سب کی وجہ یہی کاغذ ہے ۔ جان کچھ نہ کچھ لولے لنگڑے بہانے کر کے ایک دو بار میرے کمرے میں اچانک آگیا مگر میں نے اسے نظریں بچا کر بار بار دیوار کے کاغذ کو گھورتے ہوئے پکڑ لیا ۔ جینی بھی یہ سمجھ کر کہ میری توجہ ادھر نہیں کاغذ کو ہاتھ سے چھو کر دیکھ رہی تھی ۔ جب میں نے بہت ضبط کرتے ہوئے قریب جا کر آہستہ سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہی ہے تو وہ اس طرح چونک اٹھی جیسے اسے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو اور بھڑک کر کہنے لگی کہ تم نے اسے خواہ مخواہ ڈرا دیا ۔ پھر وہ خیال ظاہر کرنے لگی کہ یہ کاغذ اپنا رنگ چھوڑ رہا ہے اور اسی لیے اس طرح کے پیلے دھبے میرے کپڑوں اور جسم پر ہیں اور کبھی کبھی اس کے اور جان کے کپڑوں پر بھی لگ جاتے ہیں ۔ ہمیں کمرے میں رہتے وقت اس کا خیال رکھنا چاہیے —— کس قدر عام سی بات تھی ۔ اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ وہ وہاں کچھ اور دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی ۔ مگر میں نے بھی طے کر لیا ہے کہ میں ان چیزوں کا علم اپنے علاوہ کسی کو نہ ہونے دوں گی ۔

ہمارے یہاں سے جانے میں اب صرف ایک ہفتہ باقی ہے ۔ میں اب پہلے سے بہتر محسوس کرنے لگی ہوں ۔ یہی کمرہ جو میرے لیے تکلیف دہ تھا اب میری ساری دلچسپیوں کا مرکز بن گیا ہے مجھے اور بڑی بے چینی سے رات ہونے کا انتظار [illegible] جب دن بھر دھندلے اور نسبتاً جامد رہنے والے نقش متحرک اور واضح ہو جاتے ہیں ۔ اسی لیے میں نے رات کو سونا بہت کم کر دیا ہے کیوں کہ ان دلچسپ لمحوں کو کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی [illegible]

اس دیواری کاغذ کا پیلا رنگ کتنا عجیب ہے —— ویسا پیلا نہیں جیسے پیلے [illegible] پھول [illegible] باغ میں کھلے ہیں ۔ یہ پیلے رنگ کی [illegible] ذہن میں [illegible] جیسے [illegible] کبھی [illegible] ۔ اسے دیکھ کر [illegible] اور [illegible] چیزوں کا خیال آتا ہے [illegible]

اس میں سے ایک مخصوص قسم کی بُو بھی خارج ہوتی ہے جو میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی محسوس کرلی تھی مگر ان دنوں کافی دھوپ اور ہوا ہونے کی وجہ سے یہ کچھ دبی دبی سی رہی تھی۔ اب جب کہ دھند اور بارش کا سلسلہ شروع ہوا ہے یہ بُو ہر طرف پھیل گئی ہے یہاں تک کہ یہ کھانے کے کمرے میں بھی میرے داخل ہونے سے پہلے ہی جا پہونچتی ہے ـــ بڑے ہال کے گوشوں میں ـــ سیڑھیوں کے موڑ پر اور اس قسم کی جائے کیسی کیسی غیر متوقع جگہوں پر گھات لگائے بیٹھی رہتی ہے۔ کبھی کبھی موقع پاکر میرے بالوں میں گھس جاتی ہے ـــ

سوتے سے بھی اچانک آنکھ کھل جائے تو یہ آس پاس ہی منڈلاتی ہوئی ملتی ہے۔ شروع میں تو مجھے اس سے سخت دحشت ہوئی اور وہ اس قدر بڑھی کہ میں نے اس سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے مکان کو جلا کر ختم کر دینے تک کی بات سوچ لی۔ مگر اب دھیرے دھیرے وہ ذہن سے اس طرح چپک گئی ہے کہ اس کے بغیر اپنے وجود کا تصور ہی مشکل لگتا ہے اور اگر ویسا کبھی خیال بھی آتا ہے تو وہ اس لیے کہ ویسا کرنے سے یہ جاننا ممکن ہو سکے گا کہ یہ ایسی بُو ہے اور کیا مکان نہ ہونے پر بھی یہ اسی طرح باقی رہے گی۔

اتنی راتوں تک مسلسل جاگ جاگ کر آخر کار میں نے اس عورت کو واضح طور پر دیکھ لیا ہے اب مجھے یقین ہو گیا ہے وہی موقع پاکر کاغذ کے پیچھے سے اُسے زور زور سے ہلاتی ہے۔ کبھی کبھی کئی عورتوں کی موجودگی کا احساس بھی ہوتا ہے مگر اکثر وہاں صرف ایک ہی عورت رہتی ہے جو گھٹنوں کے بل تیز تیز چلتی رہتی ہے اور بڑی بے چینی سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتی ہوئی لگتی ہے۔ اس کی اس جد وجہد سے کاغذ مسلسل ہلتا رہتا ہے۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ عورت دن کے وقت باہر آجاتی ہے۔ میں ایسا اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں نے اُسے دن میں کمرے کے باہر کھلنے والی کھڑکیوں کے قریب دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ وہی عورت ہے کیوں کہ وہ اسی طرح گھٹنوں کے بل دھیرے دھیرے چھُپ چھُپ کر چل رہی تھی ـــ پھر میں نے اسے کھڑکی سے باہر درختوں کے بیچ والے راستہ پر بھی اُسی طرح آتے دیکھا ـــ اس وقت وہ دوسری طرف سے آتی ہوئی گاڑی کو اچانک دیکھ کر انگور کی گھنی بیلوں کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ میرے خیال میں اس کا ایسا کرنا فطری ہے کیوں کہ کوئی بھی عورت یہ نہیں چاہے گی کہ کوئی دن کی روشنی میں اُسے اس طرح رینگ رینگ کر چلتا ہوا دیکھے ـــ

ـــ میں خود دن میں اس طرح کمرے میں چلنے سے پہلے دروازہ اچھی طرح سے بند کر لیتی ہوں۔ البتہ رات میں میں ایسا کرنے کی ہمت نہیں کر پاتی کیوں کہ جان کسی بھی وقت جاگ کر مجھے دیکھ سکتا ہے۔

میں نے دیوار کے کاغذ کو دن میں کمرہ بند کر کے جگہ جگہ سے اکھاڑنا شروع کر دیا ہے۔ گو کہ میں یہ بہت چھپا کر کرتی ہوں مگر مجھے جان کو کچھ شبہ

ہوگیا ہے اور وہ جینی سے میرے بارے میں طرح طرح کے سوالات کر رہا تھا۔ میں اس سے آنکھ نہیں ملا پا رہی ہوں ــــ دیوار کے نچلے حصے کا کافی کاغذ میں نے اکھاڑ دیا ہے ــــ مجھے اس عورت کو کاغذ کے پیچھے سے باہر نکلنے میں مدد کرنا ہے ــــ وقت بہت کم ہے۔

آج ہمارے یہاں قیام کا آخری دن ہے اور خوش قسمتی سے آج جان اپنے کام کے سلسلے میں باہر ہی رہے گا۔ جینی میرے کمرے میں سونا چاہتی تھی مگر میں نے اکیلے سونے پر اصرار کر کے اس سے پیچھا چھڑا لیا ہے۔

چاندنی کمرے میں آگئی ہے اور اس کے ساتھ ہی کاغذ کے پیچھے رہنے والی عورت نے باہر آنے کی جد و جہد شروع کر دی ہے۔ اس نے کاغذ کے پیچھے تیز تیز چلتے ہوئے پھٹے حصوں سے اپنے آپ کو باہر نکالنے کی کوشش میں اسے زور زور سے ہلانا شروع کر دیا ہے ــــ میرے لیے یہ منظر ناقابل برداشت ہوگیا ہے ــــ میں بے قابو ہو کر اس کی مدد کے لیے بھاگی ــــ ادھر سے میں کاغذ کو اکھاڑنے کے لیے پوری طاقت سے اسے اپنی طرف کھینچتی ہوں اور ادھر سے وہ اسے زور زور سے جھنجھوڑتی ہے اور اسی طرح صبح ہو جاتی ہے اور ہم گزوں کاغذ دیوار سے اکھاڑ ڈالتے ہیں۔ اب میرے سر کی اونچائی تک تقریباً آدھے کمرے کا کاغذ اکھڑ چکا ہے۔

صبح جینی کمرے میں آکر حیرت سے چاروں طرف دیوار کو دیکھ رہی ہے مگر میں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ چوں کہ مجھے اس پھٹے ہوئے کاغذ سے دیوار پر بننے والے نقوش سے نفرت تھی اس لیے میں نے خود ہی اسے جس قدر ممکن تھا اکھاڑ ڈالا ــــ مگر اس نے کہا کہ مجھے اس سے کہنا چاہیے تھا وہ یہ کام کر دیتی۔ مجھے اپنے کو ایسے کاموں سے تھکانا نہیں چاہیے ــــ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھ رہی تھی ــــ لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں میں جب تک یہاں ہوں تب تک کسی کو اس کاغذ کو چھونے نہ دوں گی ــــ جینی نے مجھے کمرے سے باہر لے جانے کی بھی کوشش کی مگر میں کسی طرح راضی نہ ہوئی ــــ

اب وہ چلی گئی ہے اور میری تنہائی میں مخل ہونے والا کوئی نہیں ــــ مجھے اپنا کام آج ہی ختم کرنا ہے کیوں کہ پھر موقع نہ مل سکے گا ــــ سارا فرنیچر ہٹایا جا چکا ہے اور رات کو ہمیں نیچے کے کمرے میں سونا ہے ــــ

میں نے دروازہ مقفل کر لیا اور چابی کھڑکی سے باہر نیچے باغ کی روش پر پھینک دی ہے ــــ میں نے کمرے میں ایک رسی پہلے سے چھپا کر رکھ لی تھی تاکہ اگر کاغذ کے پیچھے رہنے والی عورت نکل کر بھاگنا چاہے تو میں اسے پکڑ کر رسی سے باندھ دوں ــــ مگر مجھے اس تک پہونچنے کے لیے کسی چیز پر چڑھنا پڑے گا ــــ یہاں اس بھاری پلنگ کے علاوہ اور ایسا کچھ نہیں۔ مگر افت!

یہ کس قدر بھاری ہے ــــ میرے اعصاب جواب دیتے جا رہے ہیں ــ میں جھنجھلا کر اس کی لکڑی کو دانتوں سے چبانے کی کوشش کرتی ہوں۔ میرے مسوڑوں سے خون بہنے لگا ہے ــــ میں فرش سے اچھل اچھل کر جتنی اوپر پہنچ سکتی ہوں کاغذ کو نوچتی جاتی ہوں۔

ــــ کاغذ کے پیچھے دیوار پر ابھرنے والے ہیولے زور زور سے چیختے اور کراہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ میرا بھی جنون بڑھتا جا رہا ہے اور میں کسی بھی لمحے بدحواسی میں کچھ بھی کر سکتی ہوں ــــ ــــ میں کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا سکتی ہوں۔ مگر نہیں ــــ میں ویسا نہ کروں گی۔ لوگ اس کا غلط مطلب نکالیں گے ــــ اس وقت تو میں کھڑکی کے باہر دیکھنے تک کی ہمت نہیں کر پا رہی ہوں۔ مجھے شک رہا ہے کہ وہاں کھڑکی کے پرے بہت سی عورتیں جمع ہیں۔ جو چھپتی ہوئی دھیرے دھیرے رینگ کر آگے بڑھ رہی ہیں ــــ وہ بھی شاید میری ہی طرح کاغذ کے پیچھے سے نکل کر باہر آئی ہیں ــــ

ــــ میں اب پوری طرح اس کمرے سے بندھ چکی ہوں اور باہر جانے کے قابل نہیں ــ رات کو مجھے پھر کاغذ کے پیچھے چلا جانا ہے ــ مگر اب یہ بھی کس طرح کروں گی؟ ــ مگر آہ! اس وسیع کمرے میں اپنی مرضی سے چاروں طرف آزادی سے اپنے آپ کو گھسیٹتے رہنے میں ہی مسرت ہے!۔

ــــ شاید جان باہر دروازے پر آگیا ہے!۔

مگر نہیں ڈارلنگ! ــ دروازہ مقفل ہے اور اسے کھولنا تمہارے بس میں نہیں ــــ جان کیسی بدحواسی سے دروازہ پیٹ رہا ہے ــــ اور اب وہ کلہاڑی کے لیے چیخ رہا ہے ــ اتنا خوب صورت دروازہ توڑ دینا کیسی بد مذاقی ہوگی!

"جان! چابی کھڑکی کے باہر روش پر پڑی ہے" میں آہستہ سے کہتی ہوں ــــ تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہتی ہے۔

"دروازہ کھول دو میری جان" وہ پکار کر کہتا ہے۔ "میں دروازہ نہیں کھول سکتی تم چابی لا کر دروازہ کھول لو" اور میں نے یہی بات آہستہ آہستہ اتنی بار دہرائی کہ اسے نیچے جا کر چابی لانی پڑی اور پھر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ لیکن وہ دروازے کے قریب ہی ٹھٹھک گیا۔

"یہ تم کیا کر رہی ہو!" وہ چیخا۔ تم کہیں پاگل تو نہیں ہو گئی ہو اس کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

میں اسی طرح فرش پر رینگتی ہوئی گھسٹتی رہی۔ اور گردن موڑ موڑ کر اسے دیکھتی رہی "تمہاری اور جینی کی ساری کوششوں کے باوجود میں آخر کار باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہوں" میں نے کہا۔ "اور میں نے دیوار کا سارا کاغذ اکھاڑ پھینکا ہے۔ اب تم لوگ دوبارہ مجھے اس کے پیچھے قید نہیں کر سکتے۔"

پیش کر دہ سکتے میں آ گیا۔ اور پھر چکرا کر گر پڑا۔ ایسا کیوں ہوگا؟ — میں سوچتی ہوں — مگر ایسا ہوا اور وہ میرے سامنے زمین پر اس طرح پڑا تھا کہ مجھے ہر چکر میں اسے روند کر آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ ○○

THE YELLOUWLLPAPER.

کو ہم ایک چھوٹا موٹا ادبی شاہکار کہہ سکتے ہیں جو تقریباً پچاس برس گمنامی میں رہنے کے بعد موجودہ دور کی تحریک نسواں کے پس منظر میں دوبارہ دریافت ہوا ہے۔ ۱۸۹۱ میں امریکہ میں پہلی بار شائع ہوا شارلوٹ گلمین کا یہ ناولٹ ولیم ڈین ہاورس کے الفاظ میں خون کو منجمد کر دینے والا ہے۔

اس ناولٹ کا مواد شارلوٹ گلمین نے خود اپنی حقیقی زندگی سے اخذ کیا ہے اور شاید اسی لیے جس قسم کے تیکھے پن، فنی گرفت اور تخلیقی صداقت سے اس کی یہ تخلیق عبارت ہے وہ خود اس کی دوسری تخلیقات کو میسر نہیں۔

شارلوٹ گلمین تحریک نسواں سے عملی طور پر وابستہ رہی تھی اور بنیادی طور پر ایک جرنلسٹ، مقرر اور اشتہار باز تھی ویسے اس نے کافی تعداد میں کہانیاں اور ناول لکھے ہیں۔ وہ ایک عرصے تک THE FOREVNNER نام کا خود اپنا ایک میگزین شائع کرتی رہی تھی اور [illegible] MANS AND ECONMICS نام کی اس کی ایک کتاب ۱۸۹۸ کے آس پاس کالجوں میں نصاب کے طور پر شامل [illegible] جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ کتاب [illegible] زبانوں میں [illegible]

[illegible] کی ' فرہنگ ' [illegible]

۱ بکھر گیا۔ [illegible] اندر ہوتا [illegible] ۳ [illegible] ۴ [illegible] ۵ جلنا [illegible] ۶ وہاں ۷ ابھی تک ۸ [illegible] ۹ کہانیاں ۱۰ [illegible] ۱۱ بانے [illegible] ۱۲ کہتے ہیں ۱۳ [illegible] ۱۴ اندھیرا ۱۵ چھپایا ۱۶ صبح ۱۷ غور سے ۱۸ دیکھنا ۱۹ قسمت ۲۰ رقیب ۲۱ بال ۲۲ سونے کے ۲۳ [illegible] ۲۴ نشیب ۲۵ پستان ۲۶ معشوق ۲۷ پائے ۲۸ [illegible] ۲۹ نادر ۳۰ پیدا کیا ۳۱ سورج ۳۲ [illegible] ۳۳ بالوں کی لٹ ۳۴ [illegible]۔ [illegible] ۳۵ کر ہی ۳۶ فہم ۳۷ صورت ۳۸ قطعے ۳۹ قبضہ کیا۔

نقد و نظر [illegible] سے آگے

کی دوسری کتابوں کے بارے میں کوئی ضروری معلومات حاصل ہوتی ہیں تو وہ بھی پیش کر دی گئی ہیں۔ غرض کہ کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں وہ تمام معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے جو کسی بھی اعتبار سے اہم ہو سکتی ہیں۔ مرتبین کی یہ کوشش [illegible] نے ایک علمی ضرورت کو پورا کیا ہے بلکہ [illegible] ہے۔ ترقی اردو بیورو بھی مبارک باد کا مستحق ہے جس کے توسط سے یہ [illegible] کتابیات منظر عام پر آئی۔ یہ اہم علمی [illegible] ہر قسم کی حوصلہ افزائی اور ستائش کا مستحق ہے [illegible] اہم [illegible] ہے [illegible]

رشید [illegible]

محمد علی اثر
مرتب

غوّاصی کی نو دریافت غزلیں

(بسلسلۂ گزشتہ)

(۶)

....گزن خلوت کا اوّل گھنے کوں جا گا دیکھنا
بالن کی انکھیاں سوں بزاں جو سنگ دکھا گا دیکھنا

جان جاں منج اس کا خیال لیجاتا ہے تاں کن جاؤں میں
ابھوں نہ جانوں بیشتر کاں کاں لبھا گا دیکھنا

اس کے نظاریاں میں کتے اکثر رجھاتا بھوت ہے
آخر نظاریاں سوں منجے کیوں کیوں رجھا گا دیکھنا

میرا دو نا برہ کا اندکا بھر جیوں رین ہے
اس رین کا وو چاند ہو کو جگمگا گا دیکھنا

مخفی دلاں کوں مست وو کرتا کہ پایا ہوں ادک
منج دل کوں کیسا مست مد مخفی پلا گا دیکھنا

پانجا گیا ہوں عشق سوں سب تن ہوا ہے آرسی
اپنے مقابل کو لجا منج بیسلا گا دیکھنا

غواص دل دریا منے پانے کوں موتی عشق کا
ڈبکی تو کھایا ہے نکل کاں کاں تے آگا دیکھنا

(۷)

کل منج پلانیا سو توں کیسا شراب تھا
کتنا کہ منج منے تو کچ نہ تاب تھا

.... تھا ملک ایک رنگ اسے سجن
خلوت تمام منج سوں منجے بے حساب تھا

مکھڑا ترا نجھانے انیندی جب آنک کھول
سو وو جمال منج لکیں جیوں آفتاب تھا

دو تن ملا لیے تھے و لے اس وقت پیں
سوکھ کھول بول کچ نہ سکی وقت خواب تھا

ملیا تمے خیال میں یوں محو ہوے تھے جو
توں میں کئے کی بات کوں ناداں جواب تھا

چنگ ہور رباب مست ہوے تھے اپس منے
لذت سوں راگ رنگ میں تو بے حساب تھا

غواص کل وصال کی لذت تے میرا دل
مقصود ہور مراد سوں خوش کامیاب تھا

(۸)

نیلا سنجی تیرا چندر سی پیشانی [illegible] تج آتج قلیں جھمکے تارا ہو بہانی کا
گالاں پہ الک بکھرے یا لہریں دریا کے یا نقش سنے دو ورقاں پہ ہے مانی کا
یا تِل ہے ادھر دو یا خضر کھڑا ہو کر دیتا ہے نشانی تج امرت کے پانی کا
یا بات توں کرتی ہے یا پھول کلی میں تے جھڑتے ہیں رنگا رنگی یو عجب ہے نوانی کا
تج حسن کوں تیرے دو تج لب اکئے کچ کا [illegible] سکھ تج توں [illegible] کچ ہے رمز نہانی کا
یو ذوق بڑا ہے تج جو لوگ کتے ہیں سب یک [illegible] سو عاشق ہے خلانی کا
لگ رہ ترے کھڑے سوں جھلتا ہے ادھر پر خوش غواص جو ہوتی ہے دریا ئے معانی کا

(۹)

تجکوں ہی عاشق ہو آیا ہے ازل تے اس پرانی کا اسے پروا نہ ہو ہے کچ دنیا کی زندگانی کا
گدا سیرت ہے کر ظاہر یو جھو اس کے عاشق کوں کہ [illegible] ہے [illegible] باطن میں خلافت خسروانی کا
بجن کے وصل پیالے کا میسر ہو گئے کاں ہے جسے [illegible] سو [illegible] یو قضا ہے آسمانی کا
ازل تے عشق کا پرتو پڑیا ہے جن کے دل اوپر سو کیوں [illegible] دل [illegible] جھمکے تن ......نی کا
گیا ظلمات میں یو جیو عجب امرت ہے آ کوئی خضر ہو گا سو [illegible] ا س (امرت) کے پانی کا
بھوت منصور دیکھیا ہوں دغا کھا گئے ہیں اس جا [illegible] چھپا [illegible] اس کے نہانی کا
غواصی عاشق کر [illegible] ہو خوش حسال [illegible] کہ تج پہ [illegible] نظر ہے [illegible] سب پرانی کا

(۱۰)

جن تج کوں دیا روپ دے [illegible] تج کالا [illegible] رمز میں کیا خوب [illegible]
روشن [illegible] تج [illegible] تج [illegible] نکل [illegible] آتیا
دو [illegible] ہے [illegible] تج [illegible] ہوا [illegible]
[illegible] تج آج دیں جو دیکھتا ہوں [illegible] [illegible] تج [illegible] بہاتیا
[illegible] کر [illegible] تج کرتے [illegible] رنگ دکھلاتیا
[illegible] تج [illegible] [illegible] لذت [illegible]
[illegible] [illegible] دوست کر [illegible]

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے۔ ادارہ کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

"وضاحتی کتابیات" جلد اوّل بابت ۱۹۷۶ء

مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر مظفر حنفی۔

سائز ۲۲ × ۱۸، مجلد، ۲۱۸ صفحات قیمت تحریر نہیں

ناشر: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔

اردو میں اشاریاتی کتابوں (INDEX BOOKS) اور حوالہ جاتی کتابوں (REFERENCE BOOKS) کی افسوس ناک حد تک کمی ہے۔ اردو میں اس قسم کی کتابوں کا لے دے کر جو سرمایہ ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی کی "اشاریہ فہرست" (مطبوعہ ۱۹۲۳ء)، بابائے اردو مولوی عبدالحق کی نگرانی میں تیار کردہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کی "قاموس الکتب" جلد اوّل (مطبوعہ ۱۹۶۱ء) جو مذہبیات سے متعلق کتابوں کی فہرست پر مشتمل ہے، غالب، انیس اور اقبال وغیرہ سے متعلق پروفیسر عبدالقوی دسنوی جیسے دو ایک حضرات کی مرتب کردہ کتابیات ــــ یہی ہے اس ضمن میں اردو کا کل اثاثہ ــــ کتابیات کے سلسلے میں اردو کی اس تہی دامنی کے باعث علم و ادب کی راہ میں جو دشواریاں پیدا ہوتی ہیں ان کا ایک مختصر فہرست ہے۔ ایسے عام قارئین سے تعلق نہیں جو مطالعے کی کسی خاص جہت کے خواہش مند یا متمنی ہوتے ہیں، بہ صورتِ حال اردو کے ریسرچ اسکالرز کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن اور صبر آزما ہوتی ہے۔ انگریزی اور دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں تازہ ترین مکمل و مستند اشاریوں کی رہنمائی میں تحقیقی کام کرنے والے جتنی مدت میں اپنا کام مکمل کر لیتے ہیں اس سے زیادہ مدت تک ہمارے ریسرچ اسکالر ضروری مواد کی تلاش میں بے جہت راہوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ ان دشواریوں کا احساس ہر اس شخص کو ہوتا ہے جسے کسی نہ کسی صورت میں ان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ان کے حل کے لیے کوئی عملی قدم اٹھانے کی سعادت پروفیسر گوپی چند نارنگ کے حصہ میں آئی جنھوں نے اپنے رفیق کار ڈاکٹر مظفر حنفی کی مدد سے سال بہ سال ہندوستان میں اردو زبان میں شائع ہونے والی کتابوں سے متعلق مفصل معلومات فراہم کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے جو ۱۹۷۶ء کی اردو مطبوعات سے متعلق ہے۔

کتاب کے مرتبین نے اپنے کام کے مقصد کا آغاز کا تعین کر کے واضح منصوبہ بندی اور عملی نقطۂ نظر سے کام لیا

پچھلے کام کے لیے کوئی نہ کوئی حد بندی ضروری تھی؛ کیوں کہ دو صدیوں کی طویل مدت میں چھپنے والی بے شمار کتابوں اور ایک صدی کے عرصے پر بکھرے ہوئے بے شمار رسائل کے اشاریے تیار کرنا دو ایک افراد کی بس کی بات نہیں۔ یہ کثیر الجہات اور طویل المدت کام مشترکہ طور پر ترقی اردو بورڈ، انجمن ترقی اردو، ریاستی اکاڈیمیوں اور مختلف یونیورسٹیوں کو تقسیم کار کی بنیاد پر انجام دینا چاہیے۔ "وضاحتی کتابیات" کے مرتبین نے مختلف نوعیت کی کتابوں کی جو درجہ بندی کی ہے وہ اس کام کے لیے مجوزہ خاکے کا کام دے سکتی ہے۔

زیر تبصرہ کتابیات کی ترتیب جن خطوط پر کی گئی ہے ان پر مرتبین نے کتاب کے مقدمے میں اس طرح روشنی ڈالی ہے۔ "کتابیات کو اہمیت کے اعتبار سے صنف وار مرتب کیا گیا ہے۔ ترتیب ہر جگہ حروف تہجی کے اعتبار سے رکھی گئی ہے تاکہ تکنیکی نظر سے مطالعہ کرنے والے اور عام ادبی محققین یکساں آسانی سے اس سے استفادہ کر سکیں .... کتابیات کو سولہ[19] شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی نو شقیں ادب یا زبان کے بارے میں ہیں۔ ان میں سب سے پہلے "ادبی تحقیق و تنقید" ہے۔ بعد میں شاعری، ناول، افسانہ، ڈراما، مضمون، انشائیہ، خاکہ، سفرنامہ، مکتوبات اور آخر میں زبان ہے۔ بعد کی سات شقیں سماجی اور سائنسی علوم یعنی "تاریخ و تہذیب و سیاسیات"، "تعلیم، صنعت و حرفت و کامرس"، "سائنسی علوم" اور "مذہبیات" اور "بچوں کا ادب" سے متعلق ہیں۔ سب سے آخر میں "متفرقات" ہے۔ ان سب حصوں میں کتابیں حروف تہجی کے اعتبار سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ جو کتاب ایک سے زیادہ شعبوں سے متعلق ہے اس کا ذکر دوسری شق میں بھی کر دیا ہے، لیکن تفصیل اس شق کے تحت درج کی گئی ہے جس سے وہ کتاب بنیادی طور پر متعلق ہے۔ رجوع کے لیے حوالہ دے دیا ہے۔ کتابیات کے آخر میں دو اشاریے بھی شامل ہیں۔ ایک تمام کتابوں کے ناموں کا بہ ترتیب حروف تہجی۔ کتابوں کے نام تو شروع کی فہرست میں بھی ہیں لیکن اس میں صنف یا موضوع میں کتنی یا کس کس کی یا کیا کیا کتابیں شائع ہوئیں تو شروع کی فہرست میں دیکھا جا سکتا ہے لیکن اگر کسی خاص کتاب کو دیکھنا ہو تو کتابوں کے ناموں کے اشاریے کی مدد سے یہ معلومات حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح مصنف کے بارے میں معلومات مصنفین کے ناموں کے اشاریے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ مصنفین کے ناموں کے اشاریے میں مصنفین کے علاوہ مولفین، مرتبین، مترجمین سب کے شامل ہیں۔"

پیش کردہ معلومات سے کتاب کی افادیت ظاہر ہے۔ اس کتابیات کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ مرتبین نے محض فہرست سازی پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ ہر کتاب کے بارے میں "کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔" ان میں کتاب کی ظاہری خصوصیات اور مندرجات اور مصنف و ناشر کی تفصیلات سے لے کر مندرجات اور ان کے بارے میں تمام ضروری "وضاحتی معلومات" شامل ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اگر کسی کتاب سے متعلق [illegible]
(باقی صفحہ [illegible] پر دیکھیے)

وقار خلیل

اردو نامہ

اردو کی علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

ڈسمبر ۱۹۸۱ء

۱۰ ڈسمبر: جناب جسٹس ہدایت اللہ نائب صدر جمہوریہ ہند نے عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں گوشۂ علی یاور جنگ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ علی یاور جنگ ملک کے قابل فخر سپوت مشترکہ تہذیب کے حامی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے معماروں میں سے ایک تھے۔ اس تقریب کی صدارت مسز اندرا انجیا چیف منسٹر نے کی۔ بیگم علی یاور جنگ نے ۲۴۰۰ کتابیں کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کو عطیہ دیں۔ پروفیسر جی رام ریڈی وائس چانسلر نے خیرمقدمی خطاب کیا۔

۱۱ ڈسمبر: ہندوستان عظیم ادیب... کے رکن جناب صالح... برس کی عمر میں رحلت کر گئے۔

۱۲ ڈسمبر: کے وی رنگا ریڈی میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام سالانہ کل ہند مشاعرہ جوبلی ہال میں منعقد ہوا جس کی صدارت چیف منسٹر مسٹر انجیا نے کی۔ اس مشاعرہ میں مسز ایکل... راز الہ آبادی، خضر... رشید ... فاروقی دلی آسی اور ... کے علاوہ میزبان شعراء کنول پرشاد کنول، بصیر احمد خسرو، علی احمد جلیلی، خیرات ندیم، وقار خلیل، جہاندار افسر، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، عظیم ... ثریا جبیں، عزیز النساء صبا اور ہیپال سنگھ ورما نے کلام سنایا۔ عارف الدین سلیم نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ ... حیدرآبادی ... احمد صدیقی صاحب نے خیر مقدم کیا۔

۱۳ ڈسمبر: مسرور ڈنڈا میموریل سوسائٹی نے دکنی زبان کے عوامی شاعر مسرور ڈنڈا کی یاد میں ادبی اجلاس اور مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے ادبی اجلاس کی صدارت کی۔ ... وزیر ... کے کیتور ... مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، عوض سعید، حسن علی مرزا، ... نے ... ڈنڈا کی شاعری اور شخصیت کو خراج عقیدت ادا کیا۔ امجد باقی نے سعدی کی شب میں بصدارت جناب شاذ تمکنت مشاعرہ ... محمود خان ... کے علاوہ ممتاز میزبان شعراء نے کلام سنایا۔ جناب لطیف ... سوسائٹی نے جلسہ اور مشاعرہ کے انتظامات کیے اور بتایا کہ ڈنڈا کی شاعری کا انتخاب سوسائٹی کی طرف سے شائع ہو کر منظر عام پر آجائے گا۔

○ محفل خواتین کا ماہانہ ادبی و شعری اجلاس ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ فاطمہ عالم علی نے "مخدوم کی شاعری" پر عالمانہ مقالہ اور محترمہ سیدہ طیبہ بیگم نے خوب صورت کہانی پیش کی۔ خواتین شعراء نے نیا کلام سنایا۔

۱۷ ڈسمبر: بزرگ کلاسیکی شاعر ٹھاکر بجرنگ سنگھ نوقر (۸۷) سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔ نوقر مرحوم سید آبادی تہذیب و اخلاق کا مجسمہ سایہ دار تھے۔ افسوس کہ مجموعہ کلام زندگی میں شائع نہ کر سکے۔

○ ... ادبی ... اس ... ٹرسٹ کی طرف سے ... کے لیے

رنگین اور باتصویر کہانیوں کی دو کتابیں "اکبر" اور "تیغ منتر کی کہانیاں" جناب خواجہ عبد الغفور سکریٹری ٹرسٹ کی نگرانی میں شائع ہوئیں۔ یہ کتابیں رجسٹرڈ بک خانے بلا قیمت سکریٹری [illegible] اردو ٹرسٹ لائبریری۔ لبرٹی روڈ۔ حمایت نگر حیدرآباد سے طلب کر سکتے ہیں۔

۱۸ دسمبر۔ مسٹری [illegible] چیف منسٹر نے سماچار بھارتی کی اردو سروس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ حکومت اردو زبان اور صحافت کی ترقی سے دلچسپی رکھتی ہے۔

۱۹ دسمبر۔ حلقۂ ارباب ذوق (ایوان اردو ٹرسٹ لائبریری) کا ماہانہ اجلاس جناب خواجہ عبد الغفور [illegible] امور آندھرا پردیش کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب "اردو افسانہ: روایت اور مسائل" پر مبسوط تبصرہ سنایا۔ جناب محامد علی عباسی نے اس موقع پر [illegible] کے ترجمان سہ ماہی "مبصر" کے خصوصی [illegible] "قاضی نمبر" کی رسم اجرا انجام دی۔ جناب [illegible] اظہر افسر [illegible] جناب [illegible] نے شکریہ ادا کیا۔

۲۵ [illegible]

انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب غلام محمد صاحب کی اطلاع کے مطابق انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ترقی اردو بیورو حکومت ہند کے پراجکٹ "اردو انسائیکلو پیڈیا" کا [illegible] جناب [illegible] نائب صدر جمہوریہ ہند نے [illegible] سے اتفاق کیا ہے [illegible] انسائیکلوپیڈیا [illegible] اندرا گاندھی کے نام سے منسوب ہوگا۔

۲۰ دسمبر ۱۹۸۷ء [illegible] ادبیات اردو کی گولڈن جوبلی تقاریب کمیٹی کا جنرل باڈی اجلاس ایوان اردو میں صدر تقاریب کمیٹی ڈاکٹر میر اکبر علی خاں گورنر یوپی کی صدارت میں منعقد ہوا اور طے پایا کہ افتتاحی تقریب میں شرکت کے لیے نائب صدر جمہوریہ ہند کو مدعو کیا جائے اور [illegible] گولڈن جوبلی تقاریب کی [illegible] نیز یہ طے پایا کہ ادارے کی گولڈن جوبلی تقاریب کے سلسلے میں [illegible] جس میں مشاعرہ، سمینار، [illegible] [illegible]

کی اشاعت [illegible] شامل ہیں۔ جناب سید ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) [illegible] اردو دوستوں سے رکنیت استقبالیہ قبول کر کے گولڈن جوبلی تقاریب کو کامیاب بنانے کی اپیل کی ہے۔

۲۳ دسمبر۔ [illegible] اکیڈیمی کی طرف سے جناب رضا الجبار [illegible] کی آمد پر [illegible] جناب [illegible] کی صدارت میں ترتیب دی گئی۔ رضا الجبار، مظفر [illegible] رشید [illegible] مظہر الزماں خاں، ڈاکٹر یوسف کمال اور رحمت یوسف زئی نے اپنی اپنی تخلیقات [illegible] کو کامیاب بنایا۔

۲۶ دسمبر۔ اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس [illegible] کی صدارت میں بمقام [illegible] منعقد ہوا۔ جناب [illegible] صدر شعبہ اردو [illegible] اور جناب رشید [illegible] مترجم ریاستی دفتر ترجمہ نے [illegible] "ادب [illegible]" [illegible]

نسیم اعجاز، حمید الدین ساغر اور قدیر انصاری نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد ادارہ مجلس نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

جنوری ۲۰۰۵ء

یکم جنوری: ادبائے قلم و نثر کے زیر اہتمام حیدر ولا میں سالِ نو کی ادبی و شعری محفل ملک الشعراء اوج یعقوبی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جناب خواجہ عبدالغفور نے فکاہیہ سنایا۔ طرحی محفل شعر میں اوج یعقوبی، خواجہ شوق، وقار خلیل، ڈاکٹر راہی، رشید عبدالسمیع جلیل، مظفر الدین صاحب، حسام الدین سلیم، اسعد اللہ حسینی، احمد شجاع فاروقی، اخیل زاہد، نذیر نیر اور غلام جیلانی بیگ صادق نے سالِ نو پر کلام سنایا۔ جناب اختر جمالی نے خیر مقدم کیا۔ وقار خلیل سکریٹری نے شکریہ ادا کیا۔

۷ جنوری: آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے شعبہ اردو کی طرف سے پہلی مرتبہ نوعمر اور جواں سال شعراء کا ایک مشاعرہ رویندرا بھارتی میں اسٹیج کیا گیا۔ مسٹر راجہ رام (ایس ڈی، اے آئی آر) نے صدارت کی۔ مسٹر کبیر احمد اور مسٹر ظفر الظفر پروڈیوسرز نے خیر مقدم کیا۔ اس مشاعرہ میں فاروق شکیل، آغا سروش، عقیل الرحمن عقیل، مجتبیٰ ناظر، مرغوب شہید، قدیر انصاری، نادرہ عقیل، جناب شہیدی، نور اللہ تمکین، حمید ساغر، جمیل فضا، نسیم اعجاز اور صدر الشاہد نے کلام سنا کر داد حاصل کی۔ محترمہ فاطمہ نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۸ جنوری: دارالسلام میں کل ہند مجلس اتحاد المسلمین کے زیر اہتمام محفلِ نعتیہ مشاعرہ جشن شرف الدین احمد کی نگرانی میں منعقد ہوا۔ پروفیسر جگناتھ آزاد، ڈاکٹر مصطفیٰ منظر، حضرت فنا نظامی، الحاج مرزا فکری بیگ، محمد عبدالقادر ادیب، اوج یعقوبی، کنول پرشاد کنول، سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، وقار خلیل، رحمن جامی، ڈاکٹر گووند شاہی، فیض الحسن خیال، رئیس اختر، معین علی الدین نوید، امان ارشد، جوہر علی، میرالنساء نیر، بے ہوش محبوب نگری، صبر آفاقی اور دستہ شاعرہ جناب حافظ فقری نے بارگاہِ رسالت مآب میں نذرانہ پیش کیا۔ جناب صلاح الدین اویسی (ایم ایل اے) صدر مجلس نے خیر مقدم کیا۔

۹ جنوری: محفلِ خواتین کا ماہانہ ادبی و شعری اجلاس ڈاکٹر آمنہ بیگم کی صدارت میں ہوا۔ محترمہ ثریا غیاث صدیقی نے مزاحیہ مضمون سنایا اور محترمہ قمر جمالی نے کہانی سنائی۔ مظفر النساء ناز، نسیم نیازی اور بشیر جعفری نے کلام پیش کیا۔ محترمہ فاطمہ عالم علی نائب صدر محفل نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۱۰ جنوری: بین الاقوامی شہرت یافتہ ڈاکٹر سید علی کی قیام گاہ پر ڈاکٹر مرزا منظر (سابق نائب ناظم صحت کرناٹک) اور جناب محمد عبدالقادر ادیب گلبرگوی (مصنف نقار خانے میں) کے خیر مقدم میں محفل شعر آراستہ ہوئی۔ ملک الشعراء حضرت اوج یعقوبی نے صدارت کی جب کہ جناب خواجہ عبدالغفور سکریٹری مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی اور جناب اسعد اللہ سید سابق کلکٹر مہمانانِ خصوصی تھے۔ وقار خلیل نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ مرزا اوج، منظر، ادیب، ڈاکٹر غیاث صدیقی، وقار، تاج مہجور، بشیر وارثی، رحمن جامی، مضطر مجاز، باقر منظور، طالب خوندمیری، رحمت یوسف زئی، غیاث متین، حسن فرخ، نذیر نیر، اکبر یوسفی، انجم نظامی، ساجد حیدرآبادی

عزیز محمودی، عابد قادری، تحفہ ظریف اللہ تحسین اور اسحاق ملک نے کلام سنایا۔ ڈاکٹر سید علی نے اردو شعراء کے میڈیکل چیک اپ کے لیے اپنی خدمات کا پیشکش کیا اور ادبی و شعری محفلوں کے انعقاد میں اپنے تعاون کو خدمت کا جذبہ قرار دیا۔

۱۲؍ جنوری: دکن کے ملک گیر آرٹسٹ اور مصور جناب سعید بن نقش سابق پروفیسر کالج آف آرٹس بعارضہ فالج رحلت کر گئے۔ ترقی پسند مصنفین اور ادیبوں شاعروں کی طرف سے تعزیتی بیانات میں نقش کی وفات کو ناقابلِ تلافی سانحہ قرار دیا گیا۔

۱۳؍ جنوری: برصغیر کے نامور شاعر جناب شاذ تمکنت ریڈر و ریسرچ اسکالر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کا تیسرا مجموعۂ کلام "ورقِ انتخاب" کا ہندوستانی ایڈیشن "حسامی بک ڈپو" نے شائع کیا۔ اس کا پاکستانی ایڈیشن مکتبہ دانیال لاہور نے چھاپا تھا۔

۱۶؍ جنوری: کل ہند صنعتی نمائش کی طرف سے نمائش کلب میں طنز و مزاح کی شاعری کہنے والوں کا مشاعرہ مسٹر نریندر لوتھر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ، طالب خوندمیری، حمیمیں ظریف، صبغتہ اللہ بساط، سرپٹ حیدرآبادی، نصیر الدین بوگس، اشرف خوندمیری، گیم سید کی، اور حنیف خاں مذاق نے کلام سنایا۔

۱۷؍ جنوری: کل ہند میلاد کمیٹی کے زیر اہتمام جامعہ نظامیہ میں امیر جامعہ مولانا قطب الدین حسینی صابری کی نگرانی میں کل ہند نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ بیکل اتساہی، راز الہ آبادی، صابر شاہ آبادی اور میزبان شعراء مرزا شکور بیگ، معز ملتانی، سعید شہیدی، روح یعقوبی، خواجہ شوق، امیر احمد خسرو، علی احمد جلیلی، ڈاکٹر گوور شاہی، بشیر وارثی، ساز عابدی، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، مسعود جاوید، رحمٰن جامی، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، امان ارشد، داؤد نصیب، نصیر الدین بسمل، علی الدین نوید، اطہر شرفی، معین بزمی، جوہر ہاشمی، صادق نقوی (معتمد مشاعرہ) بے ہوش محبوب نگری نے بارگاہِ رسالت میں گلہائے عقیدت پیش کیے۔

۱۸؍ جنوری: حیدرآباد کی مختلف علمی و ادبی اداروں کی طرف سے نامور مصور سعید بن محمد نقش کا جلسہ تعزیت پروفیسر عالم خوندمیری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر وحید اختر صدر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب ظہیر الدین احمد نائب صدر اقبال اکیڈمی، جناب عزیز کارٹونسٹ (کراچی) جناب مصطفیٰ کمال مدیر شگوفہ اور یوسف اعظمی لکچرار انگریزی انوار العلوم کالج نے نقش مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔

۲۰؍ جنوری: اسٹیٹ اردو ٹیچرس اسوسی ایشن کی اردو کانفرنس کو مرکزی منسٹر آف اسٹیٹ تعلیم شریمتی شیلا کول نے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اردو انگلش کی زبان نہیں بلکہ یہ ان تمام کی زبان ہے جو اسے بولتے ہیں۔ مسز کول نے وزارت تعلیم حکومت ہند کے زیر انتظام ترقی اردو بورڈ کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ حکومتِ ہند اردو زبان کے فروغ اور ترقی سے دلچسپی رکھتی ہے اردو کی ترقی میں حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ کے حصے کو بھی آپ نے زبردست خراج ادا کیا۔ مسٹر بھوانم وینکٹ رامی ریڈی وزیر تعلیم نے صدارت کی اور کہا کہ حکومت اردو زبان کے فروغ کے لیے تمام ضروری اقدامات کرے گی۔ موصوف اردو تعلیم سے متعلق ستمبر منصوبہ کو پرزور دیا۔ مسٹر خورشید عالم خاں مرکزی وزیر سیاحت و شہری ہوا بازی، میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی

ریاستی وزراء مسز نمکر کشیاؤ اور وجی بھنگٹ سوامی نے بھی اساتذہ کی اس اردو کانفرنس کو مخاطب کیا۔ مسٹر عبدالرحیم صدر اسوسی ایشن نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا اور سید علی موسوی معتمد نے رپورٹ پیش کی۔

۲۵ جنوری: ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام قطعات خوشنویسی کا افتتاح نواب بسالت جاہ نے کیا۔ اس موقع پر مسعود سلام خوش نویس، قمر نظامی، عارف الدین، رضی الدین اقبال، شفاعت اللہ اور قاضی شہاب ثاقب کو ان کے قطعات پر انعامات دئے گئے۔ جناب خواجہ محمد احمد سکریٹری انسٹی ٹیوٹ نے شکریہ ادا کیا۔ صدر انسٹی ٹیوٹ ڈاکٹر میر اکبر علی خاں نے خوش نویسی کے فن کی افادیت پر روشنی ڈالی۔

۲۶ جنوری: ادارۂ ادبیات اردو کی اپنی عمارت ایوان اردو پر یوم جمہوریہ کے موقع پر قومی پرچم لہرایا گیا۔ اسی شام ریاستی محکمہ ثقافتی و تعلقات عامہ کی طرف سے شہرۂ موسیقار شکیلہ بانو بھوپالی کی قوالی کا اہتمام کیا گیا۔ چیف منسٹر ٹی انجیا کے علاوہ ہزارہا شائقین قوالی نے اس پروگرام کو اشتیاق سے سنا۔

۲۷ جنوری: کل ہند صنعتی نمائش کی طرف سے نمائش کلب میں محفل مشاعرہ مسٹر نریندر لوتھر کی صدارت میں آراستہ ہوئی اوج یعقوبی، شاذ تمکنت، کنول پرشاد کنول، امیر احمد خسرو، علی احمد جلیلی، خیرات ندیم، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر غیاث صدیقی، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، رحمٰن جامی، علی الدین نوید، جگجیون لال استھانہ سحر اور صبا نے کلام سنایا۔

۳۰ جنوری: حلقۂ ارباب ذوق (نظامس اردو لائبریری) کے ماہانہ ادبی اجلاس میں ڈاکٹر مجاور حسین رضوی ریڈر شعبہ اردو مرکزی حیدرآباد یونیورسٹی نے ممتاز محقق اور نقاد ڈاکٹر شام لال کالرا عابد پشاوری کی تصانیف "انشاء کے لطیف و ظریف اور نقطے و شوشے" پر سیر حاصل تبصرہ سنایا۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ جناب محمد منظور احمد معتمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۳۱ جنوری: معتمد مجلس کے ماہانہ ادبی اجلاس جناب خلیل احمد تسنیم سیمابی ایڈیٹر ماہنامہ "فاران" کراچی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ مظفر عالم صاحبہ نے اپنے والد قاضی عبدالغفار کی حیدرآباد سے وابستگیوں پر دلچسپ مضمون اور جناب صادق نقوی نے تاریخ فہمی کے مسائل پر مقالہ سنایا۔ آخر میں شعراء صاحبان اور صدر اجلاس نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد ادبی مجلس نے شکریہ ادا کیا۔

○ جناب سید ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) معتمد اعزازی ادارۂ ادبیات اردو کو ریاستی حکومت نے سکنڈ سکریٹری کے عہدہ پر ترقی دی ہے اور اگریکلچرل پروڈکشن کمشنر مقرر کیا ہے۔ موصوف چیرمین کمیشن [illegible] فیڈریشن کے فرائض بھی حسب انجام دیں گے۔ جناب اختر کا شمار جامعہ عثمانیہ کے قابل فخر سپوتوں میں ہوتا ہے وہ اردو شعر و ادب پر دانشورانہ عبور رکھتے ہیں اور ادارہ کی ترقی میں ان دنوں اہم حصہ ادا کر رہے ہیں۔ عالی سرکاری اور علمی و ادبی حلقوں میں جناب اختر کے سکنڈ سکریٹری مقرر کئے جانے کا عمومی خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔

سب رس کی توسیع و اشاعت میں حصہ لیکر اپنے ادبی ذوق کا ثبوت دیجئے

JANUARY—FEBRUARY 1982

R. N. 1092
Regd H HD.

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500004. (A.

اسلوب اور انتقاد

گولڈن جوبلی تقاریب ادارۂ ادبیاتِ اردو

مارچ ۸۲ء تا فروری ۸۳ء

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

جلد (۴۳) مارچ ۱۹۸۲ء شمارہ (۳)

مدیر اعزازی : ڈاکٹر مغنی تبسم

معاون مدیر : وقار خلیل

قیمت فی پرچہ: ایک روپیہ پچھتر پیسے

ادارۂ ادبیاتِ اردو ، پنجہ گٹہ روڈ ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

زرِ سالانہ	بیرونی ملکوں سے		
		ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
۲۰ روپے	مشرقِ وسطیٰ	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
کتب خانوں سے !	امریکہ	۱۶ ڈالر	۶ ڈالر
۲۵ روپے	پاکستان، برما، سیلون	۸ ڈالر	۳½ ڈالر
بذریعہ رجسٹری ! ۴۵ روپے	انگلستان	۷ پونڈ	۳ پونڈ

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان۔ حیدرآباد ۲

ترتیب

پروگرام

افتتاحی اجلاس، گولڈن جوبلی تقاریب، ادارۂ ادبیات اردو

مقام: گنبد محمد قلی قطب شاہ، بانی حیدرآباد، گولکنڈہ

۱۳ مارچ ۱۹۸۲ء ۵ ساعت شام

۵ افتتاح: بدست: عالیجناب محمد ہدایت اللہ صاحب
نائب صدر جمہوریہ ہند

۵ صدارت: عالی جناب بی۔ وینکٹ رام صاحب چیف منسٹر آندھرا پردیش

استقبال، تعارف، گل پوشی

پروفیسر سید علی اکبر صاحب، صدر ادارۂ ادبیات اردو

۵-۱۵ مناجات قلی قطب شاہ:　ڈاکٹر و بیگم رضی الدین

۵-۲۰ تعارف ادارۂ ادبیات اردو: جناب سید ہاشم علی اختر صاحب
معتمد اعزازی ادارہ

۵-۲۵ خیر مقدمی تقریر: جناب میر اکبر علی خاں صاحب
صدر گولڈن جوبلی تقاریب کمیٹی

۵-۳۰ تقریر: جناب خواجہ حمید الدین شاہد
صدر ادارۂ ادبیات اردو (پاکستان)

۵-۳۵ افتتاحی تقریر: عالیجناب محمد ہدایت اللہ صاحب
نائب صدر جمہوریہ۔

۵-۵۰ صدارتی تقریر: عالیجناب بھونم وینکٹ رام صاحب
چیف منسٹر آندھرا پردیش۔

۵-۵۵ قوالی: جناب عزیز احمد خاں وارثی

۶-۱۰ شکریہ: جناب رتن راج سکسینہ صاحب۔ شریک معتمد ادارہ

ڈاکٹر مغنی تبسم

ادارۂ ادبیاتِ اردو: ایک تعارف

"ادارۂ ادبیاتِ اردو" برصغیر میں اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ ہے جس کی سرگرمیاں اردو زبان و ادب کے کثیر پہلوؤں کو اپنے دائرے میں سمیٹتی ہیں اور جو گزشتہ پچاس برس سے اردو کی توسیع و اشاعت اور ترقی کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔

حیدرآباد میں اردو ذریعۂ تعلیم کی یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد بہت سے نوجوان اردو کے ذریعہ مختلف علوم میں فارغ التحصیل ہو کر نکلنے لگے۔ اردو کے محقق اور نقاد، جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان نوجوانوں کی صلاحیتوں سے اردو زبان و ادب کی ہمہ جہتی ترقی کے سلسلے میں مفید کام لیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ان کے سامنے کوئی لائحۂ عمل ہو اور کوئی ایسا مرکز ہو جہاں وہ اکٹھے ہو کر کام کر سکیں۔ ڈاکٹر زورؔ کے چند مخلص رفیقوں پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر عبدالقادر صدیقی اور مولوی نصیر الدین ہاشمی نے دستِ تعاون بڑھایا اور ۱۹۳۱ء میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کا قیام عمل میں آیا۔

ادارے کے حسبِ ذیل اغراض و مقاصد قرار دیے گئے۔

۱۔ اردو زبان اور ادب کی توسیع و اشاعت۔

۲۔ سرزمینِ دکن میں اردو زبان اور ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنا اور تصنیف و تالیف میں رہبری اور مدد کرنا۔

۳۔ عوام میں اردو کی تعلیم اور مطالعے کا شوق پیدا کرنا اور اس کے لیے ضروری وسائل اختیار کرنا۔

۴۔ ملک کے نوجوانوں میں انشاپردازی اور شاعری کا ذوق پیدا کرنا اور تصنیف و تالیف میں رہبری اور مدد کرنا۔

۵۔ اردو کو مختلف علوم و فنون سے روشناس کرنا۔

۶۔ تاریخِ دکن کی خدمت اور ملک کے تاریخی اور ادبی آثار کی حفاظت۔

۷۔ ایک ایسا مکمل کتب خانہ قائم کرنا جس میں اردو کی بالعموم اور خاص طور پر دکن کی تمام تحریریں اور آثار محفوظ ہو سکیں اور جس کا ایک حصہ اناث کے لیے وقف رہے گا۔ ریاست حیدرآباد کے ولی عہد نواب اعظم جاہ بہادر نے اس ادارہ کا سرپرستِ اعلیٰ بننا منظور فرمایا۔ دیگر سرپرستوں میں سر اکبر حیدری، نواب سالار جنگ، نواب معین الدولہ اور راجہ شام راج راجونت بہادر شامل تھے۔

ادارے کی ایک مجلسِ انتظامی تشکیل دی گئی

جو حسبِ ذیل عہدہ داروں اور اراکین پر مشتمل تھی۔

مجلس انتظامی

صدر: نواب مہدی یار جنگ بہادر (معین امیر جامعہ، صدر المہام تعلیمات و فینانس)

نائب صدر: مولوی لیاقت اللہ خاں معتمد فینانس

اراکین: مولوی سید اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج۔

مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری معتمد باب حکومت۔

مولوی سید علی اکبر صاحب نائب ناظم تعلیمات۔

مولوی عبد المجید صاحب صدیقی پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

مولوی عبد القادر صاحب سروری پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ۔

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی مددگار ناظم رجسٹریشن۔

مولوی عبد القادر صاحب صدیقی پروفیسر دینیات جامعہ عثمانیہ۔

معتمد: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ۔

سلسلۂ مقاصد کے حصول کے لیے ادارے کے کاموں کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہر شعبے کے لیے ایک علیحدہ کمیٹی قائم کی گئی جس کا ایک معتمد یا داعی مقرر کیا گیا۔ ان شعبوں کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ شعبۂ زبان: اس کا مقصد اردو زبان کے عام و خاص مسائل پر غور کرنا اور ایسی تجاویز پیش کرنا اور انھیں روبہ عمل لانا جن سے اردو بولنے والوں کی ادبی، علمی اور فنی ضروریات کی بہتر طور پر تکمیل ہو سکے۔ اس شعبے نے دفتری زبان کی اصلاح، اردو زبان کو جدید ضرورتوں سے ہم آہنگ بنانے اور تحریری زبان کا ایک ہندستان گیر معیار قائم کرنے کے سلسلے میں اہم اقدامات کیے۔ اس شعبے کے پہلے معتمد مولوی ضیاء الدین انصاری تھے۔

۲۔ شعبۂ تنقید: اردو زبان میں تنقیدی ادب کی کمی کو پورا کرنے اور متوازن اور صحت مند تنقید کو رواج دینے اردو تنقید نگاری کے معیار کو بلند کرنے کی غرض سے یہ شعبہ تشکیل دیا گیا۔ ادبی جلسوں کے انعقاد، تنقیدی کتب کی اشاعت اور ادارے کے ترجمان ماہنامہ سب رس میں کتابوں پر تنقیدی تبصروں اور نئی مطبوعات کے تعارف کے ذریعے اس شعبے نے قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے شعبۂ تنقید کے پہلے معتمد اردو کے مشہور نقاد اور محقق... پروفیسر عبد القادر سروری تھے۔

۳۔ شعبۂ تالیف و ترجمہ: یہ شعبہ ایک اعتبار سے جامعہ عثمانیہ کے دار الترجمہ کا تتمہ ہے۔ دار الترجمے میں زیادہ تر جامعہ کے طلبا کے استفادے کے لیے علمی اور فنی کتابیں ترجمہ کروائی جاتی تھیں۔ اس شعبے کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کے بلند پایہ مفکروں، ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف اور شاہکار تخلیقات کو اردو میں منتقل کیا جائے تاکہ عام اردو جاننے والے ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ علاوہ ازیں علوم و فنون اور سماجی زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیتوں کے حالات اور کارناموں پر کتابیں لکھوا کر شائع کرنا بھی اس شعبے کے مقاصد میں شامل ہے۔

سب سے پہلے جناب ظہیرالدین صاحب آئی اے یس نے اس شعبے کی معتمدی کی ذمہ داری سنبھالی اور کئی علما اس شعبے سے منسلک رہے۔

۴۔ **شعبۂ تاریخ دکن** اس شعبے کے قیام کا مقصد تاریخ دکن پر تحقیقی کام کروانا اور دکن کے تاریخی آثار کو محفوظ کرنا ہے تاکہ دکنی تہذیب و تمدن کی شان دار روایات سے نئی نسلیں واقف ہوسکیں۔ اس شعبے کے تحت کئی کتابیں لکھوائی گئیں۔ اس کے علاوہ تاریخی اور تمدنی موضوعات پر علمی مقالے تحریر کروا کے ماہنامہ سب رس میں شائع کئے گئے۔ دکن کے کئی تاریخی آثار کی تلاش و تحقیق کی گئی اور محکمہ آثار قدیمہ کو توجہ دلا کر انھیں محفوظ کروایا گیا۔ اس شعبے کے پہلے معتمد تاریخ دکن کے ماہر پروفیسر عبدالمجید صدیقی تھے۔

۵۔ **شعبۂ شعرا و مصنفین** دکن کے بے شمار شاعروں اور مصنفوں کے کارنامے صدیوں سے گوشۂ گم نامی میں پڑے تھے۔ اس نادر ذخیرے کو تلاش کر کے منظر عام پر لانا نہایت اہم قومی اور ادبی کام تھا جس کا بیڑا ادارے نے اٹھایا۔ اس نے کئی شاعروں اور مصنفوں کی کتابیں ان کے انتخاب اور تذکرے شائع کئے۔ قلمی کتابوں کو تلاش کر کے ادارے کے کتب خانے میں محفوظ کیا گیا اور ان کی وضاحتی فہرستیں شائع کی گئیں۔ اس کے علاوہ دکن کے بے شمار قدیم و جدید مطبوعات کو بھی تلاش کر کے ادارے کے کتب خانے میں یک جا کیا گیا۔ قدیم شعرائے دکن کی قبور اور آثار کے تحفظ کا کام بھی یہ شعبہ انجام دیتا رہا ہے۔ اردو کے مشہور مصنف پروفیسر سید محمد اس شعبے کے پہلے معتمد تھے۔

۶۔ **شعبۂ سائنس** روزمرہ زندگی میں سائنس کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیش نظر اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ آسان اور عام فہم زبان میں سائنسی موضوعات پر کتابیں لکھوائی جائیں۔ چناں چہ دکن کے مشہور سائنس داں ڈاکٹر قاضی سید معین الدین کی سرکردگی میں ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس شعبے نے کئی معلوماتی کتابیں مرتب کروا کر شائع کیں۔

۷۔ **شعبۂ نسواں** عصری زندگی کے اس تقاضے کے احساس کے ساتھ کہ خواتین کو مردوں کے دوش بدوش کام کرنے اور اپنی بہترین صلاحیتوں سے ملک و قوم کو مستفید کرنے کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں ایک شعبۂ نسواں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ محترمہ سکینہ بیگم متا نے معتمدی کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس شعبے نے جہاں تعلیم یافتہ خواتین کو علمی ادبی کاموں کی طرف راغب کیا وہیں طبقۂ نسواں میں علم و ادب کا ذوق پیدا کرنے کے سلسلے میں مختلف اقدامات کئے۔ خواتین کے لیے ایک کتب خانے اور دارالمطالعے کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ایسے جلسے منعقد کیے گئے جن میں خواتین علمی مضامین اور ادبی تخلیقات پیش کرتی تھیں۔

۸۔ **شعبۂ اطفال** ۹۔ **شعبۂ طلبہ** اردو زبان میں بچوں کے ادب کی کمی کے پیش نظر ادارے نے شعبۂ اطفال قائم کیا جس کی پہلی معتمد بیگم زین یار جنگ تھیں۔ اس شعبے نے بچوں کے لیے کئی دل چسپ اور مفید کتابیں لکھوا کر رنگین اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع کیں۔ جناب معین الدین انصاری کو معتمد مقرر کر کے

ایک شعبۂ طلبہ قائم کیا گیا۔ اس شعبے نے طلبہ کے لیے خصوصی جلسے منعقد کیے۔ 'بچوں کا سب رس' نام سے ایک رسالہ جاری کیا گیا اور کم عمر طلبہ کی تحریری اور تقریری صلاحیتوں کو ترقی دینا اور ان میں باہمی مراسلت کے ذریعے دوستی پیدا کرنے اور ان کے محبوب مشغلوں کی تربیت کے لیے سب رس برادری کے نام سے ایک انجمن بھی قائم کی گئی۔

۱۰۔ شعبۂ امتحانات ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں بہت سے نوجوانوں کو اپنی زبان و ادب اور تہذیب سے کما حقہٗ واقف ہونے کا موقع نہیں ملتا جس کی وجہ سے ان کی شخصیت ادھوری رہ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں گھریلو خواتین اور ناخواندہ بالغوں کو اس قابل بنانے کی غرض سے کہ وہ اردو لکھنا پڑھنا سیکھ کر اپنے طور پر کتابوں کا مطالعہ کرکے اپنی علمی استعداد کو بڑھا سکیں ادارے نے مختلف مدارج پر مشتمل ایک نصابِ تعلیم ترتیب دیا اور ریاست کے طول و عرض میں اس کے امتحانات کے مراکز قائم کیے۔ ان امتحانوں کے انعقاد کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دوسری زبان والوں کو اردو سیکھنے پر مائل کیا جائے۔ ادارے کے امتحانات اردو عالم اور اردو فاضل حکومت اور یونیورسٹی کے مسلمہ ہیں۔ ان امتحانوں کی وجہ سے ناخواندہ اور کم خواندہ افراد کے لیے نہ صرف اعلیٰ تعلیم کا راستہ نکل آیا ہے بلکہ ان کے لیے ملازمتوں اور روزگار کے دروازے بھی کھل گئے ہیں۔ دوسری طرف یہ امتحانات تعلیمِ بالغان کے قومی منصوبے کی تکمیل میں بھی اہم حصہ ادا کر رہے ہیں۔

۱۱۔ کتب خانہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے قیام کا ایک اہم مقصد اور اس کے دوسرے مقاصد کی تکمیل کا ایک اہم ذریعہ اس کا عظیم الشان کتب خانہ ہے جس میں مطبوعہ کتب اور رسائل کے علاوہ قلمی کتابوں کا گراں قدر سرمایہ موجود ہے۔ اس کتب خانے کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں بلکہ بیرونِ ملک سے بھی علما اور محققین اس کتب خانے سے استفادہ کی غرض سے حیدرآباد آتے ہیں۔ ادارے کے کتب خانے میں تقریباً ستائیس ہزار مطبوعہ کتابیں اور پانچ ہزار مخطوطات ہیں۔ اس کتب خانے میں کئی قدیم اور جدید رسائل کی مکمل فائلیں موجود ہیں۔ جن سے محققین اور ادب کے طالبِ علم مستفید ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں تاریخی نوشتوں، مشاہیر کی تحریروں اور قدیم فرامین کا نایاب ذخیرہ اس کتب خانے کی اہمیت کو دوبالا کرتا ہے۔ کتب خانے سے متعلق ایک دارالمطالعہ بھی ہے جہاں اردو میں شائع ہونے والے تقریباً دو سو اہم اخبارات اور رسائل موجود رہتے ہیں۔ نواب مرزا سیف علی خاں کتب خانے کے پہلے معتمد تھے۔

۱۲۔ ماہنامہ سب رس جنوری ۱۹۳۸ء میں ادارے کے ترجمان رسالے ماہنامہ سب رس کا اجرا عمل میں آیا۔ اس رسالے کی نمایاں خصوصیت اس کا علمی ادبی تنوع ہے۔ آغاز ہی سے یہ خیال پیشِ نظر رہا کہ اس میں 'سب کے لیے سب کچھ ہو'۔ چنانچہ سب رس میں علمی اور تحقیقی مقالوں کے ساتھ تخلیقی ادب کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عام فہم زبان میں معلوماتی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ سب رس کے اجرا کا ایک مقصد نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی رہا ہے۔ اردو کے کئی ادیبوں اور شاعروں کی ابتدائی تخلیقات

سب رس میں شائع ہوئیں آگے چل کر انھوں نے ادبی دنیا میں اہمیت اور شہرت حاصل کی۔

۱۳۔ شعبۂ خوش نویسی ادارے نے ابتدا ہی سے خوش نویسی اور خطاطی کے فن کو فروغ دینے کی طرف توجہ کی۔ خوشنویسی کی تربیت کا انتظام کیا اور امتحانات منعقد کئے۔ ترقی اردو بورڈ کے تعاون سے ۱۹۷۴ء میں ایوانِ اردو میں خوش نویسی کا مرکز قائم کیا گیا جہاں ماہر خطاط طلبہ اور طالبات کو خوش نویسی کی تربیت دیتے ہیں۔

۱۴۔ یوم محمد قلی قطب شاہ اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر اور شہر حیدرآباد کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یاد منانے کے لیے ادارۂ ادبیاتِ اردو نے ۱۹۵۸ء سے یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا آغاز کیا۔ ہر سال محمد قلی قطب شاہ کے گنبد پر بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ اردو اور تلگو زبانوں میں ادبی اجلاس منعقد کئے جاتے ہیں جن میں علما اور دانشور محمد قلی قطب شاہ اور قطب شاہی عہد کے علمی اور ادبی کارناموں اور دکنی تہذیب و تمدن پر مقالے پیش کرتے ہیں۔ اس موقعہ پر ایک مشاعرے کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ جناب رمن راج سکسینہ (ایڈوکیٹ) نے یوم محمد قلی کو کامیاب سالانہ تقریب بنا دیا ہے۔ موصوف اس تقریب کے امور کی بہ حیثیت معتمد نگرانی کرتے رہے ہیں۔

۱۵۔ مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن ۱۹۶۱ء میں مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن کا قیام اس مقصد کے تحت عمل میں آیا تھا کہ تاریخ دکن اور بالخصوص قطب شاہی عہد سے متعلق اہم نادر مخطوطات کے علاوہ تاریخی اور تحقیقی مواد بھی شائع کیا جائے تاکہ علمی طبقہ دکن کے تاریخی، تمدنی اور ثقافتی سرمایہ سے روشناس ہو۔ اس سلسلے میں ادارہ نے دو کتابیں شائع کی ہیں جن میں ایک فارسی تاریخ "حدیقۃ السلاطین" مؤلفہ نظام الدین احمد شیرازی ہے جسے مولوی سید علی بلگرامی مرحوم نے مرتب کیا تھا اور دوسری کتاب "قطب شاہیوں کی خدمات اور آندھرا تمدن" مرتبہ ڈاکٹر رام راجو ہے جو تلگو زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ آندھرا پردیش کے عوام کو جن کی مادری زبان تلگو ہے قطب شاہی سلاطین کی علمی و ثقافتی خدمات سے واقف کرایا جائے۔ جناب میر سراج الدین علی خاں اس شعبہ کے معتمد رہے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی اپنی کوئی عمارت نہیں تھی۔ ڈاکٹر زورؔ کے مساعی سے ۱۹۶۰ء میں ایوانِ اردو کی تعمیر تکمیل کو پہنچی جس میں ادارے کے دفتر، کتب خانے، دارالمطالعے اور میوزیم کے لیے گنجائش مہیا کرنے کے علاوہ جلسوں کے انعقاد کے لیے ایک خوب صورت ہال اور ان محققین اور طلبہ کے قیام کے لیے جو بیرون ریاست سے حیدرآباد آتے ہیں ایک مہمان خانہ بھی تعمیر کیا گیا ہے۔ اب یہ عمارت کتب خانے کی توسیع اور ادارے کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی ہے۔

یہ ادارہ اردو دوستوں کے عطیوں اور چندوں سے قائم کیا گیا تھا۔ آگے چل کر اسے ریاستی حکومت کی سرپرستی حاصل ہوئی لیکن حکومتی گرانٹ میں برسوں سے کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے بعض شعبے معطل ہیں۔ ضرورت ہے کہ مرکزی اور ریاستی حکومتیں جنوبی ہند کے اس عظیم ادبی اور تمدنی مرکز کو فراغ

(باقی ص۴۳ پر)

[illegible] آبادی

یہ تحفہ ہے لاجواب از سب رس لو مرغوبِ دل ہر کس و ناکس لے لو
سب کا لینا تو امرِ ناممکن ہے سب میں بہتر یہ ہے کہ سب رس لے لو

تاثرات

ڈاکٹر ذاکر حسین (صدرِ جمہوریۂ ہند)

ادارۂ ادبیاتِ اردو میں آج حاضری کا موقع ملا یہاں کا کام اور اہتمام دیکھ کر جی خوش ہو گیا اور اس خوشی کے ساتھ ساتھ زورؔ مرحوم کی یاد بھی برابر آتی رہی وہ بڑا کام کر گئے ہیں لیکن ہر بڑے کام کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ بعد میں آنے والے اسے اور بڑا بنائیں۔ حال پر ماضی کا یہ حق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حق پوری طرح ادا کیا جائے گا۔ (۴ ستمبر ۱۹۶۶ء)

مولانا عبدالماجد دریابادی۔

زورؔ مرحوم کی اردو دوستی، خوش ذوقی اور تندہی سے واقف تھا لیکن ان کے قائم کئے ہوئے ایوانِ اردو کو دیکھ کر تو آنکھیں کھل گئیں اور جتنا وقت اس وسیع و شاندار عمارت کے اندر گزرا یہ یاد ہی نہ آنے پایا کہ اردو بھی اس وقت کوئی مظلوم زبان اور ہر طرح کے جور و ستم کا شکار ہے۔

اور تو اور اس طلسم زار میں قدم رکھ کر یہ بھی پتہ چلنے نہیں پاتا کہ اردو دنیا کی کسی بھی متمدن و متمول زبان سے ہیٹی یا کسی سے کچھ پیچھے ہے۔ اس چہار دیواری کے اندر اردو کلچر کی ایک پوری دنیا آباد ہے۔ "اللہ" کیا بابائے اردو کا لقب مولوی ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے لیے مختص ہو چکا ورنہ زورؔ مرحوم بھی اپنے کرامات کے لحاظ سے اس لقب کے کچھ کم مستحق نہیں۔ ادارہ کی وسعت اور بوقلمونی کا اندازہ دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے سننے ہی سے نہیں ؎

سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

(۵ راکتوبر ۱۹۶۳ء)

پروفیسر رشید احمد صدیقی

مجھے کم و بیش ۲۰ سال بعد ادارۂ ادبیاتِ اردو دیکھنے اور ارباب ادارہ سے ان کا شغف یاد آیا۔ مرحوم کے اس کارنامے کو دیکھ کر ان کے غم نے ان کے

لیے احترام وعقیدت کی صورت اختیار کرلی۔ اچھے شخص سے اچھے کام اور اچھے کام سے اچھے آدمی کی قدر وقیمت کتنی بڑھ جاتی ہے اس کا اندازہ پروفیسر زورؔ مرحوم اور ادارۂ ادبیات اردو سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ ایک شخص جو نہ دولت مند تھا نہ صاحبِ اقتدار اس نے اپنے محدود وسائل سے کس طرح اتنا قیمتی ذخیرہ فراہم کرلیا۔ روپیہ اکٹھا کرلینا آسان ہے علمی متاع کا جمع کرنا سہل نہیں ہے۔

موجودہ کارکنوں کے لیے یہ بڑی آزمائش کا وقت ہے دعا کرتا ہوں کہ ان کی دشواریاں آسان ہوں اور ایسے اسباب پیدا ہوں اور ہوتے رہیں جن سے اس ادارہ کی نیک نامی اور افادیت بڑھتی رہے۔

(۱۰ر اکتوبر ۱۹۶۴ء)

پروفیسر سید احتشام حسین

کیسی محرومی ہے کہ ادارۂ ادبیاتِ اردو، ایوانِ اردو اور ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو ڈاکٹر زورؔ مرحوم کے ساتھ دیکھنے کا موقع نصیب نہیں ہوا اور آج جب یہاں آیا تو پہلا احساس یہی تھا لیکن محمد عبدالمجید صدیقی صاحب، محمد اکبرالدین صدیقی صاحب اور دوسرے دوستوں کے ساتھ ان اداروں کو دیکھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ ڈاکٹر زورؔ مرے نہیں ہیں، وہ ہر جگہ ساتھ ساتھ ہیں، مخطوطات دکھا رہے ہیں، تصویروں اور کتبوں کی اہمیت بتا رہے ہیں اور مستقبل کے منصوبوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے رفقاء کو ساتھ لے کر جتنا کام اردو کی بقا اور ترویج کے لیے کیا ہے وہ انھیں زندہ رکھے گا۔ یہ جگہ حیدرآباد کی تہذیبی زندگی کا ایک مرکز بن گئی ہے اور اپنے اندر ایسا ذخیرہ رکھتی ہے جس کو دیکھ کر قدیم اور جدید حیدرآباد کے نقوش ذہن میں ابھر آتے ہیں۔ کاش حالات ایسی کروٹ لیں کہ یہ تہذیبی ادارے صرف زندہ اور باقی نہ رہیں بلکہ ترقی کرسکیں۔ (۱۰ر فروری ۱۹۶۵ء)

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

ادارہ ادبیاتِ اردو کا کتب خانہ اور ذخیرۂ نوادر دیکھ کر روح بالیدہ ہوگئی۔ ان چیزوں کے جمع کرنے میں کتنی ریاضت اور محنت کرنا پڑی ہوگی اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جن کو قومی کاموں سے واسطہ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو فروغ بخشے، ان نوادر کو آفاتِ ارضی وسماوی سے محفوظ رکھے اور ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی قبر کو نور سے بھر دے۔ (۲۹ر جون ۱۹۶۵ء)

جناب سکندر علی وجد

آج میں نے ایوانِ اردو میں اس میخانۂ ادب کے زندہ جاوید ساقی حضرت زورؔ مرحوم کی روح کی یہی صدا سنی ہے ع کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

(۱۹ر اپریل ۱۹۶۵ء)

حضرت جوش ملیح آبادی (کراچی)

آج جب کہ اردو کا بڑا غرق کردینے کی خاطر، دنیا کے ساتوں سمندر حملہ آور ہوچکے ہیں، "ادارۂ ادبیاتِ اردو" ایک سنگین بند کی حیثیت سے ان کا مقابلہ کر رہا ہے اور زورؔ صاحب کی قوتِ بازو ناخدائی کر رہی ہے۔

(۱۴ر جنوری ۱۹۶۱ء)

حضرت تلوک چند محروم (دہلی)

مجھے کامل یقین ہے کہ ادارۂ ادبیاتِ اردو زورؔ صاحب کی قیادت میں اردو کو اپنا مقام دلانے میں کامیاب ہوگا، خدا کرے ایسا ہی ہو۔

بناکر زورؔ نے ایوانِ اردو ۔ بڑھادی ملک بھر میں شان اردو

(۱۵ر جنوری ۱۹۶۱ء)

جناب شان الحق حقی

ادارۂ ادبیات اردو اور اس کے بانی جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ سے غائبانہ تعارف کی بنا پر ان کی جو قدر و منزلت میرے دل میں تھی وہ اب گہری ارادت اور ایک ایسے تعلق میں متبدل ہوگئی ہے جس میں عشق کے آثار محسوس ہوتے ہیں۔ میں ان کی علمیت کا ہمیشہ سے معترف تھا، لیکن ان کے خلوص اور حسنِ عمل کے ان کرشمات کو آنکھ سے دیکھا تو ان کی شخصیت کی زیادہ مکمل تصویر نظر کے سامنے آئی۔ جو میری نظر میں بڑی محبوب، بڑی حسین اور قابلِ پرستش ہے۔

میں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں، دکن میں "ایوانِ اردو" کا وجود اور خدمتِ اردو کی وہ روایت جو اس ادارے کے ساتھ مخصوص ہوگئی ہے، اردو کی بقا کی ضامن ہے۔

(۱۹ر جنوری ۱۹۶۲ء)

مولانا ابوالکلام آزاد (وزیر تعلیمات حکومت ہند)

مجھے یہ معلوم کرکے نہایت خوشی ہوئی کہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد نے اپنی زندگی کے پچیس برس پورے کرلیے ہیں اور وہ اپنی سرگرمیوں کے ایک دوسرے نئے دور میں قدم رکھ رہا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ وہ اپنی آئندہ سرگرمیوں میں زیادہ سے زیادہ کامیاب ہو۔ (۱۹۵۵ء)

علامہ سید سلیمان ندوی (مرحوم)

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن دس برس سے ادبیاتِ اردو کی خدمت میں معروف ہے اس مختصر سے وقت میں اس نے ستر کے قریب چھوٹی بڑی کتابیں ادب، تاریخ، تنقید، تذکرہ اور تعلیم وغیرہ مختلف عنوانوں پر شائع کی ہیں اور ساتھ ہی سب رس کے نام سے ایک مفید ادبی رسالہ اور دو اور رسالے نکال رہا ہے۔ ایک مختصر سا اردو کتب خانہ بھی فراہم ہوگیا ہے۔ اردو ادب کا ایک مرقع اور مختلف زبانوں میں زبانِ اردو کی ترقی و وسعت کے نقشے بھی اس نے بنائے ہیں۔ مجھے اس ادارے کو دو دفعہ دیکھنے کا موقع ملا اور دونوں دفعہ ادارے کے پرجوش نوجوان ارکان کے خدمات کا دل سے اعتراف کرنا پڑا۔

(۱۸ر جولائی ۱۹۳۸ء)

مولانا حسرت موہانی

میں نے حیدرآباد کے ادارۂ ادبیات اردو کا معائنہ کیا۔ اردو زبان و ادب کی ترقی اور توسیع کے متعلق جتنا کثیر مستقل اور قیمتی و مفید کام یہ ادارہ نہایت خاموشی سے کرچکا ہے اور کررہا ہے کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے غالباً اردو کا کوئی بہی خواہ ادارہ اس کے مماثل نہیں ہوسکتا۔ میں بانیٔ ادارہ کے خلوص، ہمت اور محنت و عمل سے بہت متاثر ہوا۔ اس خصوص میں جتنے مساعی میں نے ہندوستان میں دیکھے یہ ادارہ کئی حیثیتوں

سے ان پر مرجح ہے جس کا اندازہ ادارے کے تفصیلی معائنہ ہی سے ہو سکتا ہے۔

ایک معمولی خدمت یہ ہے کہ ادارے کی جانب سے ہر سال مختلف مدارج کے لحاظ سے نصابی تعلیم دی جاتی ہے اور اسناد دیے جاتے ہیں۔ صرف اسی چیز سے ملک میں اُردو کی ترقی اور وسعت کا جو ماحول پیدا ہو رہا ہے ظاہر ہے مجھے ان کوششوں کو دیکھ کر بہت مسرّت ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ حیدرآباد جو رفتہ رفتہ اردو کا آل انڈیا مرکز بن رہا ہے آگے چل کر اس کی بنیاد یہی ادارہ ثابت ہوگا۔ (۱۰ رمئی ۱۹۴۲ء)

(سر شیخ) عبدالقادر (لاہور)

اگر میں یہاں نہ آتا تو مجھے بڑا افسوس ہوتا۔ کام کرنے کے ایسے ہی طریقے سب کو یورپ سے سیکھنے چاہییں۔
(۱۲ راگست ۱۹۳۹ء)

سر محمد یعقوب عفی عنہٗ (مرحوم)

جامعہ عثمانیہ کے بعد میرے خیال میں دوسرا نمبر ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ہے جس کا میں نے ۹ رنومبر ۱۹۴۱ء کو معائنہ کیا۔ جو اہم علمی خدمات یہ ادارہ انجام دے رہا ہے وہ لائق صد ہزاران تحسین و آفرین ہے۔ کارکنانِ ادارہ کے صحیح علمی ذوق کا میرے دل پر گہرا اثر ہے اور میں زورؔ صاحب اور رفقائے کار کو تہِ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ حیدرآباد کا ادارۂ ادبیاتِ اردو اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرے اور اس کے مقاصد کی تکمیل سے نہ صرف دکن بلکہ تمام ہندوستان مستفیض اور فائز المرام ہو۔
(۲۱ رجنوری ۱۹۴۲ء)

قاضی عبدالغفار (مطبوعہ اخبار پیام ۱۹۴۲ء)

یوں تو حیدرآباد میں ادبی انجمنوں اور اداروں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن علمی اور تعمیری کام کرنے والے ایسے ادارے جن کے اراکین ادبی صحبتوں کی رنگینیوں سے گزر کر بھی کوئی نتیجہ خیز کام کرتے ہیں دو چار سے زیادہ نہیں ہے۔ ان میں سے ایک ادارۂ ادبیاتِ اُردو ہے جو بلحاظ اپنی کم عمری کے زیادہ مشہور نہ ہو لیکن بلحاظ اپنے کام کے ایک بہترین ادارہ ہے جو اس ملک میں اردو زبان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر رہا ہے اور اس خدمت کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خاموش خدمت ہے۔ پروپگنڈے کے نقارے اس کے ساتھ ساتھ نہیں ہیں اور نہ وقتاً فوقتاً کوئی بلند آہنگ شان دار مظاہرہ ہوتا ہے جو اس کو شہرت کی سند عطا کرتا رہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو خاموش کام کرنے والوں کی جماعت ہے جس نے اُردو زبان اور ادب کی تعمیر میں جو کچھ محنت کی ہے اس محنت کے نتائج ہماری نظر کے سامنے ہیں۔ اس ادارے کی مخلصانہ جدوجہد سے اُردو زبان کے جدید لٹریچر کا ایک بہت اچھا ذخیرہ جمع ہوتا جاتا ہے اور اس کے ذریعے سے چند نئے اہلِ قلم میدان میں آگئے ہیں۔

انجمنیں اور ادارے قائم کر لینا تو بہت آسان کام ہے خصوصاً حیدرآباد میں۔ لیکن صبر اور استقلال کے ساتھ تعمیری اور اصلاحی کام کرنا آسان نہیں۔ اس مشکل کو آسان وہی لوگ بنا سکتے ہیں جو اپنے مقاصد پر اعتماد کرتے ہیں اور اپنی قوتِ عمل کو پھولجھڑیاں چھوڑنے میں ضائع نہ کریں۔ ادارہ ادبیاتِ اُردو نے اپنے لیے جو پروگرام مرتب کیا وہ ماہرینِ فن کے وسیع تجربہ پر منحصر ہے اور ایسے اربابِ

پر منحصر ہے جن کے جذبۂ عمل پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

مولانا حامد حسن قادری

ادارۂ ادبیاتِ اردو کے حوصلہ اور ہمت کی تعریف نہیں ہوسکتی۔

گراں سمجھ کے جسے سب نے یہ کہا کہ نہیں
وہ بار دوش پہ میں نے اٹھالیا کہ نہیں

ادارۂ ادبیاتِ اردو سے خطاب

رہا محروم ساحل پر رہا ❊ وہ اترا پار جو دریا میں اترا
یہ میدانِ معارف طے ہو جب تک ❊ سمندِ کلک کو ہرگز نہ ٹھیرا
صدائے اذن درین میخانۂ علم ❊ بگردش آر ایں مینا دسے را
حماک اللہ عن شر النوائب ❊ جزاک اللہ فی الدارین خیرا

مولانا نیاز فتح پوری

گزشتہ دس سال کے اندر ادارۂ ادبیاتِ اردو کی یہ ساٹھویں تالیف ہے۔ جس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ ادارہ اس وقت تک کتنی ادبی خدمت انجام دے چکا ہے۔ اس مرتبہ حیدرآباد پہنچ کر میں نے خود اس ادارے کو دیکھا اور اس کے اہتمام و انصرام کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ ڈاکٹر زور اس ادارے کے روحِ رواں ہیں اور حیدرآباد کی جدید نسل میں جو ولولہ زبان اردو کی خدمت کا پایا جاتا ہے اس میں بڑا حصہ ڈاکٹر زور کی سعی و کاوش کا ہے۔ (مطبوعہ نگار لکھنو) اگست ۱۹۳۶ء

ڈاکٹر محمد دین تاثیر (مرحوم)

آپ لوگ ایک بہت بڑا کام کر رہے ہیں ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا آپ کی ہمت و صلاحیت میں ترقی دے۔ رابرٹ روڈ امرتسر ۱۴ ستمبر ۱۹۴۱ء

گولڈن جوبلی تقاریب ادارۂ ادبیاتِ اردو

اجلاس دوم

یوم محمد قلی قطب شاہ : بانی شہر حیدرآباد

مقام : گنبد محمد قلی قطب شاہ۔ گولکنڈہ

صدارت : عالیجناب سید مکرم شاہ صاحب صدر نشین قانون ساز کونسل

۶-۴۵ : غزل محمد قلی قطب شاہ ڈاکٹر رضیہ بیگم رضی الدین

۷-۰۰ : یوم قلی قطب شاہ تقریر جناب من راج سکسینہ صاحب معتمد یوم محمد قلی قطب شاہ

۷-۷ تقریر : جناب معظم حسین صاحب

۷-۱۵ نظم : جناب رحمٰن جامی صاحب

۷-۲۰ تقریر : جناب مصطفےٰ شروانی صاحب

۷-۳۰ غزل : ابوالحسن تاناشاہ ڈاکٹر رضیہ بیگم رضی الدین

۷-۳۵ تقریر : جناب ارجن راؤ صاحب اسپیشل افسر

۷-۴۰ نظم : جناب صادق نقوی صاحب

۷-۴۵ غزل : سراج اورنگ آبادی ڈاکٹر رضیہ بیگم رضی الدین

۷-۵۰ نظم : بھاگ متی جناب ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب

۷-۵۵ تقریر صدارت : عالیجناب سید مکرم شاہ صاحب صدر نشین قانون ساز کونسل۔

۸-۵ شکریہ : جناب منظور احمد صاحب، شریک معتمد گولڈن جوبلی تقاریب۔

۸-۷ قوالی : جناب عزیز احمد خاں وارثی

○

جناب من راج سکسینہ

ڈاکٹر یوسف سرمست

ڈاکٹر زور اور دکنی ادب کی تحقیق اور اشاعت

آج دکنی ادب کی تحقیق اور اشاعت کا چرچا اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس بات کی طرف خیال بہت کم جاتا ہے کہ اس کا آغاز کب سے ہوا اور کس نے کیا؟ اس کے ساتھ ساتھ دکنی ادب کی اشاعت کا کام بھی اب اس قدر بڑھ چکا ہے کہ اس طرف دھیان ہی نہیں جاتا ہے کہ اس کی اشاعت کا آغاز کب سے ہوا۔ اس بارے میں ابھی تحقیق بہت کم ہوئی ہے۔ اتنی بات تو سبھی جانتے ہیں کہ شمالی ہند والے اردو ادب کے اس قدیم ذخیرے سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم قرار دیا ہے۔ اسی لیے دکنی ادب کی تحقیق کے ایک اہم ماہر شمس اللہ قادری اس بارے میں لکھتے ہیں:

"شعرائے اردو کی تذکرہ نویسی بارھویں صدی ہجری کے اخیر ایام سے ہوئی اور اس وقت سے زمانۂ حال تک ستر اسّی تذکرے لکھے گئے ہیں لیکن ان سب کی ابتدا اس طرح سے ہوتی ہے جب ہندوستان کے دار السلطنت دہلی میں ریختہ گوئی کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے جو شعرا سرزمین دکن میں گزرے ہیں ان کے حالات نظر انداز کر دئے گئے ہیں۔ اس فروگذاشت کا یہ نتیجہ ہوا کہ قدیم شعرا کے حالات ناپید ہو گئے اور تاریخ اردو کا دور قدیم پردۂ اخفا میں مستور ہو گیا" [1]

یہاں دو ایک باتیں ایسی ہیں جن کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے پہلی بات تو یہ کہ اردو کے سب ہی تذکرے ایسے نہیں ہیں جن میں ریختہ گوئی کے آغاز کو دہلی سے وابستہ کیا گیا ہو۔ دکن میں جو تذکرے لکھے گئے ان میں ریختہ گوئی کا آغاز دکن ہی سے شروع کیا گیا۔ جیسے "گلشن گفتار" ۱۷۵۲ء کا مصنف حمید اورنگ آبادی اپنے تذکرے کو نصرتی کے ذکر سے شروع کرتا ہے دوسری بات یہ کہ خود شمالی ہند میں بھی تمام تذکرہ نگاروں نے ریختہ گوئی کے آغاز کو پائے تخت دہلی سے منسوب نہیں کیا ہے۔ قائم چاند پوری نے اپنے تذکرے "مخزن نکات" (۱۷۵۵ء) کو تین طبقات کے شعرا کے ذکر میں منقسم کیا ہے۔ طبقۂ اوّل میں اس نے ملّا نوری، عبد اللہ قطب شاہ، احمد گجراتی، سراج ولی وغیرہ جیسے دکنی شعرا کو شامل کیا ہے اور بقول مولوی عبد الحق "ان کا ذکر" "زیادہ اہتمام" سے کیا ہے۔[2] اسی طرح قدرت اللہ صدیقی شوق سنبھلی کے تذکرے "طبقات الشعرا" ۱۷۷۵ء میں کئی دکنی شاعر جیسے ملا نوری، سعدی دکنی، ولی، سراج، احمد گجراتی، ہاشمی وغیرہ طبقۂ اوّل کے شعرا میں شامل ہیں۔ یہ تذکرے چوں کہ ایک مدت تک مخطوطات کی شکل میں تھے اور تحقیق کا ذوق عام نہیں ہوا

---

[1] رسالہ [illegible] اشاعت [illegible]

[2] مقدمہ مخزن نکات از مولوی عبد الحق۔

تھا اس لیے ریختہ گوئی کا آغاز عام طور سے ولی سے منسوب رہا۔

جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے کہ دکنی ادب کی تحقیق اور اشاعت کے بارے میں بہت کم کام ہوا ہے۔ اس بارے میں سب سے اہم اور شاید پہلا مضمون زور صاحب ہی کا ملتا ہے۔ انھوں "قدیم اردو ادب پر تحقیقی کام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ وہ دکنی ادب کی تحقیق کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"اردو کے قدیم ادب پر تحقیقی کام کی ابتدا کا سہرا گارساں دتاسی کے سر ہے۔ وہ سوربون یونیورسٹی پیرس میں اردو کے استاد تھے۔ انھوں نے یہ کام ۱۸۲۵ء میں شروع کیا اور تقریباً پچاس سال تک وہ اس میں مصروف رہے۔ مگر دتاسی نے زیادہ تر فرانسیسی زبان میں لکھا تھا۔ اس لیے اہلِ اردو اس کی کوششوں سے ایک طویل عرصے تک واقف نہ ہو سکے۔ خود اردو زبان میں اس کے قدیم ادب پر تحقیقی تالیفات کا آغاز گارساں دتاسی کے کام سے ٹھیک ایک سو سال بعد بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کیا تھا۔ ان کا جو مضمون کلیات محمد قلی قطب شاہ سے متعلق ۱۹۲۲ء میں رسالہ اردو اورنگ آباد میں چھپا تھا، اس نے قدیم ادب پر کام کرنے کی اہمیت اردو دنیا پر واضح کر دی کیوں کر بابائے اردو کا وہ مضمون اردو ادب کی عمر میں تین سو سال کے اضافہ کا باعث ثابت ہوا"۔ [۱]

دتاسی نے دکنی ادب کی تحقیق اور اشاعت کا کام باقاعدہ طور پر شروع کیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے قدیم تذکرہ نگاروں نے خود دتاسی سے سو سال پہلے ان شعرا کی طرف توجہ کی تھی اور ان سے وہ واقف تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دتاسی نے زیادہ واضح اور پُرزور انداز میں ان کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔ البتہ دکنی مخطوطات کی اشاعت کا کام شاید سب سے پہلے اسی نے شروع کیا تھا۔ اس نے ولی کا دیوان ۱۸۳۳ء میں بڑی ہی تحقیق اور تدقیق کے بعد مرتب کیا ہے۔ ولی کے دیوان کی اشاعت کے ایک سال بعد دتاسی نے تحسین الدین کی مثنوی "کام روپ" کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ پھر اس کے ایک سال بعد اسے ایڈٹ کر کے اس نے اسے بھی شائع کر دیا۔ ڈاکٹر زور نے لکھا ہے :۔

"اس کام کی خوبی اور مقبولیت کا اس واقعہ سے اندازہ ہوگا کہ اس ترجمے کی اشاعت کے ایک سال کے اندر دتاسی اصل اردو کام روپ شائع کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے بعد بھی اس فرانسیسی محقق نے کئی قلمی نسخے جمع کئے تھے۔ یہ کتاب پیرس کے شاہی دارالطبع سے ۱۸۳۵ء میں چھپ کر نکلی"۔ [۲]

دتاسی سے پہلے کسی نے مخطوطات کو چھاپنے کا کام کیا ہے یا نہیں۔ اس تعلق سے یقین کے ساتھ ابھی کچھ کہنا ممکن نہیں البتہ دکنی زبان کو محفوظ کرنے کا کام شاید سب سے پہلے مدراس میں شروع ہوا کیوں کہ محمد ابراہیم بیجاپوری نے ۱۸۲۴ء میں انوار سہیلی کا ترجمہ کر کے شائع کیا۔ یہ ترجمہ فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس

---

[۱] ۔۔۔ قدیم نمبر ۱۹۵۹ء

[۲] گارساں دتاسی از ڈاکٹر زور ص ۱۵

کے لیے کیا گیا تھا۔ اس کالج نے بھی دکنی زبان اور ادب کی خدمت فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی طرح کی اس کے بعد بھی دکنی زبان اور ادب کی اشاعت کا کام مدراس میں ہوتا رہا ہے۔ اس بات کا ثبوت خود دتاسی کے مقالات سے ملتا ہے۔ دتاسی نے ۱۸۵۰ء سے ۱۸۷۳ء تک جو مقالات لکھے تھے۔ اس میں اس بات کا ذکر یوں کرتا ہے:۔

"ہندوستانی زبان کی دکھنی شاخ کے متعلق جس میں کثرت سے کتب شائع ہوتی ہیں۔۔۔۔ میجر۔ ایم۔ ڈبلیو کار بہادر M. W. نے مدراس میں بعض کتابوں کے شائع کرنے کا انتظام کیا ہے۔۔۔۔ (۱) قصہ رضوان شاہ زیر طبع (۲) نصرتی کی گلشن عشق اور (ابن نشاطی) کی پھول بن (۳) قصہ بی بی مریم بھی عنقریب شائع ہونے والی ہیں۔ ان سب کتابوں میں ٹھیٹ دکھنی الفاظ کی تشریح کی گئی ہے جو عام طور پر نہیں سمجھے جاتے۔ اس میں سے جو اوراق بطور نمونہ مجھے وصول ہوئے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک جو کام ہوا ہے اس کی سب ہندوستانی ادب کے حامیوں کو ہمت افزائی کرنی چاہیے"

دکنی ادب کی تحقیق کا آغاز بیسویں صدی میں کس نے کیا یہ بھی بحث طلب موضوع ہے۔ ڈاکٹر زور نے لکھا ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کا ۱۹۲۲ء والا مضمون اردو ادب میں تین سو سال کے اضافہ کا باعث ہوا حالاں کہ ... شمس اللہ قادری نے سب سے پہلے یہ کام شروع کیا کیوں کہ ان کا مضمون دکنی ادب کے تعلق سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب اردوئے قدیم ہی میں نہیں بلکہ "رسالہ تاج" کے "اردو قدیم نمبر" مطبوعہ ۱۹۲۴ء میں اس بات کا ذکر یوں کیا ہے:۔

"ہمارا یہ مضمون ۱۹۱۰ء میں "لسان العصر" لکھنو کے تین نمبروں میں شائع ہوا جس کے ۳۲ صفحات ہیں اور اس کی تقسیم موجود مضمون کی تقسیم سے کسی قدر متغائر ہے، پہلے حصے میں عادل شاہی شعراء کا ذکر ہے، اس کے تحت سعدی، نصرتی، ہاشمی اور سیوا کے حالات علی الترتیب ہیں اس کے بعد دوسرے حصے میں قطب شاہی شعرا کا تذکرہ لکھا ہے جس میں سب سے پہلے نوری، غواصی، نصرتی کا حال ہے۔ تیسرے حصے میں عاجز وجدی اور ولی کے حالات ہیں اور اس طرح اس میں دس شعرا کا تذکرہ آیا ہے"

شمس اللہ قادری کے اس مضمون کی جس طرح سے پذیرائی اس وقت کے علمی حلقے میں ہوئی اس کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:۔

"ہمارا یہ مضمون اگرچہ نہایت مختصر اور ناکمل تھا مگر پھر بھی علمی حلقے میں پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا گیا اور مولانا حالی و علامہ شبلی جیسے مشاہیر علماء نے اسے اپنی نوعیت کا پہلا مضمون قرار دیا۔ ان حوصلہ افزائیوں سے ہماری ہمت بلند ہوگئی اور ہم نے مضمون کو مکمل کرنے کا تہیہ کرلیا" [1]

اس طرح شمس اللہ قادری صاحب کا یہ مضمون مکمل شکل میں ۱۹۲۴ء میں اور پھر کتابی شکل میں شائع ہوا۔ دکنی ادب کی تحقیق کے سلسلے میں یہ مضمون بابائے اردو کے مضمون سے کوئی بارہ سال پہلے چھپا ہے۔ دکنی ادب کے شعرا کے

---

[1] رسالہ "تاج" "اردوئے قدیم نمبر" ۱۹۲۴ء

تعلق سے ایک اور اہم کام جس کا بہت کم ذکر ہوتا ہے وہ مولوی عبدالجبار صوفی ملکاپوری کا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "تذکرے شعرائے دکن" ۱۹۱۱ء میں شائع کی تھی یہ دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں کم و بیش ان سارے شعرا کا ذکر ہے جن کا تعلق ذرا سا بھی دکن سے رہا ہے۔ دکنی ادب کی تحقیق کے سلسلے میں مولوی نصیر الدین ہاشمی کی کتاب "دکن میں اردو" بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن دکنی ادب کی اشاعت کے تعلق سے اس صدی میں بابائے اردو نے بڑا ٹھوس اور اہم کام انجام دیا ہے۔ انھوں نے دکنی ادب کے گراں قدر کارناموں کو شائع کر کے منظرِ عام پر لانے کی اہم خدمت انجام دی۔

بابائے اردو عبدالحق نے دکنی مخطوطات کی اشاعت کا جو کام کیا ہے اس کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے لیکن ان کا یہ کام بہرحال انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ ڈاکٹر زورؔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس تحقیقی کام کو اجتماعی شکل دی اور اپنے کام کا آغاز کچھ اس انداز سے کیا کہ دکنی ادب کی تحقیق کے نئے دروازے کھل گئے۔ زورؔ صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے شعوری طور پر اس بات کی کوشش کی کہ ان کا تحقیقی کام آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو اور اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں کا قافلہ آگے سے آگے جا سکے۔

دکنی ادب کی تحقیق اور اس کی اشاعت میں زورؔ صاحب کا "اردو شہ پارے" یقیناً ایک ایسا شہ پارہ ہے جو دکنی ادب کی تاریخ تحقیق میں ایک منزل، ایک نئے موڑ اور ایک نئے امکان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو شہ پارے کو مرتب کرتے ہوئے زور صاحب نے مغرب کے نئے اندازِ تحقیق کو اس قدر خوب صورتی اور تکمیل کے ساتھ برتا ہے کہ یہ کتاب سائنٹفک اندازِ تحقیق کا ایک بہترین نمونہ بھی بن گئی ہے اور دکنی ادب کی تحقیق کے نئے امکانات کا اشاریہ بھی۔ زورؔ صاحب نے اس میں نہ صرف دکنی ادب کے عہد بہ عہد ارتقا کو پیش کیا ہے بلکہ اس کی مختلف فہرستیں اور ضمیمے اس انداز سے مرتب کئے ہیں کہ دکن کے موضوعات اور دکنی کے مصنفین کے کارنامے پوری طرح سامنے آجاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دکنی کے جتنے شاعر اور ادیب ان کی تحقیق کی وجہ سے دریافت ہوئے تھے ان کے ناموں اور کاموں کی دستاویزی تفصیل کچھ اس طرح سے دی ہے کہ آئندہ تحقیق کرنے والوں کو روشنی اور سہولت حاصل ہو سکے۔ انھوں نے یورپ کے ان سارے کتب خانوں اور ذخیروں کا حوالہ دیا ہے جہاں دکنی مخطوطات دریافت ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے سرکاری اور شخصی کتب خانوں کی تفصیل بھی دے دی جہاں دکنی مخطوطات محفوظ تھے۔ یوں زورؔ صاحب نے دکنی مخطوطات کے سارے چھپے ہوئے خزانوں کو سامنے لا کر صلائے عام کی کیفیت پیدا کر دی۔

زورؔ صاحب نے دکنی ادب کا کام جس والہانہ محبت اور لگن کے ساتھ انجام دیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ زورؔ صاحب ابتدا ہی سے یہ سمجھتے تھے کہ دکنی ادب کے ذخیرے کو منظرِ عام پر لانے کا کام کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ کام تو کوئی ادارہ ہی انجام دے سکتا ہے اسی لیے انھوں نے اردو شہ پارے ہی میں اپنے کام کرنے کا نقشہ مرتب کر لیا تھا، وہ اسے جماعتی اور اجتماعی طور پر آگے بڑھانا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے

وری صاحب اور سید محمد صاحب کو بھی اس کام میں
ں کرلیا تھا بعد میں بدقسمتی سے یہ تینوں متحدہ اور متفقہ
ہ کام انجام نہ دے سکے لیکن ان میں سے ہر ایک نے
ادی طور پر ہی نہیں اپنی ایک الگ جماعت بنا کر
عی طور پر اس کام کو آگے بڑھایا۔ زورؔ صاحب نے
ت طریقے اختیار کرکے دکنی ادب کی تحقیق و اشاعت
م اس طرح آگے بڑھایا کہ وہ مسلسل آگے ہی بڑھتا گیا۔
وں نے نواب سالار جنگ بہادر کو اس بات پر آمادہ
۔ وہ اپنے مخطوطات کے انمول سرمایہ کو شائع کرنے
دوبست کریں۔ مجلس دکنی مخطوطات کے قیام سے دکنی
طات کی اشاعت کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا اس
ذریعے دکنی ادب کی قیمتی اور جیسی کتابیں چھپ کر سامنے
ں وہ بجائے خود دکنی ادب کی اشاعت کی تاریخ کا
ب سے درخشندہ باب ہے۔ یہ کام بھی اجتماعی طور
را ہے۔ اس کام کی انجام دہی میں زورؔ صاحب کے
وہ سروری صاحب، سید محمد صاحب، عبدالمجید صدیقی
ب اور سعادت علی رضوی شامل تھے۔ ان بزرگوں
دکنی مخطوطات کو بڑی تحقیق کے ساتھ مرتب اور مدون
کے ان کو شائع کرنے کے لیے تیار کیا۔ مدتوں تک
سلہ جاری رہا، اس کی وجہ سے دکنی ادب فہمی
ر دکنی ادب شناسی عام ہوئی۔

زورؔ صاحب کا دکنی ادب کی تحقیق اور اشاعت
سلسلہ میں سب سے بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ ایک
ی فضا پیدا کردیتے تھے کہ کام مسلسل اور برابر ہوتا رہے
ں کے طور پر قلی قطب شاہ پر سب سے پہلے بابائے
ردو نے مضمون لکھا تھا لیکن اس کا اثر اتنا دور رس

ثابت نہیں ہوا جتنا زورؔ صاحب کے کلیات قلی قطب شاہ کے مرتب کرنے سے ہوا ہے۔ دکنی ادب اور دکنی کلچر سے شغف پیدا کرنے کے لیے زورؔ صاحب نے سینکڑوں صفحات پر مشتمل مقدمہ لکھا ہے۔ یہی نہیں وہ متواتر طور پر قلی قطب شاہ، گولکنڈہ، بھاگ متی اور بھاگیہ نگر کا ذکر کبھی تحقیقی انداز میں کبھی افسانوی طرز پر اس والہانہ انداز میں کرتے رہے ہیں کہ سب ہی اس طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو گئے۔

زورؔ صاحب نے دکنی ادب اور کلچر پر کام کرنے کی فضا ہی تعمیر نہیں کی بلکہ اس کے لیے ٹھوس بنیادیں بھی فراہم کردیں ادارۂ ادبیات کا قیام اس کی سب سے اہم اور سب سے بڑی مثال ہے۔ ادارہ کا قیام بھی زورؔ صاحب نے جماعتی اور اجتماعی انداز میں کیا۔ حیدرآباد کے سب ہی بڑے اہل قلم خواہ وہ سروری صاحب ہوں یا سید صاحب اس سے وابستہ رہے ہیں "سب رس" کا اجرا بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔ ادارۂ ادبیات کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے ہزاروں دکنی مخطوطات یہاں جمع کردیے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں اس پر مسلسل کام کرتی رہیں۔

دکنی ادب پر کام کرنے اور تحقیق کرنے پر زورؔ صاحب نے اپنے منفرد انداز میں دوسروں کو آمادہ بھی کیا۔ اس کے لیے انھوں نے دکنی مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کی۔ مخطوطات کی فہرست سازی جس قدر صبر آزما، دقت طلب، محنت طلب اور دیدہ ریز ہوا کرتی ہے اس کا بیان تحصیل حاصل ہے۔ زورؔ صاحب نے پانچ جلدوں میں یہ فہرست ہی مرتب نہیں کی بلکہ اس کا دیباچہ

س ہنرمندی سے لکھا ہے کہ پڑھنے والوں کو ان موضوعات پر کام کرنے کی ترغیب ہوتی ہے۔ یہاں تذکرے مخطوطات اردو کی تیسری جلد سے دو ایک مثالیں دی جاتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:—

"متعدد ایسے شاعروں کے مجموعوں کی اس میں تفصیلات درج ہیں جن کے کلام تو کجا ناموں اور تخلصوں سے اردو دنیا واقف نہ تھی۔ بعض شاعروں مثلاً محب، امکھن، معزز، مفتون وغیرہ کے تخلص تذکروں میں ملتے تھے مگر ان کے کلام کے مجموعوں کے بارے میں اردو دنیا ناواقف تھی۔ حسن اتفاق سے یہ ادارے میں محفوظ ہوگئے ہیں اور ان کا ذکر اس جلد میں پہلی بار کیا جا رہا ہے۔

بعض مشہور اساتذہ کی نئی کتابوں کے مخطوطوں کا حال اس جلد میں درج ہے۔ مثلاً خوشنود کی بازار حسن اور نور نامہ، ملا وجہی کی تاج الحقائق شمس الدین محمد فیض کی شرح الفیض، ڈاکٹر احمد حسین مائل کے قصائد"

"قدیم اردو نثر کی بعض ایسی کتابوں کا اس جلد میں تذکرہ شامل ہے جس کے باعث اردو نثر کی تاریخ میں اضافہ ہوگا"

بعض ایسے مخطوطات ہیں جن کے ذکر میں حیدرآباد کی علمی اور کلچرل تاریخ پر روشنی پڑتی ہے ۱؎

زور صاحب کے اس دیباچے کو پڑھنے کے بعد جو شخص تھوڑی بھی علمی کاوش ناموں کی دریافت کی لگن رکھتا ہے وہ تحقیق کی طرف مائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ بھی بجائے خود زور صاحب کا بڑا ہی منفرد کارنامہ ہے۔

زور صاحب نے دکنی ادب کی تحقیق اور اشاعت کے لیے جو کام کیا ہے اس کا اعتراف ہندوستان کے تمام مشاہیر ادب نے کیا ہے۔ یہاں ان کو پیش کرنے کی ضرورت ہے نہ موقع البتہ صرف پروفیسر احتشام حسین کے ایک مضمون کا اقتباس دینا کافی ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:—

"ڈاکٹر زور کا سب سے گراں بہا کام دکنی ادب کو علمی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہر دل عزیز بنانا ہے گو اس سلسلے میں ان کے پیش رو بھی تھے لیکن انھوں نے منظم طور پر اسی کام کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا۔ اردو شہ پارے، کلیات محمد قلی قطب شاہ، حیات میر مومن، داستان ادب حیدرآباد، حیدرآباد فرخندہ بنیاد، دکنی اردو ادب اس سلسلے کے اہم کام ہیں اگر ان میں عہد عثمانی میں اردو کی ترقی، مرقع سخن، متاع سخن، کیف سخن، معانی سخن وغیرہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو اس کا وزن اور بڑھ جاتا ہے" ۲؎

زور صاحب نے دکنی ادب کی تحقیق اور اشاعت کے سلسلے میں جو کام کیا وہ گراں بہا ہی نہیں لافانی بھی ہے۔ زور صاحب نے تنقید سے لسانیات تک جس میدان کو بھی اپنایا اس میں اتنا اور ایسا کام کیا کہ اس کی تاریخ میں ان کا نام اور کام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگیا۔ اسی طرح دکنی ادب کی تحقیق اور اشاعت میں ان کا نام اور کام لافانی ہی نہیں ہمیشہ مشعل راہ بھی بنا رہے گا۔

(یہ مضمون زور کمیٹی کے تاریخی اجلاس منعقدہ ۸ اکتوبر ۸۱ء میں پڑھا گیا)

۱؎ دیباچہ "تذکرہ مخطوطات اردو" جلد سوم

۲؎ "سب رس" زور نمبر اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۰۱

ڈاکٹر صفدر علی بیگ

ڈاکٹر زورؔ مرحوم

دسمبر ۱۹۳۸ء میں جب میں سینٹ جارجس گرامر اسکول میں آٹھویں جماعت میں تعلیم پاتا تھا اپنے والدین کے ساتھ بمبئی روانہ ہو رہا تھا۔ میرے ایک عزیز جو اس وقت جامعۂ عثمانیہ میں بی۔ اے کے طالب علم تھے ہمارے ہمراہ تھے۔ نام پلی اسٹیشن پر انھوں نے ایک صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دیکھو وہ ڈاکٹر زورؔ ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ۔ مشہور پروفیسر کی حیثیت سے میں نے ان کا نام سنا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ بڑی پیشانی، بڑے بال، چھوٹی مونچھیں، رعب دار چہرہ، بھاری بھرکم، ڈھیلی ڈھالی شیروانی، پان کھاتے اور کچھ دوستوں سے باتیں کرتے کھڑے تھے۔ واقعی پروفیسر نظر آرہے تھے۔

دوسری مرتبہ میں نے انھیں اس وقت دیکھا جب میں نے بی۔ اے سالِ اوّل میں مضمون اختیاری اردو میں داخلہ لیا اور آرٹس کالج جامعۂ عثمانیہ کی شاندار عمارت کے ایک کلاس روم میں تھا۔ میں اور میرے ہم جماعت ڈاکٹر زور صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔ کیوں کہ یہ ان کا گھنٹہ تھا۔ یکایک بغل میں کچھ کتابیں اور ایک رجسٹر لیے ہوئے ڈاکٹر زور صاحب داخل ہوئے ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا اور خود کرسی پر تشریف فرما ہو گئے۔ ہم نے بھی اپنی اپنی نشست سنبھالی۔ پروفیسر صاحب نے جیب سے پان کی ڈبی نکالی اور پان منہ میں رکھتے ہوئے ہم سب پر ایک نظر ڈالی۔ پھر کہنے لگے۔ آپ لوگ حالی کی، یادگارِ غالب مجھ سے پڑھیے۔ ہم ابھی تعجب میں تھے کتاب کھولی اور لفظ 'دیباچہ' پڑھا۔ پھر دیباچہ، تقریظ، تمہید، پیشِ لفظ، تعارف، انتساب وغیرہ وغیرہ کے تفصیلی معنوں اور فرق و امتیاز پر بحث کی۔ اور پھر حاضری لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کتابیں اور رجسٹر اٹھا کر بغل میں رکھا اور پروفیسرانہ انداز سے باہر نکل گئے۔

جب دوسری مرتبہ کلاس میں تشریف لائے تو مرزا غالبؔ کے آبا و اجداد کا تفصیلی جائزہ لیا۔ کئی نام ان کی زبان پر تھے۔ مصروفیات کی کثرت کے سبب سے پڑھاتے کم تھے۔ لیکن جب کبھی پڑھاتے تھے نہایت پروفیسرانہ مہارت سے پڑھاتے تھے۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ طلبا خود اپنے طور پر محنت کرتے اور امتحان کی تیاری کر لیا کرتے تھے۔ استادوں سے زیادہ اپنے آپ پر بھروسہ کیا کرتے تھے۔

کلاس روم کے علاوہ پروفیسر زورؔ صاحب سے کئی موقعوں پر ملنا جلنا ہوتا تھا۔ میں نے اپنی ایک نظم

مجلۂ عثمانیہ میں اشاعت کی غرض سے ڈاکٹر صاحب کو پیش کی پڑھ کر کہنے لگے "شان دار نظم کہہ ڈالی۔ اصلاح کس سے لیتے ہو"؟ میں نے کہا "حضرت امجد حیدرآبادی سے" میں انٹرمیڈیٹ میں تعلیم پانے کے زمانے ہی سے حضرت امجد سے اصلاح لینے لگا تھا کیوں کہ وہ میرے برادرِ کلاں کے بہت اچھے دوست تھے۔ غرض میرا جواب سن کر ڈاکٹر صاحب جو کسی قدر منہ پھٹ بلکہ حیدرآباد کی زبان میں "اکھڑ" واقع ہوئے تھے فرمانے لگے "ارے چل" مجھے کیا چکر دیتا ہے۔ وہ کسی کو اصلاح نہیں دیتے۔ میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا "جی! لیکن مجھے دیتے ہیں۔ آپ فرمائیں تو ان کی اصلاح دی ہوئی نظمیں لاکر دکھاؤں۔" زورؔ صاحب نے بھوں چڑھا کر میری طرف دیکھا اور سر ہلا کر چپ ہو رہے۔

ایک مرتبہ ایک خوب صورت طالب علم نے مضمون لکھ کر زورؔ صاحب کو دکھایا۔ مضمون پڑھ کر فرمانے لگے "تمہارا خط بہت اچھا ہے" اس نے کہا "جی عنایت ہے" فرمانے لگے نہیں۔ خوش وضع بچوں کا خط بھی خوش وضع ہوتا ہے" اس طالبِ علم نے بھی ہمت سے کہا "جی، ایک زمانے میں میں نے بھی آپ کی خوش خطی کی تعریف سنی تھی" تو مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ بات صحیح ہے کہ زورؔ صاحب عہدِ جوانی میں خوش رو واقع ہوئے تھے۔ ان کی اس وقت کی تصویریں شاہد ہیں۔

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو تھے۔ ان کے وظیفے پر ہٹنے کا وقت آیا تو پروفیسر سید محمد صاحب مرحوم بیان کرتے تھے کہ حکومتِ حیدرآباد نے زورؔ صاحب کو ام۔ اے کامیاب کرتے ہی اسکالرشپ دے کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لانے کے لیے انگلستان روانہ کیا تاکہ ان کے واپس آنے کے بعد عبدالحق صاحب کی جگہ دی جائے۔ اس اثنا میں سید سجاد صاحب نے جنھیں عبدالحق صاحب نے دہلی سے بلوا کر اردو کا لکچرر مقرر کروایا تھا فوراً دو سال کی رخصت لی اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے انگلستان روانہ ہوئے۔ دونوں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں لے کر واپس ہوئے اور سجاد صاحب نے درخواست دی کہ انھیں یہ خدمت دی جائے کیوں کہ وہ لکچرر بھی رہ چکے ہیں اور پی۔ ایچ ڈی بھی ہیں۔ نتیجتاً جامعہ نے یہ طے کیا کہ دونوں میں سے کسی کو بھی یہ خدمت نہ دی جائے۔ اور دونوں کو ریڈرشپ دے کر فل گریڈ یعنی آٹھ آٹھ سو روپے ماہوار دی جائے۔ پھر دونوں کا مسئلہ طے ہونے تک پروفیسر حسین علی خاں کو جو صدرِ شعبۂ انگریزی تھے صدر شعبۂ اردو مقرر کیا جائے۔ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن اس دوران میں سجاد اور زورؔ پروفیسروں میں اکثر نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔

جب میں نے ام۔ اے میں داخلہ لیا اس وقت اردو میں میں اکیلا طالبِ علم تھا۔ پروفیسروں کے اجلاس پر ہی میری کلاس ہوا کرتی تھی۔ ایک دن ڈاکٹر سجاد مجھ سے کہنے لگے۔ "جب ہم دہلی سے یہاں آئے تو یار لوگوں نے ہماری قابلیت کا مذاق اڑایا ہم پر فقرے کسے لیکن جب ہمارا ایک مضمون شائع ہوا تو یار لوگوں کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ (شاید ان کا اشارہ زورؔ صاحب

کی طرف تھا) اسی اثنا میں ڈاکٹر زور صاحب کو دارالعلوم کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا اور وہ جامعہ سے رخت سفر باندھنے لگے۔ وہ مجھے سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلیات پڑھایا کرتے تھے جس کو پڑھانے والا ان کے سوا کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔ میں نے پریشانی سے پوچھا "صاحب اب کیا ہوگا" فرمانے لگے "پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا"۔ زور صاحب کے جانے کے بعد سجاد صاحب نے پہلے مجھ سے کہا اب کلیاتِ قلی میں پڑھا دوں گا۔ پھر کہنے لگے ایسا پست درجے کا شاعر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا پڑھائیں گے۔ میں نے انھیں زحمت نہیں دی۔

ایک پرلطف واقعہ قابل ذکر ہے اردو ڈپارٹمنٹ کے کلوکیم کے ایک جلسے میں جس میں اردو کے تمام اساتذہ شریک ہوا کرتے تھے منیزہ کاوس جی حالی پر مقالہ پڑھ رہی تھیں۔ جب مقالہ ختم ہوا تو ڈاکٹر زور نے کہا "حالی نے اس طرح کیوں کہا اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا، حالاں کہ عشق تو اصل اصول ہے"۔ زور صاحب نے ایک صوفیانہ بات کہی تھی۔ اس پر مرحومہ صغرا ہمایون مرزا جو اس وقت کے اکثر ادبی جلسوں میں شریک ہوا کرتی تھیں اور کچھ نہ کچھ ضرور کہتی تھیں کہنے لگیں "نہیں، عشق و محبت میں اکثر نوجوان تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اس لیے حالی صاحب نے اس طرح کہا"۔ یہ سن کر زور صاحب نے بھٹ سے کہا۔ "عشق میں تباہ و برباد کہاں ہوتے ہیں۔ عشق میں تو آبادیاں ہوتی ہیں، بستیاں ہوتی ہیں۔ اگر عشق نہ ہوتا تو آپ کہاں ہوتیں، میں کہاں ہوتا"۔ اس پر سب ہنس پڑے بے چاری مرحومہ سرخ سرخ ہو گئیں اور کھسیانے پن سے کہا "زور صاحب آپ نے اپنا کلام نہیں سنایا"۔ زور صاحب نے فوراً جواب دیا۔ "اچھا، اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی"۔ بات یہ ہے کہ ایک تو وہ کلام سنانے کا موقع نہیں تھا دوسرے یہ کہ زور صاحب کو شاعری چھوڑے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر زور ابتدائی زمانے میں شاعر اور اچھے شاعر تھے لیکن وہ شاعر سے زیادہ استاد، استاد سے زیادہ مقرر، مقرر سے زیادہ مصنف اور اس سے بھی زیادہ اردو ادب کے معمار کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے اردو زبان و ادب کی خدمت میں کوئی کمی اور کسر باقی نہیں رکھی۔ جلسوں میں تقریریں کیں خطبات پڑھے، تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ کتب و رسائل کی اشاعت، اداروں اور ایوانوں کا قیام، ادبی محفلوں، جلسوں جلوسوں مشاعروں اور جشنوں کا انعقاد سب کچھ اور اتنا کچھ کہ ان کی حیات حیاتِ اردو کے ساتھ وابستہ ہو گئی۔ میں سمجھتا ہوں ان کی حیات، کارناموں اور ادبی خدمات پر ایک مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اس موضوع پر مقالے لکھنے کی کوشش کی گئی لیکن جہاں تک میرا خیال ہے کوئی مقالہ شائع ہو کر منظرِ عام پر نہیں آیا۔ البتہ کشمیر کے اکبر حیدری نے ایک مقالہ کشمیر سے شائع کیا ہے۔

"ادارۂ ادبیاتِ اردو" اور "ایوانِ اردو" زور صاحب کے زندۂ جاوید کارنامے ہیں جو یقیناً اردو کے ساتھ باقی رہیں گے اور زور صاحب کا نام و نمود لیتے رہیں گے۔ کیا یہ اردو زبان اور ادب کی خوش قسمتی نہیں کہ سرسید، ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر زور جیسی شخصیتیں نصیب ہوئیں۔ جنہوں نے دکن

کی قسمت زور آزما تھی، دکنی زبان کو زور حاصل ہونا تھا اور اردو کو ایوان میں بسیرا کرنا تھا تب ہی مادرِ جامعہ نے زور جیسے فرزند کو جنم دیا۔

ویسے تو زور صاحب نے پینتیس سے زیادہ تصنیفات و تالیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں، مقالے لکھوائے کتابیں تصنیف اور تالیف کروائیں، قلمی نسخے جمع کیے اور چھپوائے، کلیات اور کتب و رسائل شائع کیے لیکن ان کے کارناموں میں "ہندوستانی لسانیات"۔ "کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ"۔ "اردو شہ پارے"۔ "ہندوستانی صوتیات" "اردو کے اسالیبِ بیان" اور بعض دیگر کارنامے ان کی شہرتِ عام اور بقائے دوام کے ضامن ہیں۔

مغربی ممالک میں تقریباً دو سو سال سے لسانیات پر تحقیقات کی جا رہی ہیں اور کوشش کی جا رہی ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں کے تعلقات، اصول و قواعد اور پیدائش، موت اور حیات کا علم حاصل کیا جائے۔ تمام نئی اور پرانی زبانوں پر تحقیقات کی جا رہی ہیں، اصول اور قاعدے بنائے جا رہے ہیں اور علم اللسان یا لسانیات کو ایک فلسفہ اور سائنس کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ معیاری اور اعلیٰ درجے کی ان گنت کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن اردو زبان میں ڈاکٹر زور کی علم اللسان پر تصنیف سے پہلے تک کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی تھی۔ وہ قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے اس جانب قدم اٹھایا۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ "ہماری زبان کے لسانی پہلوؤں پر آج تک بہت کم تحقیقات کی گئی ہیں اور جو کچھ کی گئیں وہ دوسری زبانوں میں قلم بند ہوئی ہیں۔

اسی طرح ادبی تنقید کے اصول و قواعد پر انگریزی زبان میں بے شمار کتابیں لکھی جا چکی تھیں لیکن اردو میں اس قسم کا مواد شاذ تھا۔ زور صاحب نے طالب علمی کے زمانے ہی میں انگریزی کے فنِ تنقید سے مدد لی اور ان کے اصول و قواعد کی روشنی میں اردو ادب و شاعری پر بحث کی۔ اس سلسلے میں ان کی تصنیف "تنقیدی مقالات" بھی قابلِ ذکر ہے۔ غرض ڈاکٹر زور کے تمام کارنامے روزِ روشن کی طرح ہمارے سامنے ہیں۔ ہم انھیں ہرگز فراموش نہیں کر سکتے۔

(یوم زور کے ادبی اجلاس منعقدہ ۴ اکتوبر ۸۱ء میں پڑھا گیا)

(بقیہ صفحہ ۴۳)

نے ہر مشکل موڑ پر ان کا ساتھ دیا۔ ان کی کوششوں کے سبب آج اردو کو اس کا ایوان کیا ملا اس کی مانگ میں شفق پھوٹی۔ ایوانِ اردو اپنے قیمتی ذخیرے بیش بہا نوادرات تہذیب و تمدن کی وجہ سے حیدرآباد کی قومی یادگار اور علم و ادب کا درخشاں مینار اور اربابِ ذوق و ادب کے لیے گنج ہائے گراں مایہ ہے۔ محبت و صلح و آشتی کا پیغام اور علم و ادب کا درخشاں مینار ہے۔ جب تک یہ مینار قائم ہے زور کا پیغام اور زور کا نام اردو کے ماتھے پر سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔

(ادبی اجلاس یوم زور ۸۱ء میں پڑھا گیا)

اللہ ہر دم اردو ہر گھر

(خواجہ حسن نظامی)

رشید الدین

ڈاکٹر زورؔ اور ادارۂ ادبیاتِ اردو

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کا قول ہے
ـرے کام خود نہیں ہو جاتے بلکہ کرنے پڑتے ہیں
ـوی صاحب کی ساری زندگی اپنے اس قول کی عملی
ـیر بنی رہی۔ یہی حال ڈاکٹر زورؔ مرحوم کا بھی تھا۔
ـموں نے بھی مولوی صاحب کی طرح اردو کے لیے
ـت سے کام کئے اور ارادتاً کئے۔ یہ ان سے
ـفاقاً یا تفریحاً سرزد نہیں ہو گئے بلکہ ان کے لیے
ـیں سخت جد و جہد کرنی پڑی اور اپنے آرام اور
ـینان کو تیاگ دینا پڑا۔ میرے خیال میں اردو
ـیا میں اردو کی ٹھوس خدمت میں لوگ کوئی بابائے
ـدو مولوی عبدالحق کا ثانی ہو سکتا ہے تو وہ ڈاکٹر زورؔ
ـے تھے۔ اس لیے ان کے ہونہار شاگرد اور ممتاز
ـیب یوسف ناظم نے انھیں "جنوب کا بابائے
ـردو" کہا ہے لیکن میں تو کہوں گا کہ مولوی صاحب کے
ـستان چلے جانے کے بعد وہ جنوب ہی کے نہیں بلکہ
ـشمیر سے راس کماری تک سارے ہندوستان کے
بابائے اردو بن گئے تھے۔

ڈاکٹر زورؔ مرحوم نے یوں تو اردو کے کئی گراں قدر
ـم انجام دیے لیکن ان میں ادارۂ ادبیات کا قیام
ـردو والوں کو ہمیشہ ان کی یاد دلاتا رہے گا اور اردو
والے ان کے اس کام کو ہر دور اور ہر زمانے میں بہ نظرِ استحسان
دیکھتے رہیں گے۔ آج اس ادارہ میں اس کی اپنی عمارت
ایوانِ اردو میں ہم ان کی یاد منانے کے لیے جمع ہوئے
ہیں اور ان کی انیسویں برسی پر ان کی خدمات کو خراجِ
عقیدت پیش کر رہے ہیں۔

زورؔ صاحب ان خوش قسمت لوگوں میں سے
تھے جو اپنے پراجکٹ اپنی زندگی ہی میں مکمل کر لیتے ہیں۔
ایوانِ اردو بھی ان کا ایک ایسا پراجکٹ تھا جو ان کی آنکھو
کے سامنے سنگ و خشت سے آراستہ ہو گیا تھا۔ اس
عظیم عمارت پر ۱۹۶۳ء میں کوئی ڈیڑھ لاکھ روپیہ کا
خرچ آیا تھا۔ اس لحاظ سے آج آپ اس کی قیمت کا
اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس کی تعمیر میں مرکزی حکومت
اور ریاستی حکومت نیز حکومتِ کشمیر کی مالی امداد
شامل ہے۔ ادارہ کی اپنی عمارت بن جانے پر زورؔ صاحب
بے حد خوش رہتے تھے اور ہمیشہ یہ محسوس کرتے تھے کہ
جیسے ان کی ذاتی کوٹھی بن گئی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے
زمین بھی اپنی ذاتی کوٹھی کے ایک حصہ سے دی تھی اور
کوئی بھی اہم بیرونی شخصیت جب بھی حیدرآباد آتی تو وہ
اُسے خوشی خوشی یہ عمارت بتاتے اور پھولے نہ سماتے۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا قیام ۱۹۳۱ء میں عمل میں

آیا تھا۔ اس طرح آج اس ادارہ کو قائم ہوئے پورے پچاس سال کا عرصہ ہو رہا ہے اور اس کی گولڈن جوبلی منانے کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں اور اس سلسلہ میں ایک کمیٹی بھی تشکیل دے دی گئی ہے جس کے اجلاس وقتاً فوقتاً ایوانِ اردو میں ہو رہے ہیں۔ آج کے زمانے میں کسی اردو ادارہ کا اتنے لمبے عرصہ تک قائم رہنا اور کامیابی کے ساتھ کام انجام دینا ایک عجوبہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بانی نے جس نیک نیتی کے ساتھ اسے قائم کیا تھا اس کا اتنا تو صلہ قدرت کی جانب سے اسے ملنا ہی تھا کہ اس کا لگایا ہوا درخت تا دیر ہرا بھرا رہے اور بار آور ہوتا رہے۔

ڈاکٹر زور ۱۹۳۰ء میں لندن سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر آئے اور اسی سال جامعہ عثمانیہ میں اردو کے ریڈر ہو گئے۔ کوئی اور ہوتا تو سمجھتا کہ لو عاقبت سنور گئی۔ اب زندگی بھر چین کی بانسری بجاؤ۔ لیکن زور صاحب کے لیے یہی سب کچھ نہیں تھا۔ فکرِ معاش سے بے فکر ہونے کے بعد انھیں زبان و ادب کی فکر دامن گیر ہوئی جسم کی غذا کا انتظام ہو چکا تھا۔ اب روح کی غذا کا انتظام ہونا تھا۔ چناں چہ انھوں نے اپنے باذوق متعلقین کے ساتھ مل کر جن میں پروفیسر سید محمد، ڈاکٹر رضی الدین، ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم، میر نواز جنگ (جو اس وقت تک صرف میر خاں تھے)، ڈاکٹر سعادت علی خاں، میر حسین علی خاں انجینئر، عبدالرحمن شریف، عبدالرزاق راشد اور عمر یافعی شامل تھے ایک ادبی انجمن قائم کی جس کے ہفتہ وار اجلاس ہوتے تھے جن میں مضامین پڑھے جاتے تھے اور ان پر مباحث ہوتے تھے۔

کچھ مہینے یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن ایک دن اچانک زور صاحب کو سندیسہ ملا کہ وزیر اعظم سر اکبر حیدری شام کی چائے ان کے ساتھ پینا چاہتے ہیں۔ لیکن چائے تو محض ایک بہانہ تھا۔ اصل میں انھوں نے انھیں سرزنش کے لیے بلایا تھا کہ حکومتِ وقت ان اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اس طرح ہر ہفتہ پابندی اجتماع کو پسند نہیں کرتی اور انھیں صرف اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے چاہییں۔ زور صاحب نے انھیں سمجھایا کہ یہ اجتماعات خالص ادبی نوعیت کے ہیں اور ان کا مقصد نوجوانوں کی ادبی سرگرمیوں کو اجاگر کرنا ہے اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں لیکن سر حیدری اس وضاحت سے مطمئن نہیں ہوئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے فرداً فرداً ہر شخص کو بلا کر اس طرح سرزنش کی اور مجبوراً اس انجمن کے اجلاس ختم کر دینے پڑے۔

اصل واقعہ یہ تھا کہ سر اکبر حیدری اور اُس زمانے کے بعض اعلیٰ عہدہ داران کو کسی نے یہ باور کرا دیا تھا کہ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان جدید ذہن رکھتے ہیں اور ان کا مقصد اس طرح جمع ہو کر اپنی سیاسی سرگرمیوں کو تیز کرنا اور حکومت کے خلاف بغاوت کی فضا پیدا کرنا ہے۔ حالاں کہ حقیقتِ حال کچھ اور ہی تھی۔ یہ دیکھ کر زور صاحب نے اس طرح گھروں پر انفرادی اجتماعات منعقد کرنے اور کلھیاں میں گڑ پھوڑنے کی بجائے علی اعلان اور کھلے بندوں ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلہ میں انھیں اپنے ساتھیوں پروفیسر عبدالمجید صدیقی، عبدالقادر سروری،

فیسر عبدالقادر صدیقی، نصیرالدین ہاشمی اور پروفیسر
محمد سے بہت مدد ملی۔ چناں چہ اس طرح ایک
ارہ قائم کیا گیا جس کا نام ادارہ ادبیات اردو رکھا گیا
ادارہ کا سب سے اہم مقصد اردو زبان کی ترویج
شاعت تھی۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ اہلِ دکن اور
موصاً جامعہ عثمانیہ کی فارغ التحصیل نوجوان نسل میں
ب و انشاپردازی کا ذوق پیدا کیا جائے۔ اس کا
مقصد یہ بھی تھا کہ ادب کے ساتھ ساتھ دکن کی تاریخ
ر ثقافت نیز قدیم آثار و نشانیوں اور مخطوطات کا تحفظ
اجائے اور ان کی اہمیت واضح کی جائے۔ ادارہ کے
ت ایک کتب خانہ قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا جس میں
یوعہ اردو کتابوں کے علاوہ نادر مخطوطات اور استعمال
انتظام ہو۔

اس طرح ۱۹۳۱ء میں بہت ہی چھوٹے پیمانہ پر
رود وسائل کے ساتھ ادارۂ ادبیات اردو نے کام
رنا شروع کیا اور کسی نے اس کی طرف دھیان بھی نہیں
یا۔ سب یہی سمجھتے رہے کہ ایسی انجمن اور ادارے
ت قائم ہوتے ہیں اور پھر اپنی موت آپ مرجاتے
ب خود ڈاکٹر زور نے ایک جگہ لکھا ہے۔ "میں نے
رے ناموافق حالات میں ادارہ قائم کیا تھا۔" لیکن
اموافق حالات اور ناسازگار ماحول کے باوجود وہ اور
ن کے ساتھی کسی ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ کیے بغیر
تنہائی خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ ڈاکٹر زور
ے مکان کے ایک گوشہ ہی میں ادارہ کا دفتر اور کتب خانہ
ئم کر دیا گیا۔ ادارہ کے کام کو بارہ مختلف شعبوں میں تقسیم
یا گیا اور بہت ہی منظم طریقہ پر سلیقہ کے ساتھ کام کیا جانے

جب پانچ چھ سال تک ادارہ نے خاموشی اور خاصی ترتیب و تسلسل کے ساتھ کام انجام دیا اور کوئی پندرہ کتابیں شائع کرڈالیں تو لوگوں کو احساس ہوا کہ واقعی کچھ کام ہو رہا ہے۔ چناں چہ ہم خیال لوگوں نے دستِ تعاون بڑھایا اور روشن خیال مخالفین بھی قائل ہوگئے کہ زور باتیں نہیں کام کرتا ہے۔ لوگوں نے دامے درمے، سخنے ادارہ کی مدد کرنی شروع کی۔ کسی نے نقد عطیہ دیا تو کسی نے کوئی کتاب دے دی۔ کسی نے کوئی اہم پرانا رسالہ دے دیا تو کسی نے کوئی مخطوطہ عنایت کر دیا۔ نقطۂ عنایت پر یاد آیا کہ عنایت جنگ کی ادارہ پر خاص عنایت رہی اور ان کے مخطوطات اور کتابوں کی تعداد کتب خانہ میں بہت زیادہ ہے۔ زور صاحب ہر ایک کا تحفہ قبول کرکے شکریہ ادا کرتے اور اسی وقت معطی کا نام لکھ کر دستخط کر دیتے اور تاریخ ڈال کر کتب خانہ کی فہرست میں درج کرا دیتے۔ چناں چہ آج ادارہ کے کتب خانہ میں ۳۰ ہزار کے قریب کتابیں اور ۵ ہزار سے زاید مخطوطات ہیں۔

جب ادارہ مستحکم ہوگیا تو اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ ادارہ کی سرگرمیوں کو عام کرنے اور اہلِ حیدرآباد کی تخلیقات کو سارے ہندوستان تک پہنچانے کے لیے ایک رسالہ جاری کیا جائے۔ چناں چہ ادارہ کے قیام کے آٹھویں سال ۱۹۳۸ء میں ماہ نامہ "سب رس" جاری کیا گیا جو آج تک پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ان بیالیس سالوں میں اردو کے کتنے ہی رسالے جاری ہوئے اور بند بھی ہوگئے۔ کئی رسالوں کی اشاعت میں تعطل آیا اور کئی ایسے ہیں کہ نکلتے نہیں لیکن کسی کو پتہ نہیں کہ کب چھپتے ہیں اور کون پڑھتا ہے۔ لیکن اسی

معاملہ میں سب رس اہم بامعنی ثابت ہوا۔ سب رس کے معنی ہیں سب کی بیخ اور رسائی ہیں۔ یہ نہ صرف ہندی کے ساتھ اپنے مقصد معیار کے مطابق شائع ہو رہا ہے بلکہ اس کی رسائی سب تک ہے۔

ادارہ نے جہاں مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمے کروائے اور طبع زاد کتابیں نظم و نثر میں شائع کیں وہیں اردو دانی کے امتحانات بھی منعقد کروائے تاکہ ادارہ کا بنیادی مقصد یعنی اردو زبان کی ترویج و اشاعت متاثر نہ ہونے پائے۔ ہر سال حیدرآباد اور سابق ریاست حیدرآباد کے اضلاع میں یہ امتحانات منعقد کرائے جاتے ہیں۔ اس طرح ادارہ کے پاس آج بھی ریاست حیدرآباد کے وجود باقی تھے۔ ادارہ نے اردو میں انسائیکلوپیڈیا کا کام بھی شروع کیا تھا مگر مالی مشکلات کی وجہ سے یہ کام جاری نہ رہ سکا۔ اب حکومت ہند نے اردو بورڈ کے ذریعہ یہ بھی شروع کر دیا ہے اور اتفاق سے حیدرآباد کا ایک ادارہ ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہی یہ کام انجام دے رہا ہے۔ حکومت ہند کے ذکر کے ساتھ ہی میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ مرکزی حکومت نے اردو کے تعلق سے جو گجرال کمیٹی قائم کی تھی اور جس کی سفارشات اس وقت حکومت کے زیر غور ہیں ادارۂ ادبیات اردو کو جنوبی ہند کا ایک بڑا ریسرچ سنٹر بنانے کی بھی سفارش ہے۔

اس طرح ادارہ کا کام چلتا رہا اور وہ روز افزوں اس طرح ترقی کرتا رہا کہ زمانے کی گردشیں بھی اس کے کام پہ اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اس عرصہ میں کئی انقلابات آئے کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ ملک آزاد اور تقسیم ہوا۔ ریاست حیدرآباد کی آزاد حکومت قائم ہوئی پھر پولیس ایکشن ہوا اور حیدرآباد بھی عظیم جمہوری ہندوستان کا ایک جزو بن گیا۔ یہاں پہلے فوجی اور پھر شہری حکومت قائم ہوئی۔ ۱۹۵۶ء میں ریاستوں کی تنظیم جدید ہوئی اور سابق ریاست حیدرآباد کی تین حصوں میں تقسیم عمل میں آئی۔ آندھرا پردیش قائم ہوا لیکن زور صاحب برابر ادارہ کی سرگرمیوں کو فروغ دیتے رہے۔ حالات سازگار ہوتے رہے اور ادارہ کو ہر دور میں سرکاری گرانٹ ملتی رہی۔

پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ ادارہ کو اپنی عمارت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ زور صاحب چاہتے تھے کہ ادارہ کی ذاتی عمارت شہر کے کسی مرکزی مقام پر تعمیر کی جائے لیکن کوئی موزوں زمین نہ ملنے پر بیگم زور ہی نے اپنے مکان تہنیت منزل سے متصل اراضی اسے بطور تحفہ دے دی۔ اور جناب فیاض الدین نظامی جیسے آرکیٹکٹ کے نقشہ کے مطابق اس کی تعمیر شروع ہوئی اور یہ مکمل ہوئی جس میں اس وقت آپ سب تشریف فرما ہیں۔ اس کا موجودہ نام ایوان اردو خواجہ حسن نظامی مرحوم کا رکھا ہوا ہے۔

کہتے ہیں کہ جو کام نیک نیتی سے کیا جائے وہ بہت زیادہ فروغ پاتا ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کی ترقی اور نشو و نما سے اس قول کی صداقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے اس وقت یہ ادارہ ایک

نظم اور مکمل ادارہ ہے اور جن مقاصد کے لیے
ئم کیا گیا تھا ان کی کماحقہٗ اور کامیابی کے ساتھ
یل کر رہا ہے۔ لیکن ابھی اسے بہت کچھ کرنا
قی ہے۔

تو یہ تھی ادارہ کی کہانی جو دوسرے الفاظ
ں اس کے بانی کی بھی کہانی تھی کیوں کہ بقول مولانا
بدالماجد دریابادی "ادارۂ ادبیاتِ اردو ڈاکٹر
ید محی الدین قادری زورؔ دو علیٰحدہ چیزیں نہیں
یں"۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر میں وہ ادارہ کے لیے
ت بے چین تھے اور بہت جلد کشمیر یونیورسٹی کے
شعبہ اردو کی صدارت چھوڑ کر حیدرآباد آجانے
الے تھے لیکن افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی۔ آج ڈاکٹر
ورؔ جسمانی طور پر ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کے کام
قی ہیں اور ہمیشہ باقی رہیں گی۔ اس طرح موت
ی انھیں نہ مٹا سکی اور ان ہی کا ایک شعر ان کے
لئے حسب حال معلوم ہوتا ہے۔

دت سے بھی مر یں گے نہیں زورؔ ہم + زندگی میں جو کچھ کام آجائیں گے

یوم زورؔ کے ادبی اجلاس منعقدہ ۴ اکتوبر ۱۹۸۱ء میں پڑھا گیا)

بقیہ ادارۂ ادبیاتِ اردو ایک تعارف (صفحہ [illegible] سے آگے)

دلانہ اعانت دیں تاکہ وہ اپنے ماضی کی شان دار روایات
کو بحال کر سکے اور اردو زبان و ادب اور قومی تہذیب
کو فروغ دینے کے کام میں بھرپور حصہ لے سکے۔

جیسا کہ گجرال کمیٹی نے سفارش کی ہے مناسب
ہوگا کہ ادارۂ ادبیات اردو کو تحقیقی مرکز کی حیثیت سے
فروغ دیا جائے۔

۱۶۔ شعبۂ اردو میوزیم | ادارہ کا میوزیم دکن کے
تاریخی و ثقافتی آثار کا آئینہ دار ہے۔ میوزیم کی نادر اشیا
میں قطب شاہی، مغلیہ اور آصفیہ فرامین، اسنادی کاغذات،
دکنی خطاطی اور مصوّری کے نمونے ہیں۔ مشاہیر ہند و دکن
کے مکتوبات، قدیم و جدید ادیبوں اور شاعروں کی تصاویر،
قدیم منبت کاری کے نمونے، قدیم سواریوں کے عکسی فوٹوز،
شاہانِ بہمنیہ تا قطب شاہیہ، مغلیہ اور آصفیہ کے نادر
سکّے، قدیم اسلحہ، بیدری ظروف، قدیم شجرے اور نقشے
وغیرہ داخل ہیں۔ میوزیم میں شہر حیدرآباد کا ایک قدیم نقشہ
موجود ہے جو ۱۱۸۵ھ ہجری میں تیار ہوا تھا اس میں شہر
حیدرآباد کے حدود اور اس زمانے کی عمارتیں اور راستوں
پر سواریاں بتائی گئی ہیں جس سے اس دور کے تمدن پر
روشنی پڑتی ہے۔ اس اہمیت کے مدِ نظر برٹش میوزیم
اور محکمہ اعداد و شمار حکومت ہند نے اس کی ایک ایک
تصویر حاصل کی ہے۔ اردو میوزیم کے ذخیرہ پر ایک
کتاب "تذکرۂ نوادر ایوان اردو" شائع ہو چکی ہے
جناب میر سراج الدین علی خاں (آفس سکریٹری) میوزیم
کے امور کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

عطیہ رحمانی

دکنی ادب میں ڈاکٹر زور کا حصہ

دکن اور دکنی ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اُسے ڈاکٹر زور جیسا محقق اور مورخ مل گیا۔ اردو کی ابتدا کے بارے میں مختلف نظریے پیش کیے گئے لیکن جہاں تک تصنیف و تالیف کا تعلق ہے اس کام کا آغاز پہلے پہل دکن ہی میں ہوا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ تحقیق کرکے قدیم دکن کے شعراء و مصنفین اور ان کی تصانیف کے مٹے ہوئے آثار کو زندہ کیا جائے۔ دکنی ادب میں عوام کے علاوہ سلاطینِ دکن کا بھی حصہ رہا ہے گولکنڈہ اور بیجاپور کے امراء و سلاطین نے ادب کی جو خدمت کی وہ شاید ہی کسی عہد میں ہوئی ہو۔ بادشاہ خود بھی شعر کہتے اور شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کرکے ان کی ہمت افزائی کرتے۔ جس سے دکنی ادب مالا مال ہو گیا تھا۔ لیکن مدتوں بعد دکنی ادب کا جائزہ لیا گیا تو اس دور کے شعراء و مصنفین کا تخلیقی سرمایہ گزرے ہوئے وقت کے ملبے کے نیچے دب گیا تھا۔ جس کی بازیابی بے حد ضروری تھی زور صاحب نے اس منتشر سرمائے کی تلاش اور اسے یکجا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور گولکنڈہ اور بیجاپور کے بادشاہوں اور دوسرے شاعروں اور مصنفوں کے کارناموں کو مرتب کرکے ش... اس سلسلے کی پہلی اہم کتاب "اردو... ہے جس کا مواد انھوں نے لندن اور پیرس... کتب خانوں کے مخطوطات سے جمع کیا تھا کتاب میں جدید ترین تحقیقات کی روسے ا... کے ان کارناموں کو پیش کیا گیا ہے جو اردو آغاز سے ولی تک کا سرمایہ ہیں۔ شاعروں... ادیبوں کی تخلیقات کا انتخاب بھی شائع کیا جس سے کتاب کے حسن اور اس کی اہمیت... اضافہ ہو گیا ہے۔

کلیات محمد قلی قطب شاہ کی تدوین:

ولی کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ما... تھا۔ لیکن کلیات کی اشاعت سے اردو کی تاریخ دو سو سال پیچھے چلی گئی۔ قطب... کا کلام مختلف مقامات پر بکھرا پڑا تھا۔ زو... نے اسے جمع کیا اور بڑی محنت سے ترتیب... اس کے علاوہ تین سو پچیس صفحات کا ایک مقدمہ لکھا۔ جس میں یہ ثابت کیا گیا کہ قلی ق... اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ ام...

کلیات میں ۲۴۰ نظمیں، ۳۱۲ غزلیں، قصائد، رُباعیات اور مثنویاں شامل ہیں۔

ڈاکٹر زور نے یہ تحقیقی سفر تنہا طے نہیں کیا احباب اور شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ساتھ تھی۔ دکن کے شاعروں اور ادیبوں کی بازیافت کی خاطر انھوں نے خود بھی دن رات کام کیا اور دوسروں سے بھی کام لیا۔ جس سے دکن کی تاریخ ثقافت اور دکنی ادب کے نقوش نمایاں ہوئے۔ "کلیات قلی قطب شاہ" کے علاوہ ڈاکٹر زور کی دوسری اہم تصانیف حسب ذیل ہیں۔

"میر مومن" مومن قطب شاہی عہد کے پیشوا وزیر اعظم اور بہت بڑے عالم تھے۔ اس کتاب میں ان کی زندگی کے حالات اور کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

"حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ" گولکنڈہ کے پانچویں تاجدار کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ اس عہد کے تمدن اور معاشرت کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے یہ کلیات قلی قطب شاہ کا مقدمہ ہے جسے بعد میں کتابی شکل دی گئی۔ اس میں قلی قطب شاہ کے بچپن، تعلیم و تربیت، آغاز شباب، رندی و مستی، جوانی و رعنائی، مذہبی پابندی، عقائد کی پختگی، جنگ و جدال، سیاست اور رسم و رواج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں ان کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر زور کی ایک اور اہم تصنیف "داستانِ ادب حیدرآباد" ہے جس میں قطب شاہی سلطنت کے پیشوا علامہ ابن خاتون سے لے کر جامعہ عثمانیہ کے قیام تک کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ "دکنی ادب کی تاریخ" اردو زبان کے قدیم مراکز گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ، حیدرآباد اور اورنگ آباد کے شاعروں اور ادیبوں کی اردو خدمات کی تفصیلی تاریخ ہے۔

دکن کے ۱۱۱ قدیم شاعروں کی حیات اور شاعری کے بارے میں تین تذکرے معہ انتخاب کلام شائع کئے اس کے علاوہ "بادۂ سخن" "کیف سخن" "فیض سخن" "رمز سخن" "متاع سخن" اور "معانی سخن" بھی زور صاحب کے حسن ترتیب کا نتیجہ ہیں۔ ان ٹھوس علمی اور ادبی کاموں کے علاوہ زور صاحب نے دکن کی تہذیبی اور ثقافتی تہذیب کے آثار کے باقی رکھنے کے لیے دکن کے تاریخی مقامات کا دورہ کیا اور وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر انھیں قلم بند کیا۔ اس تحقیق کے دوران انھیں جہاں کتبے ملے ان کے چربے لے کر انھیں ادارہ میں محفوظ کیا۔ اہم عمارتوں کے تحفظ کی بھی کوشش کی۔ دکن کی اہم شخصیتوں کے شکستہ مقابر کی تعمیر کی اور کتبے نصب کروائے۔

زور صاحب کا ایک اور کارنامہ مخطوطات کے تذکرے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں ادارۂ ادبیات اردو کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۳۲ء سے ادارہ کے کتب خانے میں کتابیں جمع کی جانے لگیں۔ اس وقت کتب خانے میں ستائیس ہزار مطبوعات اور پانچ ہزار سے زائد مخطوطات جمع ہیں۔ بیشتر مخطوطات ڈاکٹر زور کی محنت اور کوششوں سے جمع ہو سکے اور کچھ مختلف علم دوست اصحاب نے ادارے کو بطور عطیہ دے۔ ان مخطوطات کا تذکرہ زور صاحب نے ۵ جلدوں میں مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

دو غزلیں

پونچھ بھی ڈالو اب چشمِ نم ساتھیو!
کیوں کریں آج بھی کل کا غم ساتھیو!

اپنی تقدیر بنتی ہے تدبیر سے
اب نہ دشمن کا ڈھونڈو کرم ساتھیو!

منحصر ہے یہ دنیا جو اسباب پر
سب ہی اسباب ہوں گے بہم ساتھیو!

ہمدمو! ابھی نہ چھوڑو یہی وقت ہے
یوں ہی بڑھتا رہے ہر قدم ساتھیو!

ہمتیں پست ہوتے نہ پائیں گی اب
ختم ہوتا ہے دورِ ستم ساتھیو!

۲

ایسے بے درد و بد اندیش یہاں ہیں کچھ لوگ
جو سمجھے نہیں پابندِ فغاں ہیں کچھ لوگ

پینے والے مئے و مینا پہ نظر رکھتے ہیں
چشمِ ساقی کی طرف کیوں نگراں ہیں کچھ لوگ

ہم غریبوں پہ امیروں کی خدائی چلتی
باعثِ برہمیِ بزمِ بتاں ہیں کچھ لوگ

قافلے چل بھی پڑے لے کے شعورِ فردا
اور ابھی مستِ مئے خوابِ گراں ہیں کچھ لوگ

طرحِ افسانہ و افسوں کی حقیقت معلوم
درسِ کارگہہِ شیشہ گراں ہیں ہیں کچھ لوگ

بانیِ فکرِ جدید، آذرِ طرزِ فردا
اِن ہی گمنام غریبوں میں نہاں ہیں کچھ لوگ

ہم سے شرحِ غم اندوہ عزیزاں مت پوچھ
محوِ تفسیرِ حدیثِ دیگراں ہیں کچھ لوگ

اِک نگاہِ غلط انداز سہی دیکھ تو لیں
آپ کے چاہنے والوں میں یہاں ہیں کچھ لوگ

زندگی، زندہ دلی، ذوقِ طلب، شوقِ عمل!
عہدِ پیری میں بھی اے زورؔ جواں ہیں کچھ لوگ

وقار خلیل

روشنی کی کتاب

(ادارۂ ادبیاتِ اردو کے جشنِ طلائی کے موقع پر)

شعور، آنکھ، نظر، سمت، زاویہ، منظر
وہ ایک مدرسۂ فکر و فن کہ اک معبد
جہاں شعور کی آنکھوں نے زندگی دیکھی
ہنر نے چشمِ تمنا کشا دے پیہم
ادب کو زیست کے اسرار سے نوازا ہے
نظر نے قیمتِ عرضِ ہنر کو جانا ہے
اور اپنی سمت کو منزل نما بنایا ہے
وہ ایک مدرسۂ فکر و فن کہ ہر منظر
شگفتہ کار و سرافراز و جہد ساماں ہے
پچاس سال کی تاریخ روشنی کی کتاب
ورق ورق مہ و مہتاب، لفظ لفظ گلاب
بساطِ گل پہ دھنک رنگ کہکشاں کی برات
ہو کوئی رُت، یہ دبستاں رہے بہار آثار
گزند اس کو نہ پہنچے کہ یہ امانت ہے
دکن کے سانولے لوگوں کی کج کلاہوں کی
ادب کی، علم کی، دانش کی شعر و حکمت کی
جنابِ زورؔ کی، مخدومؔ اور امجدؔ کی
یہ مدرسہ، یہ دبستاں یہ فکر و فن کا جہاں
دعا یہ ہے کہ مری عمر اس کو لگ جائے

محمد منظور احمد

نذرِ زورؔ

باعثِ روشنی کون؛ مکاں ہیں کچھ لوگ
لاکھ چھپنے پہ بھی، ہر وقت عیاں ہیں کچھ لوگ

تیرے دیوانے، غمِ ہر دو جہاں سے گزرے
اور ابھی محوِ سرِ سود و زیاں ہیں کچھ لوگ

کھوئے کھوئے سے ہیں، چہروں پہ سکوں طاری ہے
ایک تصویرِ غم و دردِ نہاں ہیں کچھ لوگ

خارزاروں سے بچائے ہوئے دامن اپنا
محوِ سیرِ گل و گلزارِ جہاں ہیں کچھ لوگ

سخت مشکل میں بھی، بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں
اپنی منزل کی طرف، ایسے رواں ہیں کچھ لوگ

تجھ کو چاہا ہے، بہر حال تجھے چاہا ہے
صرف اس بات پہ رسوائے جہاں ہیں کچھ لوگ

جہل و نفرت کی، عداوت کی فضا میں منظورؔ!
امن و بیداریٔ انساں کا نشاں ہیں کچھ لوگ

سراج حیدرآبادی

ڈاکٹر زورؔ کو ہم کیسے بھلائیں اے دوست!

جس کی تحقیق کا ہے دکنی ادب پر احساں
روحِ تنقید پہ اترا تی ہے خود اردو زباں
سامنے آنکھوں کے ہے اردو کا روشن ایوان
جس نے ترتیب دیا شاہ قطب کا دیوان
ڈاکٹر زورؔ کو ہم کیسے بھلائیں اے دوست!

یاد تھے جس کو قصوں کا رکئی زنجیر کے
کتنے گمنام ابھر آئے ہیں دھیرے دھیرے
تیغِ تحقیق سے تاریخ کے سینے چیر کے
گولکنڈے سے برآمد کئے اصلی ہیرے
ڈاکٹر زورؔ کو ہم کیسے بھلائیں اے دوست!

صلاحیتِ پنہاں سے لیا جس نے کام
جس نے زندہ کئے غواصی، نشاطی کے نام
جاری "سب رس" جو کیا اسمیں نہیں کوئی کلام
ملّا وجہی کو اسی پردے میں بخشا ہے دوام
ڈاکٹر زورؔ کو ہم کیسے بھلائیں اے دوست!

گردِ ماضی کی کہو کس کی مساعی سے دھلی
بند جو راہ تھی وہ کس کی تگ و دو سے کھلی
کس کی تحقیق و ترتیب جو اس سر میں تلی
منعقد کس نے کیا پہلے پہل یوم قلی
ڈاکٹر زورؔ کو ہم کیسے بھلائیں اے دوست!

شاہدِ علم بنا دے وہ اگر ڈالے نظر
نگۂ لطف سے بن جائے ادیب اکثر
زینتِ بزمِ ادب جس کی توجہ کا اثر
جی اٹھے ایک تبسم میں قتیلِ خنجر
ڈاکٹر زورؔ کو ہم کیسے بھلائیں اے دوست!

مادرِ جامعہ کی آنکھ نہ ہو کیوں پرنم
ایسے فرزندوں سے قائم ہے ابھی جس کا بھرم
گل بہت سے ہیں چمن ساز ارادے ہیں کم
تا بہ منزل نظر آتے ہیں وہی نقشِ قدم
ڈاکٹر زورؔ کو ہم کیسے بھلائیں اے دوست!

جس کی تنویرِ محبت بھی ضیا بخش سراج
جس کی تاثیر سے برہم تھا اندھیروں کا مزاج
نذر کرتی تھی زباں جس کو لطافت کا خراج
دھوم ہے اس گلِ نایاب کی کشمیر میں آج
ڈاکٹر زورؔ کو ہم کیسے بھلائیں اے دوست!

(یوم زورؔ کے ادبی اجلاس میں پڑھی گئی)

سیدہ طیبہ بیگم

ایک پیکر میں کئی ضم تھے خیالوں کے صنم

(خاکہ)

[خاکہ پیش کرنے سے پہلے اس کے متعلق کچھ بتانا ضروری سمجھتی ہوں۔ اس خاکے کا پس منظر چند وہ مضامین جو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے دوست اور شناساؤں نے زورؔ کے تعلق سے لکھے ہیں اور جن میں زورؔ کی زندگی کے بے شمار پہلو نظر آتے ہیں۔ میں نے ان چند کرم فرماؤں کے نام اس خاکے میں اس ڈھنگ سے شامل کئے ہیں کہ وہ خود اس خاکے کے کردار بن گئے ہیں اور ان کی اپنی زبان میں وہ زورؔ سے گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ چند ایسی خاموش ہستیاں بھی ہیں جن کا زورؔ کی زندگی اور ان کے کاموں میں بہت نمایاں حصہ رہا ہے۔ طوالت کے خیال سے زورؔ کی زندگی اور ان کے کردار کے بہت سے پہلو پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہوں۔ خاکہ ماہ و سال کی قید سے مبرا ہے۔

۱۹۵۷ء میں پاکستان میں میں ایک قدرتی اور ناگہانی حادثے اور المیہ کا شکار ہو گئی تھی۔ کم عمری میں ایسے حادثے بڑے جان لیوا ثابت ہوتے ہیں اور نہ مٹنے والے نقوش ذہن پر چھوڑ جاتے ہیں۔ زندگی نے مر مر کر جینا سکھایا۔ بقول کسی کے

ع زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

چنانچہ جب زورؔ صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی وہ پُرسے کو آئے۔ کچھ دن بعد اُن کا لکھا ہوا ایک خط ملا جس کو میں نے اس خاکے میں شامل کر لیا ہے۔

اس طرح زورؔ صاحب کو میں نے زندوں میں شمار کر لیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ زورؔ اب بھی زندہ ہیں۔ اس ایوان میں، اس کی ایک ایک اینٹ اور پتھر میں۔ اس کے گنج ہائے گراں مایہ میں۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ آج بھی وہ یہیں کہیں بیٹھے ہیں۔ ہم میں موجود ہیں مگر ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔

تین حصوں میں بٹے اس خاکے کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ زورؔ اپنی تمام تر صلاحیتوں اپنے کردار کے مختلف پہلوؤں اور بیل بوٹوں کے ساتھ ایک بار پھر جلوہ گر ہو جائیں اور ان کے

کارہائے نمایاں جو دھندلے نقوش بنتے جارہے ہیں ایک بار پھر ہمارے ذہنوں کے افق پر صبح صادق کی طرح طلوع ہوجائیں اور ہماری یادوں کے گلشن ان کی بھینی بھینی خوشبو سے معطر ہوجائیں ہے۔ س۔ ط۔ ب

گونجتا ہے آج بھی ایوانِ اردو یاد سے
تذکرہ کرتے ہیں جس کا ہم دلِ ناشاد سے (عزیز قریشی)

صبح ۹ بجے کا عمل ہوگا۔ سورج کی مدھم کرن دبے پاؤں ادارۂ ادبیات اردو کی عمارت میں داخل ہوئی تو اردو کے مسیحا، دکن کے عاشق اور گولکنڈہ کے ہیروں کے جوہری کو مصروف بہ عمل پائی۔ پاس میں کچھ تازہ قلمی کتابیں رکھی ہیں جن پر وہ نوٹ لکھتے جارہے ہیں۔ کچھ خطوط پڑے ہیں جن کے جواب اپنے ہاتھ سے دیتے جارہے ہیں۔ کچھ زیرِ اشاعت مضامین اور شائع ہونے والی کتابوں کے مسودے رکھے ہیں۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو اور اردو کی ترقی اور توسیع سے متعلق دانشوروں کی تجاویز پر بھی غور کر رہے ہیں۔

ادارہ کے چوکیدار نذیر الدین نے سلام کیا اور اپنے رشتہ دار کی سفارش چاہی۔ سفارشی خط لکھ رہے ہیں اور نذیر الدین سے احوال بھی سنتے جارہے ہیں۔ ایک وقت میں ایک ہی کام کرنا وہ تضیعِ اوقات سمجھتے ہیں۔

رفعت منزل سے ملازم چائے لے آیا اور ساتھ میں پان کی گلوریاں بھی۔ چائے پی رہے ہیں اور باتیں ہورہی ہیں۔ "ہاں میاں! آرام بے کاروں کے لیے ہے۔ انسان کی عمر تھوڑی ہے اور کام بہت کرنے ہیں" پان کی گلوری کو منہ میں رکھتے ہوئے بولے "یہ جو اردو زبان ہماری ہے نا۔ یہ غضب کی میٹھی اور بڑی ہی جان دار زبان ہے۔ دیکھو۔ یوں کرو۔ اردو پڑھنے لگو۔ اضلاع اور قصبات میں بھی ادارے کی ستر سے زیادہ شاخیں قائم ہوچکی ہیں اور اردو کی اشاعت کی غرض سے اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات کا سلسلہ شروع کردیا ہے۔ سررشتہ آبکاری اور افواجِ باقاعدہ کے درجۂ چہارم کے ملازموں کے لیے بھی اردو کے ابتدائی امتحانات لازمی کردئے گئے ہیں۔ تم بھی امتحان میں بیٹھ جاؤ۔ جو مدد چاہتے ہو کردوں گا۔ کب تک چوکیداری کرتے رہو گے۔ سوچ لو!"

پھر رائٹنگ پیڈ پر قلم چلنے لگا۔

عزیزہ طیبہ بیگم سلمہا

ایک خط سوڈان سے تمہارے نام آیا۔ دفتر میں اس خیال سے کہ شائد "سب رس" کا کاروباری خط ہے، کھول لیا گیا۔ یہ اس لیئے بھیج رہا ہوں کہ تم کو اپنی ایک قابلیت اور اہلیت کی یاددہانی ہو اور سچ تو یہ ہے کہ آج تم جس دور سے گزر رہی ہو۔ اس میں دل بہلائی کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ شاعری یا نثر نگاری شروع کردو۔ نظمیں لکھو یا افسانے لکھو یا مضامین اس طرح سے وقت بھی گزرے گا اور اپنی زبان کی خدمت بھی ہوگی اور تمہارے جذبات کو نکلنے اور ظاہر ہونے کا موقع ملے گا۔ کیا تعجب کہ اچھی ادیب شاعرہ بن جاؤ۔ مخلص

سید محی الدین قادری زورؔ

مورخہ ۲۰۔ ۷۔ ۵۷ء

لفافے میں رکھنے بھی نہ پائے تھے کہ آواز آئی۔

"قبلہ زورؔ صاحب! آپ پر خدا کی رحمت ہو"

پرانے رفیق نظر حیدرآبادی اسلام کرتے ہوئے داخل ہوئے ساتھ حبیب ابراہیم اور قاضی عیاذ انصاری بھی سلام کرتے ہوئے اندر آئے۔ "اخاہ نظر، آؤ آؤ بھئی۔ "سب رس" کے لیے کوئی تازہ چیز؟"

"ڈاکٹر صاحب! تازہ چیز حاضر ہے جو بہ یک وقت نوحۂ غم بھی ہے اور پیام عمل بھی اور اس "احساس پارے" کا مرکزی کردار خود آپ کی ذات ہے۔ آپ کی شخصیت ہے۔ کیا آپ اس کو سب رس میں شائع فرمائیں گے؟"

"نہیں میاں نہیں۔ کوئی کام کی چیز دو۔ میں نے کیا ہی کیا جو میرے متعلق کچھ لکھا جائے۔" "ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ یہ ڈھیروں تصانیف و تالیفات یہ ادارے کی شبانہ روز بے غرضانہ سعی و کاوش، یہ اردو کی ترویج و حفاظت کے سلسلے میں اردو امتحانات کا انعقاد۔ یہ دکن کے احساس کمتری میں مبتلا اہل قلم کی ہمت افزائیاں الخ"

"بس نظر بس! ایسی باتوں سے قوائے عمل مضمحل ہو جایا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وجد کا یہ مصرعہ پڑھ لیا کرو۔

؎ ہر بڑے کام کی تکمیل ہے خود اس کا صلہ

کر نفسی زور کی فطرت ہے۔ اعلیٰ ظرف اور بلند نظر رکھنے میں عمر بھر انسانی عظمت اور محنت کے قائل رہے۔ تصوّف اور عرفان کے خاندان سے تعلق نے انھیں ناامیدی نہیں سکھائی خودداری و خود اعتمادی نے کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہونے دیا۔ صاف دل اور صاف گو ہونے کی وجہ سے انسانوں کے ادنیٰ میلانات اور نفسانفسی، بغض و حسد سے مغموم ہوتے اور ان پر تنقید بھی کرتے مگر ہر بات کے بیان کرنے کا ایسا سلیقہ ہوتا کہ کسی موقع پر بھی تہذیب کے دائرے سے باہر نہ آتے۔ معترضین سے خفا نہیں ہوتے بلکہ ان کے دوست بن جاتے۔ بہ یک وقت زور ایک نقاد، محقق، مورخ، شاعر، افسانہ نگار، ماہر لسانیات اور صوتیات ہیں۔ جوہر شناس اور صاحب نظر ہیں۔ زندگی کے حسن میں لذت محسوس کرتے اور حسن الٰہی کی پرستش کرتے خلوص نیت اور عمل پیہم اور قوت بازو پر ایقان رکھتے۔

قاضی عیاذ انصاری نے کہا "محترم! آپ کی زندگی میں اردو "سب رس" اور "ادارۂ ادبیات اردو" ایسے گھل مل گئے ہیں کہ بقول شخصے آپ کی شخصیت خود ایک ادارہ بن گئی ہے" پہلو بدلتے ہوئے بولے "بھئی عیاذ! ادارۂ ادبیات اردو اور اس کی عمارت ایوان اردو تو میرے خوابوں کی تعبیر ہے۔ اور سب رس اردو کی آواز۔" کچھ وقفے کے بعد بولے "نظر! میں چاہتا ہوں کہ سب رس اتنا مقبول ہو اور اس کے پڑھنے والے اتنے ہوں کہ معمولی پڑھا لکھا پان والا بھی اسے شوق سے پڑھے اور اس کے ہاتھوں میں یہ رسالہ نظر آئے۔ لو بھئی پان کھاتے جاؤ" انھوں نے تینوں کو پان بڑھا کر کہا۔ "ہاں تو میں چاہتا ہوں کہ عام اردو پڑھنے والے اس سے استفادہ حاصل کریں۔ اس کی پذیرائی صرف کسی ایک حلقے ہی میں نہ ہو۔ میری خواہش ہے کہ دکنی نوجوان اردو میں مضامین، مقالے، نظمیں اور غزلیں لکھیں اور اردو ادب کو اپنے رشحات قلم سے مالامال کریں۔ ان سے احساس کمتری دور ہو جائے۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا" نظر نے یقین دلایا۔

سب رس کے لیے میں نے حمید الدین شاہد، صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش، معین الدین انصاری اور شعبۂ خواتین کے لیے سکینہ بیگم صاحبہ کو منتخب کیا ہے۔ ۱۹۲۸ء سے مجھے ان کا تعاون حاصل ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بچوں

سب رس" اور "سب رس معلومات" بھی نکالوں ۔ ب کے ایڈیٹر مختلف لیکن نگران ایک ہوگا۔ مجلسِ ادارت لتی رہے گی ـــــ"

"زورؔ صاحب! کام کرنے اور کام لینے کا سلیقہ ری آپ سے سیکھے" ۔ نظرؔ نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کی تصانیف ی جملہ تعداد کیا ہوگی قبلہ؟" حبیب ابراہیم نے ڈھیروں تابوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی۔ میرا کام لکھنا ہے اور بس۔ تعداد کسے اد ہے" پھر کچھ سوچ کر قہقہہ لگائے اور بولے میری تیز فتاری کے متعلق سنا ہے معین الدین قریشی نے کہا ہے میں رات کو مضامین سوچتا ہوں اور صبح تکیے کے نیچے سے مسودات برآمد ہوتے ہیں" بہت دیر تک محظوظ ہوتے رہے۔ پھر کہا۔ "دیکھو! وہاں میری نئی کتاب کا پروف رکھا ہے۔ شروع کے صفحات پر میری تصنیفات کی فہرست فن واری دی گئی ہے۔ گن لو" ـــــ

پھر بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے ـــ "میں سوچتا ہوں کہ "سب رس" ہندی میں بھی نکالوں۔ زبان اردو ہی رہے لیکن اس کو دیوناگری رسم الخط میں چھاپیں اس سے بدلے ہوئے حالات میں اردو زبان اور ادب کی بڑی خدمت ہو سکے گی اور اردو ادب ان لوگوں تک پہنچ سکے گا جو اردو نہیں جانتے مگر دلچسپی رکھتے ہیں" نبض شناس زورؔ اردو کا روشن مستقبل ڈھونڈنے لگے۔

"مجھے جہاں تک یاد ہے۔ آپ نے دکنی شاعروں کے کلام کو ہندی رسم الخط میں شائع بھی کروایا ہے" نظرؔ نے یاد دلایا۔

انہوں نے سر ہلا کر کہا" احمد الدین احمد سے ملاقات ہوئی تھی بھئی وہ تو اپنی تحریروں کو دبائے رکھتا ہے۔ میرا تو نظریہ یہ ہے کہ ادبی کاوشوں کو ضرور منظرِ عام پر آنا چاہیے۔ ان پر قید و بند کی مصیبت نازل کرنا ایک قسم کا گناہ ہے۔ میں تو کم از کم ایسا نہیں کر سکتا اور نہ کروں گا۔ میں تو ہر اس چیز کو کھود نکالوں گا جو قابلِ اشاعت ہو اور اس کو ساری دنیا کے سامنے لاؤں گا۔ بھئی یہ ادارہ اسی مقصد سے قائم کیا ہے کہ حیدرآباد اور جنوبی ہند میں اردو کا ذوق عام کیا جائے۔ دکن کے شاعر اور اردو ادیب اردو دنیا میں روشناس ہوں اور انہیں اُن کا جائز حق ملے۔ نوجوانو میں خود اعتمادی اور شگفتگی پیدا کی جائے جس کے بغیر شعر و ادب کی ترقی ممکن نہیں ـــــ" پھر ایوان کی چھت کی طرف نظر کرتے ہوئے بولے ایوانِ اردو سے اردو کا نام زندہ رہے اور اس کے کام کو قیام و دوام حاصل رہے" "انشاءاللہ" عیاذ انصاری نے عقیدت سے کہا۔

"منشی تلوک چند محرومؔ نے سچ کہا ہے

ع بنا کر زورؔ نے ایوانِ اردو
بڑھا دی ملک بھر میں شانِ اردو

حبیب ابراہیم نے اٹھتے ہوئے کہا "آپ اجازت دیجیے پھر حاضر ہوں گے۔ آپ ٹھیرے مصروف آدمی۔ آپ کے کام میں مخل ہونا مناسب نہیں سمجھتا"۔ کہتے ہوئے نظرؔ نے مصافحہ کیا۔ عیاذ اور حبیب ابراہیم نے بھی مصافحہ کیا اور تینوں رخصت ہوئے۔

دکن دیس، اور دکنی زبان کے دلدادہ ادارے سے گھر آئے۔ سگھڑ اور سلیقہ مند شریکِ حیات تہنیت النساء نے شوہر کے ناشتے کا انتظام کیا۔ زورؔ نے لاڈ سے لاڈلیوں کو آواز لگائی ـــــ کھانے کے آداب بتائے۔

اخلاق پر لکچر دیا اور کہا ـــ "جس کسی نے ناخن نہیں کاٹے ہیں وہ میرے پاس آجائے۔ میں کاٹ دوں گا۔ اور ہاں "صفائی" پر ایک صفحہ کا مضمون لکھ کر مجھے بتلائے" پھر بڑے بیٹے تقی الدین کو درگاہ حضرتِ زعم کے متعلق مناسب ہدایات دے کر اپنے دیوان خانے میں آ گئے۔

ایک خوش باش ہنس مکھ، بذلہ سنج، ملنسار، پاک طینت، مہمان نواز زورؔ اپنے تخت پر براجمان ہو گئے۔ پاندان سے پان بنا کر کھانے لگے۔

ملازم نے علامہ حیرتؔ بدایونی کے آنے کی اطلاع دی تو تخت سے اتر کر دروازے تک آئے۔ حیرتؔ بدایونی اپنے بیٹے احمد جلیس کے ساتھ اندر آئے۔ دونوں بغلگیر ہو گئے۔ برسوں کی رفاقت اور دوستی ہے۔ آپس میں طنزیہ مزاحیہ جملے اور فقرہ بازی ہونے لگی۔ پھر حیرتؔ نے کہا ـــ

یہ جو تمہارا شاگرد ہے نا جلیس۔ یہ کہتا ہے کہ تم ان یادگارِ زمانہ استادوں میں سے ہو جو طالب علموں کو پورے خلوص سے اپنا علم ہی نہیں بخشتے بلکہ اپنی شخصیت، کردار اور اخلاق کے گہرے نقوش ان کے دلوں پر چھوڑ جاتے ہو"

زورؔ ہر طالب علم اور شاگرد کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتے۔ سراپا شفقت بن کر وہ احمد جلیس کے قریب آئے اور بڑی گرم جوشی سے گلے لگا کر کہا ـــ

"تم ہی نے تو کہا تھا نا کہ بہت سے لوگ قہقہہ کو خہخہ، قینچی کو خینچی کہیں گے لیکن خمیر کو قمیر ـــ یعنی خ اور ق کا تلفظ تو ممکن ہے لیکن غلط جگہ پر ـــ"

"جی جناب! اور آپ نے کہا تھا کہ ہمارے حیدرآباد میں لوگ کھٹا اور مرچ زیادہ کھاتے ہیں اس لیے ق کی آواز حلق سے نہیں نکلتی"

احمد جلیس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے خوب قہقہے لگاتے رہے اور دیوان خانہ زعفران زار بن گیا۔ اس پُرلطف محفل میں دھیرے دھیرے شریک ہوتے گئے مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، یٰسین علی خاں، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، نصیر الدین ہاشمی، حمید الدین شاہدؔ، معین الدین انصاری، محمد اکبر الدین صدیقی، محمود عبد القدیر، پنڈت دتاتریہ کیفیؔ (؟) دھر دیا التکار، میر حسن، عبد القادر سروری، رمن راج سکسینہ، مخدومؔ، میکشؔ، وجدؔ، عبد المجید صدیقی، سید محمد ـــ اور چائے کے دور چلنے لگے، گلوریاں گھومنے لگیں ـــ ساتھ ساتھ لطیفے اور چٹکلے ہو رہے ہیں خوش گوار تنقیدیں ہو رہی ہیں ـــ ملکے پھلکے موضوع پر بحث ہو رہی ہے۔ نوجوانوں کی بدتمیزی، آداب سے ناواقفیت پر وعظ ہو رہا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قصے اور انوار العلوم کالج کی باتیں ہو رہی ہیں۔ مخدومؔ و میکشؔ و وجدؔ کے کلام کو سراہ رہے ہیں۔ دکن کی نسوانی دنیا پر نصیر الدین ہاشمی کو مبارک باد دے رہے ہیں۔ حمید الدین شاہدؔ کی تعریف کر رہے ہیں۔ زندہ دلوں میں زندگی کی حرارت ہے اور قہقہوں سے ماحول پر ہنسی طاری ہے۔ مرتبہ اور منصب کی درجہ بندی سے بالاتر ہو کر علم و ادب کے پروانوں میں مانندِ شمع لپک رہے ہیں۔ بھڑک رہے ہیں اور اطراف و اکناف میں ضیا پاشی کر رہے ہیں۔ اللہ اللہ! کیسی ستھری محفل ہے۔ کیسا اعلیٰ ذوق ہے، کیسا استاد ہے اور کیسے شاگرد ہیں ـــ

"مجسم شعر بن جاتی ہے دنیا کیف مبہم سے۔
میرے اشعار کو جب ناتمے وہ گنگناتے ہیں

"میکش نے گنگنایا "بکھری ہوئی رنگین کرنوں کو آنکھوں سے چن کر لاتا ہوں۔

فطرت کے پریشان نغموں سے پھر اپنا گیت بناتا ہوں" مخدوم جھوم کر پڑھے

"تو نقشِ آرزو ہے مجسم زمین پر
آنکھوں نے تیرے حسن کی مے پی ہے مدتوں

اک سرخوشی ہے قلب میں سرشار ہے نظر
بیٹھا ہوں پائے وقت کی آہٹ سے بےخبر"

وحید کو وجد آگیا

"اب آپ بھی کچھ سنا دیجئے زور صاحب"

ہندر سنگھ بیدی سحر نے فرمائش کی۔

"بھئی میرے اشعار میں مجھے خامیاں نظر آتی ہیں اس لیے میں نے کہنا چھوڑ دیا ہے۔ اشعار ہوں تو بہت اچھے۔ بے جا روایت پرستی اور گھسے پٹے موضوعات سے دامن بچاتا ہوں ـــــ اور پھر ایامِ شباب کی باتیں ہی اور ہیں"

محمود عبدالقدیر نے مسکراتے ہوئے کہا "بارہ دری چندو لال کا طرحی مشاعرہ تو جناب والا کو یاد ہوگا جس میں طرحی مصرع تھا

"جس گھر میں پھوٹ ہوگی وہ گھر خراب ہوگا"

اور جناب کا شعر ہوا تھا ـــــ

"اپنے کئے پہ ظالم کیوں اس قدر ہے نازاں
ہم کو خراب کر کے تو بھی خراب ہوگا"

زور دار قہقہے کے درمیان زور کہنے لگے۔

"ہاں اور آپ کا شعر بھی یاد ہے

"ان بے وفائیوں کو کیا گن سکے گا کوئی
تیرا حساب ظالم، یوم الحساب ہوگا"

"اوہ اللہ اکبر اور شور و شغب کے درمیان ہم مشاعرہ سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے" پرانی یادوں پر دیر تک ہنستے رہے۔ جب قہقہوں کا سمندر تھما تو نارنگ نے کہا "ایک غزل ہو جائے زور صاحب! مدت ہوئی ہے آپ سے غزل سنے ہوئے" "کس کی سنئے گا۔ وجہی، غواصی، نصرتی یا قلی قطب شاہ کی ـــــ؟"

"جناب والا۔ اپنا ہی کلام سنائیے"

گلوری منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ شعر گوئی کا پرانا ذوق کبھی کبھی تازہ ہو جاتا ہے۔ ارشاد کیا ہے۔

ہم اپنی گرمئی سوزِ دروں سے چیخ اٹھے
خوشا کہ مستئ فیضِ جنوں سے چیخ اٹھے

ذرا سی بات سے سارے جہاں میں دھوم مچی
جو کم سوادئ صبر و سکوں سے چیخ اٹھے

بہ پاسِ خاطرِ جاناں خموش بیٹھے تھے
مگر خرابئ بازئ خوں سے چیخ اٹھے

(۲)

شام کا وقت ہے۔ زور صاحب ڈھیلی ڈھالی چیک ڈزائن کی شروانی، ڈھیلا پاجامہ، پاؤں میں سلیپر، بڑے بڑے منتشر بال اور ننگے سر پان کھاتے بیٹھے ہیں۔ موٹر کی آواز سن کر باہر ورانڈے میں آئے۔ پان چباتے ہوئے سیدھے ہاتھ کی چھنگلی سے ہونٹوں کے دونوں گوشوں کو پونچھتے نوکر کو ہدایت دیتے سیڑھیاں اترنے لگے۔

"میں کئی روز سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ سید بادشاہ حسینی صاحب آئے ہوئے ہیں"۔

"بھئی معافی چاہتا ہوں۔ اس سے قبل نہ آسکا دراصل......"

سنی ان سنی کرکے زورؔ نے کہا "آئیے میں آپ کو پہلے "ایوان اردو" کی نئی عمارت دکھا دوں۔ ابتدا سے تو آپ واقف ہیں اب چل کر دیکھیے خواب کی تعبیر"

"چشم بددور زورؔ صاحب! آپ تو بالکل نہیں بدلے چہرہ مہرہ، چال ڈھال، بول چال، وضع قطع سب وہی بارہ سال والی ہے۔"

زورؔ نے ایک دھماکے دار قہقہہ لگا کر کہا "بھئی واہ! آپ بوڑھے ہو رہے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ سبھی بوڑھے ہو جائیں گے۔"

"میں نے سنا تھا کہ پرخلوص کارکن بوڑھے نہیں ہوتے۔ آج اس کی تصدیق ہو گئی۔ کیا کرتے رہتے ہو؟"

"رات دن دماغی کاموں میں مصروف رہتا ہوں جسمانی محنت و مشقت کی طرف توجہ نہیں جاتی۔ بس کبھی کبھار باغبانی سے شوق کر لیتا ہوں یا تھوڑی سی چہل قدمی۔ صبح شام دو وقت تفریح کے ہوتے ہیں ان اوقات میں پڑھنے لکھنے یا ادارہ کے کام کاج میں مصروف رہتا ہوں۔ کبھی یاروں کی محفل جم جاتی ہے۔ اردو کی بقا اور ترقی کی فکر رہتی ہے۔"

"ڈاکٹر زورؔ، ادارہ ادبیات اردو اور ایوان اردو ایک ہی شخصیت کے تین روپ ہیں۔ زور صاحب! بادشاہ نے زورؔ کی کوششوں سے متاثر ہوتے ہوئے کہا

چلتے چلتے زورؔ نے اپنے دیارِ آرزو کے متعلق تفصیلات بتائیں۔

"جناب حسینی صاحب! اردو زبان کی طرح اس ایوان میں بھی مختلف قوموں، مذہبوں اور کلچروں کی محمود خصوصیات کے خوش گوار امتزاج کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس گہوارۂ علم و ادب کا نام "ایوانِ اردو" دراصل خواجہ حسن نظامی دہلوی نے تجویز کیا تھا۔ جناب فیاض الدین نظامی نے اُسے شکل و صورت بخشی ہے۔ ایوانِ اردو کی عمارت کے لیے میری شریک حیات تہنیت النساء نے اپنی زمین دے دی۔ نواب زین یار جنگ نے بہت دلچسپی لی اور ان کی اپیل کی وجہ سے ۲۵ ہزار روپے کی رقم وصول ہوی۔ ۱۹۵۵ء میں حضرت امجدؔ کی دعاؤں کے ساتھ ڈاکٹر بی رام کشن راؤ چیف منسٹر کے ہاتھوں عمارت کی سنگ بنیاد رکھوائی اور مرزا اضامن علی بیگ گتہ دار نے تعمیر کا کام شروع کیا۔

مولانا آزاد نے حکومت ہند سے مزید ۲۵ ہزار کا عطیہ دلوایا۔ نواب مہدی نواز جنگ نے سالار جنگ اسٹیٹ سے رقم دلوائی۔ نظام سابع کے چیارٹی ٹرسٹ اور مختلف چھوٹے بڑے عطیوں کے ساتھ عمارت کا کام شروع ہوا۔ لیکن رقم ناکافی ثابت ہوی۔ چناں چہ بخشی غلام محمد وزیر اعظم کشمیر سے مدد مانگی اور انھوں نے بہ خوشی امداد دی۔ پھر حکومت آندھرا پردیش نے دستگیری کی اور ہمایوں کبیر اور ڈاکٹر گوپال ریڈی نے حکومت ہند سے مزید رقم دلوائی۔ لگ بھگ ½ ۱ روپے کی لاگت سے یہ عمارت کھڑی ہو گئی۔ اور بخشی غلام محمد نے اس کا افتتاح کیا۔

آئیے ادھر چلیے۔ یہ تاریخی میوزیم ایک اہم شعبہ ہے۔ ایوانِ اردو کا بڑا حصہ تاریخ اور آثار و ثقافت کے لیے وقف ہے۔ صدیوں پرانے سکّے، فرمان، کتبوں اور تحریروں کے علاوہ قدیم نقاشی کے نمونے ظروف اور

اسلحہ کا شاندار ذخیرہ ہے جس سے اُس زمانے کی دکھنی تہذیب اور تاریخ کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں مشاہیر کے اصلی خطوط، اُن کے علمی و ادبی آثار اور تصاویر، گولکنڈہ، بیجاپور، اورنگ آباد اور بیدر کے ثقافتی شہہ کار، فرمان، کتبے اور نقاشوں کے اتنے نمونے جمع کئے ہیں کہ ادارہ اس پر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔ اس میوزیم کے اکثر نوادر جیسے ہتیار، مواہیر، ظروف اور مخطوطات نواب عنایت جنگ کا عطیہ ہیں۔ ان کے علاوہ مہندر راج سکسینہ، یٰسین علی خاں، محترمہ سکینہ بیگم، محترمہ رابعہ بیگم، مولوی احمد اللہ خاں، ملا عبدالباسط، پروفیسر سید محمد اور محمد حسین جعفری مرحوم کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں۔ جنھوں نے ایوان کے سجانے میں میری مدد کی۔

"مرحبا زورؔ صاحب! آپ نے صدیوں پرانی تاریخ کو گمنامی سے نکال کر حیاتِ جاوید بخشی ہے۔"

ایک گھنٹے تک عمارت اور اس کے نوادرات دکھاتے رہے۔ ملا وجہی کے اشعار جو کتبے کی صورت میں نقش کئے ہیں پڑھ کر سنایا اور سراہا۔

مخطوطات اور مطبوعات کا کتب خانہ ۲۵ ہزار مطبوعہ کتابیں اور ۵ ہزار سے زائد قلمی نوادر پر مشتمل ہے۔ دکھنی زبان اور ادب کا تحفظ اور اس کے وقار کی پاسداری ہمیشہ ادارے کا بنیادی مقصد رہا ہے اور رہے گا۔ خدا کی مدد شاملِ حال ہو تو مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور اردو انسائیکلو پیڈیا کا کام بھی عنقریب پورا ہو جائے گا۔"

یہ کہتے کہتے ان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ اپنے جذبات چھپانا نہیں جانتے تھے۔ بادشاہ حسینی نے خوش ہو کر کہا "ہم نے تو قارون کا خزانہ سنا تھا لیکن ایسے گنجینۂ ادب کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے جو کام کیا ہے زورؔ صاحب زمانہ اُسے کبھی بھول نہیں سکے گا۔ انسان گزر جاتے ہیں مگر ان کی خوبیاں اور فضیلت باقی رہ جاتی ہیں۔ ایوانِ اردو کو آپ نے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ اس کے ایک ایک پتھر سے آپ کے صبر و برداشت اور عزم و استقلال کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی ایک ایک اینٹ سے دکن کی محبت اور دکنی تہذیب و تمدن اور روایات سے آپ کی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے میں تو کہوں گا کہ ایوان آپ کے دل کی دھڑکن ہے۔ خدا اس دھڑکن کو سلامت رکھے۔"

"مجھے اپنی محنت کا صلہ مل گیا ہے" زورؔ نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا "چائے آپ کا انتظار کر رہی ہے چلئے گھر چلیں۔"

(۳)

پولیس ایکشن کے بعد مملکت آصفیہ حیدرآباد دکن کا زوال شروع ہونے لگا۔ سیاسی چال بازیوں کے سبب بھرے بازار میں عوام کی منظورِ نظر، خواص کی محبوب و دلبر، محبت و اخوت کا سرچشمہ اردو جو مظہرِ انسانیت اور مجسم پیار تھی، لُٹنے لگی۔ جس اردو نے غریبوں کی جھونپڑیوں سے لے کر شاہی محلوں میں حکمرانی کی تھی، جس کی گھٹی میں لذت و شیرینی اور بانکپن تھی اور جو ہر خاص و عام کے جسم و جان کی حرارت اور زندگی بن گئی تھی ـــ خود اس کی زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ گنگا جمنی تہذیب اور شائستگی کا نام و نشان سیاہ پوش ہونے لگی ـــ عاشقوں نے جگر تھام لیا، ماحول حوصلہ شکن تھا ـــ ہر طرف مایوسی پھیلنے لگی۔ شکووں نے سر اٹھایا، قومی اور لسانی یکجہتی لرزنے لگی۔ حیدرآباد جہاں عروسِ اردو سج دھج کر جلوہ گر

رہتی تھی، اسی صحن میں اس کی چوڑیاں توڑ دی گئیں۔ اس کے گیسو بکھر گئے ـــــ آنکھیں جن میں ہندو مسلم سکھ عیسائیوں کا بسیرا تھا، اندھی ہو گئیں ـــــ گل و گلزار جیسی دھرتی اس کے لیے خار دار بن گئی ـــــ گھر سے بے گھر ہو کر بے یار و مددگار وہ بھٹکنے لگی ـــــ ایسے میں دکن کے ایک دیوانے نے اس کے آنسو پونچھے اور دامن تھام لیا۔ اس کے کھوئے ہوئے وقار کو لوٹانے کی قسم کھائی ـــــ یہ ایک قسم ہزار قسموں میں بدل گئی ـــــ ایک قدم کے ساتھ ہزاروں قدم مل گئے اور

وہ اکیلے ہی چلے تھے جانبِ منزل مگر
راہ رَو ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اور پھیلتا گیا اور بقول اقبال

نظر بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

ڈاکٹر زورؔ جیسے میرِ کارواں کے لیے جو بلند نظر، شیریں سخن اور پُر خلوص دل کے مالک ہیں، یہ سفر مشکل نہیں ہے۔ بلند حوصلگی کے ساتھ انھوں نے یاس کو آس میں بدل ڈالا۔ مُردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑائی ـــــ اور حیدرآباد کی تہذیب اور عوام کی زبانِ اردو دونوں پر منڈلاتے بادل چھٹ گئے ـــــ اردو نے نئے سرے سے انگڑائی لی اور دیوانوں نے بڑھ کر، جھوم کر اسے سنوارا، سجایا اور اس کے ایوان میں اسے بٹھا کر جشن منایا ـــــ

پھر وہ وقت آیا جب حکومتِ حیدرآباد نے آندھرا پردیش کا روپ دھارا۔ لسانی بنیادوں پر حیدرآباد تین حصّوں میں بٹ گیا۔ رائچور، گلبرگہ اور بیدر کرناٹک سے ملے۔ اورنگ آباد، پربھنی، ناندیڑ، بیڑ اور عثمان آباد مہاراشٹرا کے حصّے میں آئے۔ جہاں کنڑی اور مرہٹی زبانوں کا چلن ہوا۔ ورنگل، محبوب نگر، نلگنڈہ، نظام آباد، عادل آباد، میدک وغیرہ باقی ماندہ اضلاع آندھرا پردیش میں ضم ہوئے اور حیدرآباد اس کا دارالسلطنت مقرر ہوا۔ تلگو اس کی زبان قرار پائی۔ اردو کا کوئی علاقہ نہ رہا۔ یہ بات سوہانِ روح تھی۔ بے چینی پھیلی، بددلی بڑھی۔ دوست احباب زورؔ صاحب کے پاس آئے۔ زورؔ صاحب نے سمجھایا ـــــ "بھئی یہ نئی تقسیم نہیں ہے۔ بالکل اصولی ہے" کسی نے اعتراض کیا ـــــ "آپ ماہر لسانیات ہیں۔ داد نہ دیں گے تو کون دے گا" زورؔ نے کہا ـــــ "دیکھو یہ طنز صحیح نہیں ہے۔ اگر تمہیں تاریخ سے واقفیت ہو تو یہ بھی یاد ہوگا کہ محمد قلی قطب شاہ کی سلطنت کے حدود یہی تھے اور موجودہ آندھرا پردیش کا پورا علاقہ اس کے زیرِ نگیں تھا۔ آج لسانی بنیادوں پر تقسیم میں اسی کی روح کارفرما ہے"

پھر گمبھیر فضا کو دور کرنے کے لیے مسکرائے اور کہا "چلو آؤ اس کا عرس منائیں۔ قلی قطب کی جئے ہو"

چناں چہ یومِ محمد قلی قطب شاہ ہر سال ایک قومی اور سماجی تہوار منانے کا منصوبہ تیار ہوا تاکہ قطب شاہی دور کی مشترکہ تہذیب کی یاد تازہ ہو اور ہندو مسلمانوں کو یہ معلوم ہو کہ وہ خلوص و محبت کے ایسے رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں کہ حوادثِ زمانہ بھی ان کو توڑ نہیں سکتے۔ زورؔ نے سب کو مخاطب کیا ـــــ "باہمی میل جول، محبت و رواداری، شرافت اور اخلاق کی جو قدریں محمد قلی قطب شاہ کے دور سے اس ملک کے رہنے والوں کی رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے وہ سیاست کی پیداوار

نظروں اور سماج کے بگڑے ہوئے تیوروں کے باعث رفتہ رفتہ دھندلے پڑ سکتے ہیں مگر ملیا میٹ نہیں ہو سکتے۔ قدیم قدروں اور قیمتوں میں تبدیلی ہو رہی ہے اور ہوتی جائے گی۔ کوشش یہ کرنی ہے کہ جو اعلیٰ قدریں ہمیں وراثت میں ملی ہیں ان کو باقی رکھیں اور شہر کے مستقبل کو سنوارنے میں کام لیں — حیدرآباد کی زندگی اور زندہ دلی مشترکہ تہذیب اور رواداری کی روایتیں تازہ کرتے جائیں ——"

اور پھر تن من دھن سے زورؔ انتظامات میں لگ گئے۔ دوست احباب طلبا رشاگرد پروفیسر سید محمد، میر حسن، حمید الدین شاہدؔ، نصیر الدین ہاشمی، میکش، مخدوم، عبد المجید صدیقی، اکبر الدین صدیقی، رحیم الدین کمال سبھی اردو والوں نے اپنی اپنی خدمات پیش کیں اور ان کی صلاحیتوں کے مطابق ان میں کام تقسیم ہوئے —

زورؔ نے تجویز رکھی —— "نوبت نقارے ہوں گے۔ نشان کا ہاتھی ہوگا نقیب و چوب دار ہوں گے۔ پھر پالکی نالکی، میانہ ہوا دار، رتھ توپچہ اور بنڈیاں ہوں گی۔ محمد قلی کی سواری گولکنڈے سے چار مینار تک جس تزک و احتشام اور لوازمات شاہی کے ساتھ جایا کرتی تھی، اسی شان و شوکت سے پورے اہتمام کے ساتھ ایک جلوس نکالا جائے گا۔ اس کے لیے ہاتھی گھوڑے، لاؤ لشکر، سپاہی چوب دار، نیزے بھالے ڈھال تلوار، ہودا عماری، ماہی مراتب، زربفت لباس، عطر و گل، عود و لوبان غرض وہ سارے لوازمات جو اس سواری کی زیب و زینت اور شان و شوکت کے لیے ضروری ہوں گے فراہم کئے جائیں گے۔"

دیکھتے دیکھتے ہدایتوں پر عمل ہونے لگا۔ گورنر بھیم سین سچر سے کہا —

"قلی قطب شاہ کے گنبد پر جلسہ ہوگا۔ آپ صدارت کریں گے۔"

میر بلدا اور وزرا سے کہا — "آپ لوگ جلوس کی قیادت کریں گے۔" پھر گولکنڈہ قلعہ کا چپہ چپہ عوام کو دکھانے کے لیے گائیڈز مقرر کئے۔ پروفیسر عبد المجید صدیقی نے تاریخی پس منظر کے لکچر دیے۔ ادبی حالات پر زورؔ نے روشنی ڈالی۔

قطب شاہوں کے زوال اور گولکنڈہ کی تباہی کو ۲½ سو سال سے زیادہ ہو گئے لیکن اب بھی اس کی عظمت کے نشان موجود ہیں۔

ہے خزاں کی وحشتوں میں نیم جاں موجِ بہار
چپہ چپہ پر ہیں تہذیب و تمدن کے مزار
(میکش)

آئیے! اب ہم گولکنڈہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس فلک بوس بالا حصار کی چوٹی پر جو دو منزلہ عمارت نظر آ رہی ہے وہ "تانا شاہ گدی" کہلاتی ہے۔

قطب شاہوں کی ہے عظمت کا نشاں بالا حصار
جس کی رفعت میں نظر آتا ہے ماضی کا وقار
(میکش)

سلطان محمد قلی اور تانا شاہ کی نظروں میں مسلمان ہندو شیعہ و سنی شانہ سے شانہ برابر تھے کہ وہ ایسی جگہ سے دیکھنے کے عادی تھے جہاں پستی اور بلندی، نشیب و فراز یکساں نظر آتے تھے۔

بالا حصار کی ان سیڑھیوں کے دونوں جانب مسجدوں اور مندروں کا سلسلہ قطب شاہوں کی مذہبی رواداری اور قومی یکجہتی کا بہترین ثبوت ہے۔

مسجدوں پر اب بھی ہے چھایا ہوا ذوقِ نیاز
پڑ رہی ہیں جن میں آ کر خلد سے حوریں نماز
(ڈیکش)

بالاحصار کی سیدھی جانب نگینہ باغ ہے جہاں وفادار عبدالرزاق لاری زخموں سے چُور پڑا پایا گیا۔

گر کے بھی کھوئی نہیں ہے اس نے اپنی آرزو
اس کی نبضوں میں رواں ہے جاں نثاروں کا لہو (ڈیکش)

بائیں جانب شاہی محلات ہیں۔ یہ ابراہیم قلی قطب شاہ کا محل ہے۔ محمد قلی قطب شاہ یہاں پیدا ہوئے تھے۔ تسخیر گولکنڈہ کے بعد مغلیہ فوجوں کا گولہ یہیں گرا تھا۔ محلات کے بیرونی صحن میں وہ حوض نما باؤلی ہے جہاں تاناشاہ کی گرفتاری کے بعد اورنگ زیب کے سپاہیوں سے بچنے کے لیے شاہی حرم کی عفت مآب عورتوں نے خودکشی کر لی تھی ـــــ

خاک کے ڈھیروں میں گنجِ سیم و زر مدفون ہے
بے گناہوں کی شکستہ حسرتوں کا خون ہے

وہ دور ـــــ برج نما عمارتیں حبشی سپاہیوں کی نشست گاہ تھیں (ڈیکشن)۔ اس کے اوپر نقارخانہ جس کی بائیں جانب شاہی جھروکے ہیں جہاں سے بادشاہ فوجوں کی سلامی لیتے تھے۔ یہ کاغذی برج ہے۔ وہ موسیٰ برج ہے۔ وہ بُرجی برج جہاں تاناشاہ کے وزیر اکنا اور مادنا رہتے تھے۔ یہ عاشور خانے کی عمارت ہے۔ یہ مسجد صفا جہاں سلطان قلی قطب شاہ حالت نماز میں شہید کر دئے گئے تھے۔

جس کے دل میں درد ہے وہ موت سے ڈرتا نہیں
زندۂ جاوید مرتا ہے مگر مرتا نہیں

(ڈیکشن) بھاگ متی وہاں رہتی تھی اور اس دیول میں پوجا کرتی تھی۔ محمد قلی اس مسجد میں نماز پڑھتے تھے ـــــ

. . . .

فرقِ رنگ و نسل تھا جس کی رواداری سے دور
جس کی فطرت میں نہیں تھا کج کلاہی کا غرور (ڈیکش)

یہ بارہ دری ہے جہاں دُور دُور تک حوض بنے ہیں سرسبز و شاداب باغوں میں بادشاہ تفریح کیا کرتے تھے۔ لیکن آج حوض ہیں بے آب، پانی کی روانی رُک گئی

آہ کس مرکز پہ چشمہ نوجوانی رُک گئی (ڈیکش)

ایک ایک اینٹ کی تاریخ قطب شاہ سے تاناشاہ تک دہرائی گئی۔

اب بھی آتی ہے رواداری کی ہم کو بو یہاں
آئیں گے اکثر دکن کے مسلم و ہندو یہاں (ڈیکش)

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ اُمت بھولنے والی نہیں

یوم قلی بے انتہا کامیاب رہا۔ دکنیوں کی زندگی میں تازگی اور حرارت پیدا ہوئی۔ دلوں قلی قطب شاہ کے نام کے ساتھ ڈاکٹر زورؔ کا نام وردِ زبان رہا۔ گولکنڈہ کے کھنڈر آباد ہوئے۔ اس کی تہذیب زندہ ہوئی۔ محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کا پیار جاگا ـــــ یوم قلی صرف ایک تفریحی میلہ نہیں بلکہ قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی تقریب بنی۔ دکنیوں نے جان لیا کہ ڈاکٹر زورؔ گولکنڈے کے مؤرخ، قطب شاہوں کے عاشق، دکن کے لائق فخر فرزند اور غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ زورؔ نے اہلِ دکن کو یہ بھی بتا دیا کہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ولی اورنگ آبادی نہیں بلکہ یہی قطب شاہی فرمانروا محمد قلی قطب شاہ ہے۔ اور جب تک گولکنڈے کی تاریخ زندہ رہے گی اردو زبان بھی پائندہ رہے گی۔

ڈاکٹر زورؔ کی کامیابیاں اور کامرانیاں قدم قدم پہ دشمنوں کو جنم دیتی رہیں مگر ان کے عزم اور تحمل اور بُردباری

(باقی ص ـــــ پر دیکھئے)

وقار خلیل

سب رس کی کہانی

۵ / جنوری ۱۹۳۱ء کو برصغیر کا مقبول ریسرچ سنٹر ادارۂ ادبیاتِ اردو "افقِ ادب" پر جلوہ گر ہوا۔ مدینہ ادب حیدرآباد کو اردو دنیا دکا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ قطب شاہی اور آصفجاہی حکمرانوں نے اردوئے قدیم (دکنی) سے اردوئے جدید (آج کی اردو) تک زبان و ادب کی فیاضانہ سرپرستی کو روا رکھا جس کے نتیجے میں "جامعہ عثمانیہ" ایسی اردو ذریعہ تعلیم کی یونیورسٹی کا تجربہ کامیاب ہوا۔ اسی جامعہ کے باکمال فرزندوں نے جن کے میر کارواں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ تھے۔ دکن اور دکنیوں کی تخلیقی اور تحقیقی، تنقیدی اور شعری صلاحیتوں کی نشو و نما کے لیے ادارۂ ادبیاتِ اردو قائم کیا اور اس ادارہ کا ماہانہ ترجمان "سب رس" جنوری ۱۹۳۸ء سے شائع ہونے لگا۔ ڈاکٹر زورؔ معتمد عمومی ادارۂ ادبیات اردو جو اس زمانے میں جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر کے عہدہ پر فائز تھے۔ سب رس کے نگران مقرر ہوئے اور دکن کے باکمال ذہین و فطین شاعر، ادیب، افسانہ و ڈرامہ نویس صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکشؔ کو سب رس کی ادارت کے فرائض سونپے گئے۔ جناب خواجہ حمید الدین شاہد مہتمم ادارہ نے میکشؔ کو اپنے بھرپور تعاون سے نوازا۔ "سب رس" اپنے دور کے معاصرین میں برصغیر کا وقیع علمی، اور دکنی شعر و ادب کا ترجمان رہا اور خدا کے فضل و کرم سے آج بھی اس کی یہی شان باوجود ناسازگار حالات قائم تو ہے۔

سب رس جنوری ۱۹۳۸ء کے پہلے شمارہ کا اداریہ ڈاکٹر زورؔ نے تحریر کیا تھا۔ اس اداریہ کا یہ اقتباس جو آج سب رس کی پالیسی بن چکا ہے ملاحظہ ہو۔

"سب رس" ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ترجمان ہے' جو ہر مہینے اردو زبان اور ادب کی خدمت کے لیے شائع ہوا کرے گا' اس ادارہ نے اب تک سنجیدہ علمی و ادبی کتابیں شائع کرکے اردو کی جو خدمت کی ہے وہ علم دوست اصحاب سے مخفی نہیں ہے۔ ہمارے بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر یا فائدہ ایک خاص حلقہ یا طبقہ تک ہی پہنچتا ہے اب ایسے کاموں اور تحریکوں کی زیادہ ضرورت ہے جو سب رس بن سکیں اور ایسے ماہ نامے اور روزنامے نکالے جائیں جن میں بھانت بھانت کی باتوں اور طرح طرح کی معلومات کا نچوڑ ہو اور جن کو ہر وہ شخص دلچسپی سے پڑھ سکے جو کسی خاص علم و فن کا ماہر نہ ہو اور اپنی فرصت کی گھڑیوں کو خوش گوار طریقے پر گزارنا چاہتا ہو' یہی ایک ذریعہ ہے جس سے اردو زبان کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا

اور ہماری آواز دور دور تک پہنچ سکے گی۔ سب رس کا سب سے بڑا مقصد یہی ہوگا کہ وہ سب کے لیے ہو۔ وہ سب کے لیے اُسی وقت بن سکے گا جب اس کی زبان سلیس اور سادہ ہوگی اور جب اس میں سب طرح کے موضوعوں پر دلچسپ مضمون، نظمیں اور افسانے چھپتے رہیں۔

غرض "سب رس" مضامین کی رنگا رنگی، اور تنوع کے باعث رسائل کی دنیا میں نمایاں مقام کا حامل بن گیا ہے۔ حضرت امجد حیدرآبادی نے اسے تحفۂ لاجواب قرار دے کر ایک رُباعی کہی تھی۔ ملاحظہ ہو ؎

یہ تحفہ ہے لاجواب از بس نے لو
مرغوبِ دلِ ہر کس و ناکس لے لو
سب کا لینا تو امر ناممکن ہے
سب میں بہتر یہ ہے کہ سب رس لے لو

۱۹۳۹ء میں سب رس معلومات کے نام سے کئی سال تک ضمیمہ جناب حفیظ صدیقی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا جس میں عالمی سائنسی، طبی اور علمی و ادبی معلومات کے تراجم اور طبع زاد مضامین چھپتے رہے، اسی طرح ۱۹۳۸ء ہی سے بچوں کے لیے سب رس کا ایک باتصویر ضمیمہ محترمہ سکینہ بیگم اور جناب معین الدین احمد انصاری کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا۔ تقریباً ۱۰ برس تک بچوں کا سب رس اپنی مقبولیت کو روشن کرتا رہا۔ اس کی مجلس ادارت میں نئے قلم کار شامل ہوتے گئے۔ جناب محمد عبدالقادر حبیب (حال مقیم لندن) اور جناب منیر صفوی (حال مقیم کراچی) اور سید تقی الدین احمد

قادری نے مسٹر یم کے ویلوڈی کے دورِ صدرالمہامی میں بچوں کی کل حیدرآباد کانفرنس بھی منعقد کی تھی اور بچوں کے سب رس کا ایک خاص نمبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا۔

ماہنامہ "سب رس" نے دکن کے اہلِ قلم اصحاب، شاعروں، افسانہ نویسوں، جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں اور خواتین قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کو اپنے دورِ اوّل سے اب تک اوّلیت دی ہے اور ان اصحابِ فکر و نظر کے دوش بدوش ہندوپاک کے صفِ اوّل کے لکھنے والوں کا سب رس کو تعاون ہر عہد اور ہر دور میں رہا ہے۔ اس کی ادارتی ذمہ داریوں کو ڈاکٹر زورؔ کی حیات اور نگرانی تک جناب میکش، پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہدؔ، سلیمان اریبؔ، وقار خلیل اور پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی نے مشاورتی بورڈ کے تعاون سے بہتر و بہتر انجام دیا۔ ڈاکٹر زورؔ کی وفات حسرت آیات کے بعد سب رس کو ان کی یادگار ہونے کا شرف ملا اور صدرِ ادارہ ماہرِ تعلیم پروفیسر سید علی اکبر نے اس کی ادارت قبول فرمائی پھر مجلس مشاورت کی معتمدی علی الترتیب پروفیسر اکبر الدین صدیقی، جناب میر حسن، جناب غلام جیلانی کے حصے میں آئی۔ ان عثمانین اربابِ ثلاثہ نے سب رس اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کی سرگرمیوں کو عصریت اور مقبولیت سے ہم کنار کیا۔

اکتوبر ۱۹۷۰ء سے سب رس کی مجلس مشاورت کی معتمدی اور اعزازی فرائض برصغیر کے نامور نقاد، سخن ور اور کلاسیکیت سے جدیدیت تک معتبر اور صاحبِ نظر دانشور ڈاکٹر مغنی تبسم (ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ) انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم

ادارہ کی مجلسِ انتظامی کے رکن اور ادارہ کی ادبی اور شعری محفلوں اور سیمیناروں کے روحِ رواں بھی ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کے ساتھ راقم الحروف بھی سب رس کی ادارت میں بہ حیثیت معاون مدیر مصروف بہ کار ہے۔ مجلسِ مشاورت کے صدر پروفیسر سید علی اکبر اور جناب محامد علی عباسی نائب صدر ہیں، اراکین میں برصغیر کے صفِ اول اور بین الاقوامی شہرت رکھنے والے اسکالر، ادیب، محقق اور پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی (جو ڈین فیکلٹی آف آرٹس بھی ہیں) کے علاوہ ملک کے ممتاز صحافی، اردو دنیا کے نامور مجاہد اردو پدم شری جناب عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ سیاست اور دکنی ادبیات کے اسکالر محقق پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی، ممتاز قانون داں اور دکنی کلچر کی عہد آفرین اور مثالی کردار نما شخصیت جناب رمن راج سکسینہ ایڈوکیٹ (شریک معتمد ادارہ) جناب پروفیسر سید سراج الدین اور جناب محمد منظور احمد (سابق پرنسپل آرٹس کالج) کے علاوہ ادارہ کے معتمد عمومی، صاحب طرز ادیب اور ماہر نظم و نسق عہدہ دار جناب سید ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) ڈپٹی سکریٹری حکومت آندھرا پردیش کو بھی سب رس کا گرانقدر تعاون حاصل ہے۔ "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کے مصداق اب اختصاراً سب رس کے چند خاص شماروں کے نام گنوانا ضروری سمجھتا ہوں۔ سب رس کے یہ خاص شمارے آج بھی اپنی علمی اہمیت رکھتے ہیں (۱) محرم نمبر (۱۹۳۸ء) (۲) اقبال نمبر (۱۹۳۸ء) (۳) مرقع دکن نمبر (۱۹۳۹ء) (۴) ریڈیو نمبر (۱۹۴۱ء) (۵) جنگ نمبر (۱۹۴۴ء) (۶) ادارۂ ادبیات اردو نمبر (۱۹۴۲ء) (۷) ترقی پسند ادب نمبر (۱۹۴۴ء) (۸) میکش نمبر (۱۹۴۸ء) (۹) جشنِ سیمین نمبر (۱۹۵۵ء) (۱۰) سالگرہ نمبر (۱۹۵۶ء) (۱۱) صفی نمبر (۱۹۵۶ء) (۱۲) امجد نمبر (۱۹۵۶ء) (۱۳) ادارہ نمبر (۱۹۵۷ء) (۱۴) ادارہ نمبر (۱۹۵۸ء) (۱۵) محمد قلی قطب شاہ نمبر (۱۹۵۸ء) (۱۶) ادارہ نمبر (۱۹۵۹ء) (۱۷) محمد قلی نمبر (۱۹۶۰ء) (۱۸) ایوان اردو نمبر (۱۹۶۰ء) (۱۹) یادگار محمد قلی نمبر (۱۹۶۱ء) (۲۰) ٹیگور نمبر (۱۹۶۱ء) (۲۱) قطب شاہ نمبر (۱۹۶۲ء) (۲۲) بہادر شاہ ظفر نمبر (۱۹۶۳ء) (۲۳) امجد نمبر (۱۹۶۳ء) (۲۴) عزیز جنگ ولا نمبر (۱۹۶۴ء) (۲۵) نجیب اشرف ندوی نمبر (۱۹۷۰ء) (۲۶) نصیر الدین ہاشمی نمبر سنہ (۲۷) زور نمبر (۱۹۶۳ء)، (۲۸) سالنامہ (۱۹۷۱ء) (۲۹) عنایت جنگ نمبر (۱۹۷۱ء) (۳۰) محمد قلی نمبر (۱۹۷۶ء) (۳۱) سب رس غالب نمبر ۲ حصے (۱۹۶۹ء) (۳۲) سلیمان اریب نمبر (۱۹۸۰ء) (۳۳) احتشام نمبر (۱۹۷۲ء) (۳۴) بشیر النساء بشیر نمبر (۱۹۷۲ء) (۳۵) زور نمبر (۱۹۷۶ء)۔

ادارہ کی گولڈن جوبلی تقاریب کے پروگرام میں سب رس (۱۹۳۸ء) سے (۱۹۸۱ء) تک کے مضامینِ نظم و نثر کا ایک جامع انتخاب نمبر کا منصوبہ بھی شامل ہے جس کے لیے ڈاکٹر مغنی تبسم کی صدارت میں چار رکنی انتخابی کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ اراکین میں جناب محمد منظور احمد، ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ، جناب صلاح الدین نیر اور وقار خلیل شامل ہیں۔

ادارۂ سب رس کی طرف سے سنہ ۸۰-۱۹۸۱ء میں ادارہ کی اپنی عمارت ایوانِ اردو میں خیر مقدمی محفلیں

سمینار، اور شام رہے بھی منعقد ہوئے ان محفلوں میں جناب اکبر حیدرآبادی اور جناب محمد عبدالقادر جیب (حال مقیم لندن) کی کتابوں کی رسم رونمائی بھی انجام دی گئی۔ ادارۂ سب رس کے ان جلسوں کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر آل احمد سرور، جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر وحید اختر کے علاوہ جامعہ عثمانیہ اور حیدرآباد کے دانش وروں، مصنفوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ اردو کے مسائل پر جناب سید ہاشم علی اختر معتمد ادارہ کے ایک کلیدی مقالہ پر بصدارت پروفیسر گیان چند جین ایک یادگار اور مہتم بالشان سیمینار بھی منعقد کیا گیا۔

ایک بار بانیٔ ادارہ ڈاکٹر زورؔ نے یوم محمد قلی قطب شاہ کے سالانہ اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ادارۂ ادبیات اردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ حیدرآباد کا ہر معروف شاعر، ادیب، صحافی، نقاد، استادِ اردو نے کم از کم ایک بار ادارہ میں حاضری ضروری ہے اور اس کے رسالہ سب رس میں ان کی نگارشات چھپ چکی ہیں۔

مجلس انتظامی ادارۂ ادبیاتِ اردو

پروفیسر سید علی اکبر (صدر) محامد علی عباسی، پروفیسر جیندر راج سکسینہ (نائب صدور) معتمد عمومی سید ہاشم علی اختر، رمن راج سکسینہ (شریک معتمد)

اراکین: محمد اکبر الدین صدیقی، ڈاکٹر ہاشم امیر علی، ایس۔ کے سنہا، سراج الدین احمد، مسز بلقیس علاؤالدین، ڈاکٹر مغنی تبسم، محمد منظور احمد ——— میر سراج الدین علی خاں۔ آفس سکریٹری۔

گولڈن جوبلی تقاریب کمیٹی

سیمینار کمیٹی: پروفیسر رفیعہ سلطانہ (صدر)، ڈاکٹر یوسف سرمست (کنوینر) محمد منظور احمد (معاون کنوینر)۔

انتخاب سب رس کمیٹی: ڈاکٹر مغنی تبسم (کنوینر) وقار خلیل (معاون کنوینر)۔

یموریل والیوم کمیٹی: پروفیسر سید علی اکبر (صدر) ڈاکٹر مغنی تبسم (کنوینر)۔

ادارہ کی نایاب مطبوعات کی اشاعتی کمیٹی: نواب میر احمد علی خاں (صدر) محمد منظور احمد (کنوینر)۔

پروفیسر سید علی اکبر کے مضامین کی اشاعتی کمیٹی: سید ہاشم علی اختر (صدر) محمد منظور احمد (کنوینر)

تحفظ مخطوطات ادارہ کمیٹی: عبدالمحمود (صدر)

دکنی ادب و ثقافت نمائش کمیٹی: ڈاکٹر ریم الحکم (صدر) رمن راج سکسینہ (کنوینر)

○ سووینیر کمیٹی: خواجہ عبدالغفور (صدر) ○ تلگو سندی تراجم اشاعت کمیٹی: کنول پرشاد کنول (کنوینر) ○ نشر و اشاعت کمیٹی: وقار خلیل (کنوینر) ○ بین کلیاتی تقریری، تحریری اور بیت بازی مقابلے: خواجہ معین الدین (کنوینر) ○ ڈرامہ کلچرل پروگرام کمیٹی: پروفیسر سراج الدین صدر، ڈاکٹر مغنی تبسم (کنوینر) ملک الشعرا اور قدیر زماں (معاون کنوینر) ○ محفل خواتین: بانو طاہرہ سعید (کنوینر) ○ یوم اطفال: وقار خلیل (کنوینر) ○ یوم زور: محمد منظور احمد (کنوینر)۔

یوم محمد قلی قطب شاہ: (رمن راج سکسینہ معتمد) نمائش و مقابلہ خطاطی: میر سراج الدین علی خاں (کنوینر) شام انشائیہ: ڈاکٹر مغنی تبسم (کنوینر) شام افسانہ: ڈاکٹر یوسف سرمست (کنوینر) میڈیکل ہلتھ چیک اپ: ڈاکٹر سید علی (کنوینر)

MARCH 1982

R. N. 10922/57.
Regd. H/HD. 134.

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500004. (A. P.

درس



بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

گولڈن جوبلی تقاریب ادارۂ ادبیاتِ اردو، مارچ ۱۹۸۲ء تا فروری ۱۹۸۳ء

ماہنامہ

سب رس

مجلسِ مشاورت

صدر : پروفیسر سید علی اکبر

نائب صدر : محامد علی عباسی

معتمد : ڈاکٹر مغنی تبسم

مُدیرِ اعزازی : ڈاکٹر مغنی تبسم

معاون مُدیر : وقار خلیل

جلد (۴۴) اپریل، مئی ۱۹۸۲ء شمارہ ۴، ۵

ادارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد - ۵۰۰۰۰۴

اراکین

پروفیسر گوپی چند نارنگ

سید ہاشم علی اختر

رمن راج سکسینہ

عابد علی خاں

محمد اکبر الدین صدیقی

پروفیسر سراج الدین

محمد منظور احمد

زرِ سالانہ

۲۰ روپیے

کتب خانوں سے ۲۵ روپیے

بذریعہ رجسٹری ۴۵ روپیے

فی پرچہ ۲ روپیے

بیرونی ملکوں سے

	ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
مشرقِ وسطیٰ	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
امریکہ	۱۶ ڈالر	۶ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون	۸ ڈالر	۳½ ڈالر
انگلستان، پونڈ		۳ پونڈ

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد۔ ۲

فہرست

وفیات

۷ر فروری ۱۹۸۲ء کو صفِ اوّل کے محقق اور ادیب جناب عتیق صدیقی دہلی میں رحلت کر گئے۔ جو جولی کے بزرگ اور اردو صحافت کی ادبی تاریخ کے معتبر رمز شناس تھے۔

۲۲ر فروری ۱۹۸۲ء کو اسلام آباد (پاکستان) میں حضرت جوش ملیح آبادی اپنے ۳۵ سالہ قیامِ پاکستان کے بعد اس جہانِ فانی سے رحلت کر گئے۔ جوش برصغیر کے عہد آفریں شاعر تھے اور ان کے ساتھ وہ اہم دور بھی ختم ہو گیا جو بیسویں صدی کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔

؎ ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی۔

۳ر مارچ ۱۹۸۲ء کو برصغیر کے دانشور شاعر، نقاد پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، دہلی میں جاں بحق ہوئے۔ وفات سے چند روز پہلے وہ جوش کی رحلت پر نم دیدہ اور گریہ کناں تھے، اردو شاعری میں فراق اپنے غزلوں کی طرحداری کے سبب صدیوں یاد رہیں گے، اردو زبان کا انھوں نے ہندوستان میں جس جرأت مندی سے دفاع کیا اُسے یاد رکھا جائے گا۔ اردو زبان اور ادب کے علاوہ ہندوستانی تہذیب و تمدن کے فراق رمز شناس اور بھلے چاہتے تھے۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ حیدرآباد اور ادارۂ ادبیات اردو سے حضرت جوش و فراق کا ربط استوار اور روشن تھا۔ ۲۱ر مارچ کو پاکستان میں حضرت احسان دانش اللہ کو پیارے ہو گئے، محبت اور محنت کے اس مقبول عوام ذی حس شاعر کی وفات اردو شاعری کے لیے نقصانِ عظیم ہے۔

(و۔ خ)

عوض سعید

عزیز قیسی

برسوں پرانی بات ہے ایک کالا کلوٹا نوجوان جسے دیکھ کر پال رابسن (PAUL ROBSON) کی یاد تازہ ہو جاتی تھی ڈائس پر کھڑا اپنی ایک جوشیلی نظم سنانے کے بعد داد نہ ملنے پر سامعین سے الجھ رہا تھا اور لوگ خواہ مخواہ کی مارکٹائی سے بچنے کے لیے عالم بے بسی میں بھی آہ اور واہ کے نعرے بلند کر رہے تھے ایسے عجیب و غریب ماحول میں یہ آدمی مجھے بڑا پیارا لگا۔ میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ اچھا شاعر ہے۔ میری بغل میں بیٹھے ہوئے صاحب نے چونک کر مجھے نیچے سے اوپر تک اس طرح دیکھا جیسے وہ میری قابلِ رحم حالت کا اندازہ لگا رہے ہوں "گھبراؤ نہیں عدالت میں کوئی کام ہو تو بتا دینا میں اس سے کہہ دوں گا۔ سول کورٹ میں جج کے بعد آج کل سب سے اہم آدمی یہی ہے۔" اس اہم آدمی سے میری پہلی بھیڑ معظم جاہی مارکٹ کے چوراہے پر اس طرح ہوئی کہ برسوں گزر جانے پر بھی ایسا لگتا ہے کہ یہ حادثہ ابھی ابھی ہوا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب قیسی کے نام اور کام سے سب ہی کے کان آشنا تھے اور ہماری حیثیت ادب میں نو وارد کی سی تھی۔

"قیسی" ـــــ یہ نوجوان اپنا عوض سعید ہے۔ میں نے سب رس کے لیے اس سے ایک کہانی لی ہے۔" یہ اریب تھے۔

"تو مولانا آپ ہی وہ ذاتِ شریف ہیں جنھوں نے احسن علی مرزا کے پرچے میں بکواس کی تھی۔ قیسی شاعر ہی نہیں افسانہ نگار بھی ہے۔ قیسی افسانہ نگار نہیں ہے تو سالے تم کیا ہو ـــ"

اس دوران شاہد صدیقی آ دھمکے تو اریب نے کہا۔ "تو ہو جائے دو دو ہاتھ" شاید ان کا روئے سخن رتی کی طرف تھا۔ شاہد نے کہا "تو پھر انھیں اپنا پارٹنر بنا لو ـــ"

"یہ تو بالکل بدھو ہے۔ ذرا افسانہ نگار۔ یہ رمی کیا کھیلے گا۔ چلو رمی نہ سہی جھک ہی سہی۔"

ارے ممتاز ذرا ٹھہرنا۔ میں اوپر آ رہا ہوں کہہ کر شاہد مجرد گاہ کی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر چڑھ گئے اور میں اریب کے چنگل سے بچ بچا کر گھر لوٹ آیا۔

اُن دنوں مجرد گاہ ادیبوں کا ایک مرکز تھا۔ اور اریب اس کے سرپرست ہوٹل ہو یا بار جب عزیز قیسی موجود ہو تو بل PAY کرنے کا سوال ہی پیدا

نہ ہوتا۔ یہ لامتناہی سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب مزید قیسی نے حیدرآباد سے تنگ آکر بمبئی میں رہائش اختیار کرلی۔

اپنی برجستہ گوئی، بذلہ سنجی اور لطیفے بازی میں وہ شاہد صدیقی سے کسی طرح پیچھے نہ تھا۔

مزاجاً بڑا اکھڑ مگر دل کا بڑا نرم۔ اور اگر غصہ میں مغلوب ہو جائے تو اپنے ساتھی کا بھی حلیہ بگاڑ کر رکھ دے۔ خاص طور پر اس وقت جب پینے کے دوران کوئی اسے ماں کی گالی دے دے۔ یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک اس نے جوڈو کراٹے کے فن کا صحیح مظاہرہ نہیں کیا ہے۔

ایک دن میں نے اپنے ایک دوست کے سوجے ہوئے چہرے کو دیکھ کر جب ان کی خیریت دریافت کی تو انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ قیسی صاحب کی عنایت ہے۔"

۱۹۵۸ء میں جب میں بمبئی میں اس سے ملا تو وہ فلم انڈسٹری کی خاک چھان رہا تھا۔ اور حفیظ قیصر ان دنوں ایک فلمی پرچے سے وابستہ تھا۔ وہاں رنجیت اسٹوڈیو میں میں نے پہلی بار منوج اور دھرمیندر کو دیکھا جو فلمی دنیا سے اکتا کر اپنے وطن لوٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اور قیصر بڑی تندہی سے منوج کی پبلسٹی میں لگا ہوا تھا۔

نعیم زبیری کو اس نے میرے ساتھ دیکھ کر کہا کہ تم اس بور آدمی کے ساتھ یہاں کدھر آگئے۔ میں نے تمھیں دن میں میرین ڈرائیو کی سیر کروا دی۔

ہم نے ایک پُرسکون ہوٹل میں کافی کے دو پیالے پیے۔ اور باتوں اور لطیفوں کا ایک دلچسپ سلسلہ شروع ہوگیا۔ جب کافی دیر ہوگئی تو میں نے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"قیسی یار کبھی ہم کو بھی یہاں کھپا دو۔"

"مرنا اگر ہے تو یہاں مستقلاً آجاؤ اور ساتھ میں نواب کو بھی لے آؤ۔ مزہ آجائے گا۔"

قیسی کوئی بائیس برس سے بمبئی ہی میں مقیم ہے۔ فلم میں اس نے بہت کچھ کمایا بھی ہے اور ساتھ گنوایا بھی ——

وہ ایک شاہ خرچ آدمی ہے۔ آج اس کے ہاں ہزاروں روپے بھی ہوں تو وہ آنے والے کل کے بارے میں کبھی نہیں سوچے گا۔ اس کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت ہمیشہ آج پر رہتی ہے۔ کل پر نہیں۔ اور آنے والے کل پر تکیہ کرتے ہوئے شائد ہی کسی نے اسے دیکھا ہو۔

"اریب نے کسی وقت اسے لکھا تھا کہ تم کار خریدنے کے بعد ہی حیدرآباد لوٹنا ——" ایک اچھا فلیٹ تو اس نے خرید لیا ہے۔ لیکن ایک قیمتی اور خوب صورت کار ابھی تک حسرتوں کی منزل ہی میں کہیں پھنسی ہوئی ہے۔

قیسی ایک اچھا شاعر ہی نہیں ایک اچھا اسکرپٹ رائٹر بھی ہے مگر اس کی تند مزاجی اور اس کے زہریلے سچ نے اسے تا حال اس مقام تک نہیں پہنچایا جہاں اسے بہت پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا۔

ہماری رنجشیں، ہماری تنہائیاں ناقابل تقسیم ہیں۔ لیکن قیسی سے ہر بار مل کر ایسا لگتا ہے جیسے ہم اپنی تنہائیوں کے تابوت کو دور کہیں چھوڑ آئے ہوں اور جیسے قیسی زندگی کے ہر زہر کا مزہ چکھ چکا ہو۔

عزیز قیسی

خصوصی مطالعہ

جشنِ میلادِ امروز

میں جسے سُن رہا ہوں بڑی دیر سے
کیا وہ کوئی بانگِ فتح و ظفر ہے کوئی
یا صدائے شکست و ہزیمت ہے یہ
یا کوئی نغمۂ دل نشیں!
لوگ کہتے ہیں اک طفلکِ بے خبر —
غنچۂ نوشگفتہ — گلِ تازہ تر — آئے گا
زادِ بوم بشر — مہر و مہ کی آغوش میں
لے کے چومے گا اُس کی جبیں
اور پھر حسبِ مقسوم ہر ایک کو
اس کے حصے کی خیرات مل جائے گی
چشم بر راہ تم بھی ہو۔

ہر برس میری آغوش میں آتے آتے ہی
ہر طفلِ زائیدۂ نیم شب مرگیا
میں جہاں پر کھڑا ہوں وہاں سے اُدھر بھی سیہ رات ہے
اور اِدھر بھی سیہ رات ہے
کون سنتا ہے اس جشن کے شور میں
میں وہی ابنِ آفاق ہوں میرے دل گیر رامش گرو!
وقت جس کے تصور کی اولاد ہے
وقت موہوم ہے
وقت بے تخم ہے بانجھ ہے
وقت کے پاس کچھ بھی نہیں
ہاں مگر ایسے لمحے کی خلقت پہ قادر ہوں میں
جس کے پیچھے اندھیرا اگر ہے تو
جس کے آگے کم از کم اندھیرا نہیں
کون سنتا ہے اس جشن کے شور میں

نوا گرانِ نخوردہ گرند.....

عزیز قیسی

جشن چلتا رہے
"حرفِ حق" کی طرح مطربہ کے گلے سے مسرت کا چشمہ اُبلتا رہے
جشن چلتا رہے
جشنِ شب —
رامش و رنگ رقصِ طرب — تیز تر
رقصِ مے
رقصِ مستانِ مے
شورِ صوتِ مزامیر گلبانگ — نے تیز تر تیز تر
شورِ طبل و دہل۔ شورشِ چنگ و دف
رقص کرتے قدم
منتشر متصل منقطع متصل منفصل صف بہ صف تیز تر تیز تر تیز تر

اس مہکتے اُجالے کے چندن بدن سے کسی سانپ کی طرح لپٹی ہوئی
جشن کی رات سے یوں ہی لپٹے رہو
یہ نہ سوچو کسی شاخِ گل شے کے تلے
سانپ نے کس کو کاٹا ہے — یہ بھی نہ سوچو
کہ چندن سے اُترے گا تو سانپ پھر کون سے پیڑ پہ جائے گا

کچھ نہ سوچو
یوں ہی جشن چلتا رہے
جشنِ شب
رامش و رنگ رقصِ طرب — تیز تر تیز تر تیز تر تیز تر

نیند

مجھ کو باہوں میں لیے
نیند جب بند قبا، زلف دوتا کھولتی ہے
تپتی مٹی کی جھلستی ہوئی تنہائی سے
پہلی بارش کی طرح بولتی ہے

کعبۂ دل

کعبۂ دل جس گھڑی ڈھایا گیا —
زلزلہ آیا زمیں پر اور نہ طوفاں بحر میں
کوئی تبدیلی نہ آئی دہر میں
کچھ بھی ہو ایمان دنیا کا مگر
دل ابھی کعبہ نہیں ہے اور کعبہ دل نہیں

عزیز قیسی

زخم ہے سینہ ابھی تلوار ہے احساس ابھی
کچھ نہ کچھ جینے کا سرمایہ ہے میرے پاس ابھی
سانس روکے سن رہا ہے وقت ان کا فیصلہ
اٹھتی جھکتی وہ نگاہیں آس ابھی ہیں یاس ابھی
حد سے بڑھ جاتی تو پھر دریا کی کچھ ہستی نہ تھی
ساحل ممنوع پر دم توڑتی ہے پیاس ابھی
برف کی سل ہے یہ دل یا ہے کسی شعلے کی لو
اس بیاباں کو کوئی موسم نہ آیا راس ابھی
شہر جاں تیری طرف اب بھی کھنچا جاتا ہے دل
تیری نغموں میں ہے اگلے دور کی بو باس ابھی
گونجتی ہے دل میں اب بھی کوئی گم گشتہ صدا
ہم کو قیسی ہے شکستِ آرزو کا پاس ابھی

○○

انھیں سوال ہی لگتا ہے ہمارا رونا بھی
عجب سزا ہے جہاں میں غریب ہونا بھی
یہ رات رات بھی ہے اوڑھنا بچھونا بھی
اِس ایک رات میں ہے جاگنا بھی سونا بھی
وہ حبسِ دم ہے زمیں آسماں کی وسعت میں
کہ ایسا تنگ نہ ہوگا لحد کا کونا بھی
عجیب شہر ہے گھر بھی ہیں راستوں کی طرح
کسے نصیب ہے راتوں کو چھپ کے رونا بھی
کھلے میں سوئیں گے پر ہو تیاگے پھولوں سے
سجاؤ زلف ہٹا لو ذرا بچھونا بھی
نجاتِ روح بھی ارزاں شورِ دل کی طرح
ہوا ہے سہل ضمیروں کے داغ دھونا بھی
عزیز قیسی یہ سوداگروں کی بستی ہے
گراں ہے دل سے یہاں کاٹھ کا کھلونا ہے

○○

عزیز قیسی

○

آنکھوں میں ہے یاد آنے کا نہ انجام نہ یاد آ
شب کاٹنی مشکل ہے سرِ شام نہ یاد آ
ہر جام پہ رگ رگ میں اُتر آتے ہیں نشتر
آیا و مگر پینے کے ہنگام نہ یاد آ
یادوں کو بھی آسیب بنا دیتی ہے دنیا
دنیا ہے سراپردۂ اوہام نہ یاد آ
تھم جائے یہیں وقت قسم گیسو و رخ کی
اے صبح نہ یاد آ ہمیں اے شام نہ یاد آ
مشکل سے ذرا دیر کو ٹھیرا ہے ابھی دل
کچھ دیر تو اے یارِ دل آرام نہ یاد آ
یاد آتے ہیں پاکیزگیِ عشق کے ہمراہ
دنیا کے لگائے ہوئے الزام نہ یاد آ
جاگ اٹھیں گے سو غم ترے اک غم کے بہانے
غم خانے میں مچ جائے گا کہرام نہ یاد آ
قیسی سے کھنچا رہتا ہے ویسے بھی زمانہ
تنہائی بھی ہو جائے گی بدنام نہ یاد آ

○○

○

الجھاؤ کا مزہ بھی تری بات ہی میں تھا
تیرا جواب تیرے سوالات ہی میں تھا
سایہ کسی مکیں کا بھی جس پر نہ پڑ سکا
وہ گھر بھی شہرِ دل کے مضافات ہی میں تھا
الزام کیا ہے یہ بھی نہ جانا تمام عمر
ملزم تمام عمر حوالات ہی میں تھا
یاروں کو انحراف کا جس پر رہا غرور
وہ راستہ بھی دشتِ روایات ہی میں تھا
اب تو فقط ہوس کی مروّت ہے درمیان
تھا ربطِ جان و دل تو شروعات ہی میں تھا
مجھ کو جو قتل کر کے منا تا رہا ہے جشن
وہ بد نہاد شخص مری ذات ہی میں تھا

○○

انتظار حسین

خیمہ سے دُور

"یہاں کب تک بند بیٹھے رہیں۔ اب نکلنا چاہیئے"
اکتا کر پہلے نے کہا

"نکل کر کہاں جائیں" دوسرے نے تھوڑا چڑھ کر کہا۔ اصل میں پہلے نے اتنی بار نکل چلنے کا سوال اٹھایا تھا کہ دوسرے نے سوچا کسی طور اس کا منہ بند ہو ہی گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ تو ابھی تک اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یہاں سے نکل کر جائیں گے کہاں۔ سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ جب بہت الجھ گیا تو بولا "نکل کر کہیں بھی جائیں۔ باہر تو نکلیں"

"مگر باہر کے متعلق کچھ پتہ تو چلے۔ یوں بے سوچے سمجھے نکل کھڑے ہونا عاقبت اندیشی تو نہیں ہے" اس نے سمجھانے کے لہجہ میں کہا۔ وہ جو تھوڑا چڑچڑاپن اس میں پیدا ہوا تھا اس پر اب اس نے قابو پا لیا تھا۔ اس کا تحمل اور تامل واپس آگیا تھا۔

"باہر کے متعلق ہمیں پتہ کیسے چلے گا۔ اندر ہی بند بیٹھے رہے تو بے شک دنیا بدل جائے ہمیں کیا خبر ہوگی"

دوسرے نے پھر اسی تحمل کے ساتھ جواب دیا جیسے اسے سمجھا بہلا رہا ہو "جو گئے ہیں وہ واپس آجائیں تو ان سے کچھ پتہ چلے گا۔ پھر نکلنے کے متعلق سوچیں گے"

پہلا اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ بولا "کب گئے ہیں، پلٹے ہی نہیں۔ آخر کب تک ان کا انتظار کیا جائے" رکا۔ پھر بولا "اگر وہ نہ آئے تو؟"

اس اچانک سوال پر دوسرا تھوڑا بوکھلا گیا۔ اگر وہ نہ آئے تو؟ ..... اگر وہ نہ آئے تو؟... کتنی دیر تک یہ سوال اس کے اندر گونجتا رہا۔ اس امکان پر تو اس نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ ایک تشویش کی لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔ اسے خیال آیا کہ واقعی اب تک تو انہیں آجانا چاہیئے تھا۔ پھر کیوں نہیں آئے۔ کوئی ایک تو آجاتا۔ کیوں؟ اور پھر وہی تشویش کہ اگر وہ نہ آئے تو۔ مگر اس نے اپنی اس تشویش کو بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا۔ بظاہر اعتماد کے لہجہ میں بولا "نہیں، وہ آئیں گے"

"ہاں انہیں آنا تو چاہیئے۔ لیکن اگر نہ آئے تو؟"

"پھر وہی سوال۔ پھر وہ اکھڑنے لگا تھا۔ مگر پھر اس نے اپنے آپ کو تھاما "نہیں، وہ آئیں گے" اور پھر قطعی لہجہ میں کہا ہمیں ان کا انتظار کرنا ہوگا"

"مگر کب تک؟"

اس سوال نے اسے پھر پریشان کر دیا۔ انتظار کی مدت کا تعین کرنا اسے کتنا مشکل نظر آرہا تھا۔ کیا خبر ہے کہ کب آئیں۔ اور کیا خبر ہے کہ نہ آئیں ؟ پھر وسوسے کی لہر اٹھنے لگی تھی۔ مگر اس نے فوراً ہی اُسے رفع دفع کر دیا "بہر حال ہمیں ان کا انتظار کرنا ہے"

اس قطعی جواب کے بعد کوئی کیا کہتا۔ پہلا منھ ہی منھ میں کچھ بڑبڑایا اور چپ ہو گیا۔

دوسرے نے پہلے کو دیکھا کہ وہ چپ تو ہو گیا ہے مگر کتنا بے اطمینان ہے۔ سمجھانے کے لہجے میں بولا "میرے یار، تجھے باہر کے حالات کا اندازہ نہیں مجھے ہے۔ میں یوں بے سوچے سمجھے نکل کھڑے ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

پہلا بولا "میرے دوست، تجھے باہر کے حالات کا تو اندازہ ہے، اندر کے حالات کا اندازہ نہیں ہے۔ اب تو مجھے دو ٹانگوں پہ کھڑا ہونا دوبھر لگتا ہے چلنے کی خواہش ہی ختم ہو گئی۔ تھوڑے دن اور یہاں بند رہے تو ٹانگوں پہ چلنا بھول ہی جائیں گے۔ رینگنا شروع کر دیں گے" یہ کہتے ہوئے اسے اچانک خیال آیا کہ پچھلی رات جب اسے اس بند جگہ سے بہت خفقان ہوا تھا تو اس کا جی چاہا تھا کہ وہ سمٹ جائے اتنا کہ کواڑ اور چوکھٹ کے بیچ جو دراڑ ہے اس میں سے رینگ کر نکل جائے۔

تیسرے نے جو کتنی دیر سے آنکھیں موندے اوندھے منھ ان دونوں سے بے تعلق بے سدھ پڑا تھا جیسے وہ ان کے بیچ ہے ہی نہیں آنکھیں کھول کر غور سے پہلے کو دیکھا عجب نظروں سے کہ پہلا پسینہ پسینہ ہو گیا مگر اس نے دم بھر دیکھ کر پھر آنکھیں موندلیں۔ اس کے آنکھیں موندلینے کے بعد پہلے نے اُسے غور سے دیکھا پھر جیسے کسی شک میں پڑ گیا ہو۔ دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ مگر دوسرا کچھ کہتے کہتے اچانک دم بخود ہو گیا جیسے اسے کچھ سنائی دیا ہے۔ پہلا چونکا اور وہ بھی دم بخود ہو گیا۔ تیسرے نے آنکھیں کھولیں اور خلا میں تکنے لگا۔ تو واقعی کچھ آہٹ ہوئی تھی۔ کان اس آہٹ پہ لگے ہوئے تھے۔ ایک ساتھ وہ کتنے چوکنے، کتنے خوف زدہ ہو گئے تھے۔

"کوئی ہے" پہلے نے کسی قدر شک کے ساتھ کہا

"لگتا ہی ہے۔ کوئی ہے۔"

"پتہ نہیں کوئی ہے" پہلے نے وسوسے کے ساتھ کہا۔

وسوسہ دوسرے کو بھی تھا۔ مگر اس نے وسوسے پر قابو پاتے ہوئے متانت کے ساتھ کہا "وہی ہوں گے"

"ہاں ہونا تو انھیں ہی چاہیے۔ لیکن اگر وہ نہ ہوئے تو پھر کون ہو سکتا ہے"

پھر کون ہو سکتا ہے، یہ کہتے ہوئے وہ خود بھی خوف زدہ ہو گیا اور دوسروں کو بھی خوف زدہ کر دیا۔ دل کس بری طرح دھڑکنے لگے اور دھیان کس کس طرف گیا۔

دروازے پر بہت ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ دم بخود رہے۔ پھر دستک ہوئی، اتنی ہی ہلکی۔ آخر دوسرے نے ہمت کی۔ آہستہ سے اٹھا، دبے پاؤں دروازے تک گیا، دراڑ میں سے جھانکا۔ کسی نے سرگوشی میں کہا "کھولو" دوسرے نے شاید آواز پہچان لی تھی۔ آہستہ

سے دروازہ کھولا۔ جو داخل ہوا وہ ان میں کا چوتھا تھا۔ اُسے دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔

"تم اکیلے؟" دوسرے نے تعجب سے کہا

"اچھا وہ ابھی تک نہیں پہنچا ہے؟" چوتھے نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔

"نہیں ابھی تک تو آیا نہیں ہے۔"

"پھر آتا ہوگا۔" چوتھے نے اطمینان کے لہجہ میں کہا۔ "باہر کیا حال ہے؟"

"بہت ہجوم تھا۔ مشکل سے نکل کر آیا ہوں۔"

"ہجوم؟" پہلے اور دوسرے نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"ہاں بہت ہجوم تھا۔ لوگ ہی لوگ۔"

"عجب بات ہے۔" پہلا بولا "اس وقت تو کوئی دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا نہ کوئی آواز ہی سنائی دیتی تھی جیسے یہاں لوگ ہیں ہی نہیں۔"

"مگر اس وقت بہت لوگ ہیں اور بہت شور ہے۔"

"کہاں سے آ گئے اتنے لوگ؟" پہلا بدستور حیران تھا۔

"میں خود حیران تھا کہ یا اللہ یہ لوگ پہلے کہاں تھے۔ اور اب کیسے اور کہاں سے نکل آئے۔ پتہ نہیں کن کن کونوں کھدروں سے نکل کر آئے ہیں۔ بہت لوگ ہیں۔ اور چوک میں تو سروں کا سیلاب امڈا ہوا ہے۔"

"پھر ہمیں بھی نکلنا چاہیے۔ ہم یہاں کیوں بند بیٹھے ہیں۔" پہلے نے بیکل ہو کر کہا

اس پر چوتھا چپ ہو گیا۔ تامل کے بعد بولا

"ہاں نکلنا تو چاہیے۔ سوچ لیں۔"

"سوچنے کی اس میں کیا بات ہے۔ میرے خیال میں اب یہاں سے نکلنا ہی چاہیے۔ بند بیٹھے بیٹھے مجھے تو پھپھوندی لگ گئی کتنے دن سے آسمان نہیں دیکھا۔ بس اب نکلنا چاہیے۔"

چوتھا چپ رہا۔ پھر بولا "پہچانے نہ جائیں۔"

"اتنے ہجوم میں کون کسے پہچانتا ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" چوتھے نے جواب دیا "ہجوم تو بہت ہے۔ لوگوں میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ کسی نے پہچان لیا تو؟"

"اس کا بہت خطرہ ہے۔" چوتھا اب زیادہ اعتماد سے بولا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسی طرح بند بیٹھے رہیں۔ لوگ باہر نکلے ہوئے ہیں۔ ہم اندر گھٹے بیٹھے رہیں۔" پہلے نے غصے سے کہا

"نہیں، اب زیادہ دیر تو اندر بند ہو کر نہیں بیٹھ سکتے۔" دوسرے نے تحمل سے جواب دیا "مگر عجلت نہیں برتنی چاہیے۔ ذرا سی عجلت ہمیں کسی بڑی مشکل میں پھنسا سکتی ہے۔ تو بہتر یہ ہے کہ تھوڑا انتظار کر لیں اور جو قدم اٹھائیں احتیاط سے اٹھائیں۔"

"انتظار، احتیاط" دوسرا ہونٹ چباتے ہوئے بڑبڑایا۔

تیسرے نے آنکھیں کھولیں۔ چوتھے کو گھور کر دیکھا "تجھے کسی نے پہچانا؟"

چوتھے نے اب تک اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا جیسے وہ تھا ہی نہیں۔ اب جو اس نے گھور کر

دیکھا اور سیدھا سوال کیا تو اس نے اسے دیکھا۔ اس کے لیے وہ اجنبی تھا۔ مگر اس کے پاس یہ سوچنے کی کہ یہ کون ہے زیادہ مہلت نہیں تھی۔ ایک سیدھے سوال نے اسے پکڑ لیا تھا اور اب اُسے خیال آیا اور کسی قدر تعجب کے ساتھ کہ وہ اتنے بڑے ہجوم سے گزر کر آ رہا ہے جہاں ہر قسم کے آدمی سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی اور کسی نے اسے نہ پہچانا "مجھے؟ ہاں مجھے تو کسی نے نہیں پہچانا۔ بس نظروں میں نہیں آیا۔ بچ ہی گیا۔ اتفاق کی بات ہے حالاں کہ سگریٹ کے لیے بیچ چوک میں رکنا پڑا۔ البرٹ سینما کے سامنے پان سگریٹ کی جو دوکان ہے وہاں کتنے اپنے جاننے والے کھڑے رہتے ہیں۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت کوئی ایسا [illegible] نہیں جو مجھے پہچانتا۔"

"میرے ساتھ دمشق میں یہی ہوا تھا۔ تیسرا بولا "دمشق میں؟" تینوں نے اسے تعجب سے اُسے دیکھا "ہاں دمشق میں۔ بازار اس روز کتنے سجائے گئے تھے۔ تماشائیوں کا ہجوم تھا جلوس کا انتظار تھا۔"

"تو دمشق کب گیا تھا؟" پہلے نے طنز بھرے لہجہ میں پوچھا

بس اسی روز پہنچا تھا جس روز سر اس شہر میں پہنچے ہیں۔"

"سر؟ کیسے سر؟"

"نیزوں پہ بلند باوقار سر" یہ کہتے کہتے تیسرا کسی تصور میں کھو گیا جیسے ان کے بیچ سے نکل کر کہیں دور چلا گیا ہو۔ پھر بڑبڑایا "اونچے نیزے پہ بلند باوقار منبر سر، منور چہرہ، گردن میں اٹھا ہوا، لب ہلتے ہوئے، قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے۔"

چوتھے نے غور سے کسی قدر شک سے اسے دیکھا، سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا۔ پھر سوالیہ نظروں سے پہلے اور دوسرے کو دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کون ہے۔

دوسرا کچھ کہنے لگا تھا کہ اچانک دم بخود ہو گیا۔ پھر سرگوشی میں پہلے اور چوتھے سے مخاطب ہوا "تم نے سنا؟"

"کیا؟"

"قدموں کی آہٹ۔"

"اچھا؟"

"ہاں، کوئی ہے۔" پہلے نے اس کے شک کی توثیق کی۔

"اسے آنا تھا۔ وہی ہوگا۔" چوتھا بولا

"ہاں ہونا تو اسے ہی چاہیے۔" پہلا بولا

"مگر کیا خبر ہے۔" دوسرا چوتھے سے مخاطب ہوا "تمہیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں تھا؟"

"نہیں۔ اصل میں مجھے کسی نے پہچانا ہی نہیں۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ یہ دیکھتا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔"

"پھر تو اسے ہی ہونا چاہیے۔" دوسرے نے کسی قدر بے یقینی کے ساتھ کہا۔ تامل کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دبے پاؤں چل کر دروازے تک گیا۔ کیواڑ کی دراڑ میں سے جھانکنے لگا۔ پھر دستک ہوئی اور دبی سی آواز "کھولو۔" اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آ گیا۔ وہ وہی تھا، ان میں کا پانچواں "یار، تم

نے آنے میں بہت دیر لگائی۔ مجھے تو فکر ہو گئی تھی۔" چوتھے نے کہا

پانچواں ابھی اپنے حواس درست کر رہا تھا اس نے اس سوال کا فوراً جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

دوسرا بیچ میں بول پڑا "اتنے بڑے ہجوم کے بیچ سے نکل کر آنے میں بھی تو وقت لگتا ہے۔ دیر تو ہونی ہی تھی۔"

"ہجوم؟" پانچویں نے تعجب سے دوسرے کو دیکھا "کیسا ہجوم؟ شہر شہرِ خموشاں بنا ہوا ہے، تم ہجوم کی بات کر رہے ہو؟"

"کیا؟" اب دوسرے نے پانچویں کو تعجب سے دیکھا اور پھر فوراً چوتھے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"یار کیا بات کر رہے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی میں آیا ہوں۔ بہت بڑا ہجوم تھا۔ شہر بس خلقت سے ابلا پڑ رہا تھا۔" چوتھا بولا

پانچویں نے حیرت سے یہ بات سُنی۔ پھر بولا "یار، تم نے خواب تو نہیں دیکھا تھا؟"

"میں واقعہ بیان کر رہا ہوں۔"

"اچھا؟" رکا، پھر بولا "میں نے تو ہُو کا عالم دیکھا۔ عجب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں تھا اور میرے قدموں کی آواز۔ باقی سب سنسان۔"

چوتھا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا "تم چوک کی طرف گئے تھے؟"

"نہیں۔ ادھر ہی سے ہوتا ہوا آیا ہوں۔ چوک میں اُلّو بول رہا ہے۔ اور البرٹ سینما جہاں اتنی چہل پہل رہتی تھی بند پڑا ہے۔"

"البرٹ سینما بند پڑا ہے؟" چوتھا اب بالکل چکرا گیا تھا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہاں ٹکٹوں کے لیے قطاریں لگی ہوئی تھیں۔"

"پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ وہاں تو سنّاٹا ہے۔"

"دم کے دم میں سنّاٹا!" چوتھا بڑبڑایا "کہاں گئے لوگ۔"

"یہی میں سوچ رہا تھا کہ لوگ کہاں گئے۔"

پہلا ہنسا اور بولا "اس شہر کے لوگ تو جن بھوت ہو گئے۔ دم میں حاضر، دم میں غائب۔" پھر ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا "شاید ہم لوگ بھی .... کم از کم میں سایہ بن چکا ہوں۔"

"بنے تو نہیں ہیں" دوسرا بولا "بن جائیں گے۔"

تیسرے نے اسی طرح اوندھے پڑے پڑے آنکھیں کھولیں، ایک ایک کو گھور کر دیکھا "اچھا تو تم لوگ بھی۔" چوتھے کو ایک دم سے پھر خیال آیا کہ یہ کون شخص ہے۔ وہ سوالیہ نظروں سے دوسروں کو دیکھنے لگا تھا جیسے کچھ پوچھنے والا ہو۔ اتنے میں پہلا بول پڑا "ویسے اچھا ہی ہے۔"

"کیا اچھا ہے؟"

"یہی کہ اس وقت کوئی نہیں ہے۔ نکل چلیں موقع اچھا ہے۔"

دوسرے پس و پیش میں پڑ گئے۔ مگر پانچویں نے اس کی بات کاٹ دی "کیا باتیں کرتے ہو۔ اس

وقت نکلو گے "

"اس سے بہتر وقت اور کونسا آئے گا۔ کوئی دیکھنے والا ہے ہی نہیں"۔ پہلے نے اپنے موقف کے حق میں دلیل پیش کی۔

"بات یہ ہے۔" پانچواں بولا "لوگ چل پھر رہے ہوں تو نکلنے میں آسانی رہتی ہے۔ کوئی نوٹس نہیں لیتا کہ کون جا رہا ہے۔ لیکن سڑکیں خالی ہوں اور شہر میں سناٹا ہوا اور پھر کوئی گذرتا نظر آئے تو خواہ مخواہ شک ہوتا ہے "۔

دوسرے نے تائید میں سر ہلایا "ٹھیک کہتے ہو"۔

پہلا بولا "جب کوئی ہے ہی نہیں تو کون دیکھے گا اور کون شک کرے گا "۔

پانچواں، طنزیہ ہنسی ہنسا "تم بہت سادے ہو۔ ایسے ہی وقت میں جب کوئی نظر نہیں آتا آدمی کو زیادہ دیکھا جاتا ہے اور زیادہ شک کیا جاتا ہے"۔

تیسرے نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں کھولیں۔ پانچوں کو گھور کر دیکھا "تجھ پر کسی کو شک ہوا "۔

اس پر پانچویں کو خیال آیا اور اس خیال پر وہ ششدر رہ گیا کہ وہ سائیں سائیں کرتے رستوں سے گذر کر آیا ہے مگر کسی کو اس پر شک نہیں ہوا۔ بولا "میرے ساتھ تو کمال ہوا۔ سڑکیں خالی۔ بس میں اکیلا چل رہا تھا۔ اوپر کا دم اوپر نیچے کا دم نیچے کہ کسی نے تاڑ لیا تو۔ مگر بچ گیا "۔

"فرات ؟ "

"ہاں، فرات " رکا، سوچتے [illegible]

بولا "میں سمجھا کہ کوئی مجھے نکلتے ہوئے نہیں دیکھے گا کہ چراغ تو اس جناب نے گل کر دیا تھا۔ مگر جب میں نکلنے لگا تو میں نے دیکھا کہ خیمہ تو منور ہے اور سب نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ بس جیسے میں سب کے سامنے برہنہ ہو گیا ہوں۔ منہ چھپا کر تیزی سے باہر نکلا "۔ رکا، خیالوں میں کھو گیا، پھر بڑبڑایا "فرات کے کنارے لشکر پڑا تھا۔ قدم قدم پہ پہرہ۔ دھڑکا کہ اب پکڑا گیا۔ مگر کسی نے دیکھا ہی نہیں "۔

وہ بول رہا تھا اور چاروں طرف نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر جیسے سب کچھ سمجھ میں آگیا ہو۔ "اچھا تو تو تھا وہ آدمی "۔

"ہاں" اس نے بہ مشکل کہا اور اس کا سر جھک گیا۔ دوسرے نے تامل کیا۔ پھر کہا "اگر تو وہی ہے ....."

اس نے فوراً بات کاٹی "نہیں، میں وہی نہیں ہوں "۔

"تو وہی نہیں ہے ؟" دوسرا چکرایا "مگر ابھی جو تو نے بیان کیا اور اقرار کیا "۔

"عزیزو، میں نے صحیح بیان کیا اور صحیح اقرار کیا۔ ہوا یوں کہ جب میں دمشق پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اہل تقویٰ مشکل میں ہیں۔ ان پر شک کیا جا رہا ہے، انہیں پکڑا جا رہا ہے۔ میں ڈرا کہ کہیں میں پہچانا نہ جاؤں مگر عجب ہوا کہ کسی نے مجھے نہ پہچانا، کسی کو مجھ پر شک نہیں گزرا۔ تب مجھے دھیان آیا کہ جب میں خیمے سے نکلا تھا تو نکلتے نکلتے جیسے کہیں اپنے بیچ سے نکل گیا۔ تو جب میں خیمے سے باہر آیا تو میں وہ نہیں تھا کوئی اور تھا ..... ہاں بالکل۔ پھر میں کوئی اور تھا "۔

[illegible]

ر رہا ہے۔ پھر وہ انھیں تکنے لگا۔ ایک ایک کی صورت
غور سے دیکھا۔ حیراں ہوا "تم وہی ہو؟"
"ہم؟" وہ ایسے چونکے جیسے ان پر اچانک
لہ ہوگیا ہو۔ سٹپٹائے۔ ایک دوسرے کو دیکھا۔
دی سے دفاعی انداز میں بولے "ہم وہی ہیں.... جو تھے"
"اچھا؟" وہ اور حیراں ہوا۔ ایک دفعہ پھر
ی باری چاروں صورتوں کو غور سے دیکھا "تو گویا
ب تم خیمہ سے نکلے تھے تو تم......"
"خیمہ سے؟ کس خیمہ سے؟" انھوں نے
یک زبان عجلت سے اس کی بات کاٹی۔
وہ کچھ نہیں بولا۔ حیراں انھیں تکتا رہا۔ وہ
دی فکریں پڑ گئے۔ آپس میں ایک دوسرے کو سوالیہ
ظروں سے دیکھا۔ سرگوشی میں ایک دوسرے سے
چھا "یار ہم کس خیمے سے نکلے تھے؟" کچھ حیران
ہ پریشان ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس عالم
، دوسرے نے خود اعتمادی دکھائی اور بڑے تیقن
ہ کہا "عزیز، ہم کسی خیمہ سے نہیں نکلے"
دوسروں نے فوراً تائید میں سر ہلایا "ٹھیک
ت ہے۔ ہم کسی خیمہ سے نہیں نکلے ہیں"
پھر وہ چپ ہوگئے۔ آگے سمجھ میں نہیں آرہا
کہ کیا کیا جائے۔ یہ بھی چپ رہا۔ بس انھیں تکتا
ا۔ بڑبڑایا "عجب بات ہے" چپ ہوگیا۔ پھر
بڑایا "مجھے کہاں تک یاد آتا ہے"

پیام اقبال بغرض آگے

ہو اگر خود نگر و خود گر و خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

بہرحال اقبال کا عمل کا یہ حرکی تصور، آج بھی ایک آفاقی سچائی بن کر افراد اور اقوام کی زندگیوں پر پوری طرح اثر انداز ہے۔ یہی ان کی تنظیم و تشکیل استقامت و فروغ پھر فتح و نصرت اور نجات کا سرچشمہ ہے۔

تابش صدیقی

ہجرت

وہ بچے، وہ مائیں وہ بہنیں،
وہ پیر وجواں،
جن کے چہروں پہ،
درماندگی نوحہ خواں ہے،
جبینوں پہ سجدوں کے
روشن ستارے سجائے،
چلے آرہے ہیں
کھلے بازوؤں میں سمٹتے
چلے جارہے ہیں

(۲)

پہاڑوں،
فلک بوس اونچے پہاڑوں کی
ہر ایک وادی
انھیں الوداع کہہ رہی ہے
ہر اک قریہ وشہر،
عفریت کی چھاؤنی بن چکا ہے
ہر اک راستے پر قیامت،
کھڑی ہے
قیامت ہر اُس شخص کی منتظر ہے،

(۳)

پہاڑوں کی ہر ایک چوٹی
غمیں ہے
پہاڑوں کا ہر ایک پتھر
حزیں ہے
مگر اس قدر بھی نہیں ہے،
کہ سب جانتے ہیں،
پہاڑوں کے دامن میں
جو ہو رہا ہے،
فلسطین وکشمیر وقبرص کی
بھولی ہوئی داستاں ہے

(۴)

جو اپنے نہاں خانۂ دل میں،
ایمان کی شمع روشن کیے،
موت پر ہنس رہا ہے
قیامت کے خوں رنگ چہرے پہ
لکھا ہوا ہے:۔
کوئی شمعِ ایمان لے کر تو آئے
کوئی اس طرف سے
گزر کر تو دیکھے
اڑی ٹیریا اور سوروکا
افسانۂ خونچکاں ہے
کہاں کس نے ؟
ہجرت کا رنجِ صعوبت اٹھایا نہیں ہے
اور انصار کے پاس
آیا نہیں ہے
یہ ہجرت کی تاریخ دہرانے والے
یہی تو ہیں فتحِ مبیں پانے والے

تابش صدیقی

غم ناک ہوا کے جھونکے

اب کے بارش بھی وہ برسی
کہ الٰہی توبہ !
بوند پانی کی بھی لیکن
نہ زمیں پر اُتری ۔
اور بارش بھی،
عجب بارش تھی
اس کا وہ رنگ نہ تھا
رُوپ نہ تھا
جو کسی گوہرِ خوش آب کی
جا [illegible] ہوتا ہے

(۲)

رُوحِ ابدالی و محمودیہ کیا بیت گئی ؟
کس کو معلوم ہے یہ ان کے سوا
آنکھ بھی جس سمت کو اٹھی، لیکن ،
اونچے پربت بھی شفق رنگ ملے
کسی وادی، کسی جنگل، کسی
قریے کا ادھر ذکر ہی کیا
بھولی انیلی ہوا میں بھی
نم آلود ملیں ۔
زخم کے پھول
ہر اِک جسم کی زینت دیکھے
لالہ زاروں کا سماں ہو جیسے

(۳)

اونچے پربت ہیں،
کہ خاموش جھکائے ہوئے سر،
اپنے زخموں کی طرف
دیکھے چلے جاتے ہیں ،
اور فقط،
دیکھے چلے جاتے ہیں
ایک گھٹے خوف کے مارے چپ ہیں
کسی معصوم سے بچے کی طرح ،
سہمے ہوئے
اُن کے زخموں کی [illegible] ،
اُن کی حیرت زدہ بھیگی ہوئی آنکھوں سے
جُڑا کر آنسو،
عکسِ توقعے کی طرح

باٹتی پھرتی ہے انھیں
اور کہتی ہے "میرے تحفے کو
دل میں رکھ لو
دوست آنسو بھی عطا کرتے ہیں
دوست کس درجہ وفا کرتے ہیں"

(۴)
سرخ زخموں کی چمک سے بوجھل،
برف زاروں سے
پھسلتی ہوئی غم ناک ہوا کے جھونکے
شبِ تازہ کے جرائم کے فسانے لے کر
اپنی انصار فضاؤں کے کھلے آنگن میں
صبحِ صادق کے اجالے کی
جھلک سی پاکر
پل جھپکنے میں اتر جاتے ہیں۔

(۵)
ان فضاؤں میں
محبت ہی محبت ہے
ازل سے آباد،
اور غم ناک ہوا کے جھونکے،
اپنے اخوان ہیں،
مہمان ہیں،
اغیار نہیں ہیں کوئی

تبسم کاشمیری

ذات کا قتل

میں اپنی خواہشوں کی ناتمامی
تشنہ کامی پر
کسی تشنہ پرندے کی طرح
دن رات اُڑتا ہوں
مری سلگی ہوی ان خواہشوں کے
بے اماں پر
رات دن جل جل کے گرتے ہیں
جنھیں سب شہر تکتا ہے
میں اپنی ان جھلستی خواہشوں کی
آبروریزی پہ کڑھتا ہوں
میں اک تشنہ پرندہ ہوں
جسے اس شہر کاذب کے
بھیانک ہول منظر میں
بس اک قطرہ بھی پانی کا نہیں ملتا
میں بے آبی کی آفت میں ہوں
اپنے سانس گنتا ہوں
میں اس شہرِ جہنم میں
پگھلتی خواہشوں کی مرگ پر
ہر دم بھٹکتا ہوں
اور اپنے شل بدن کو
لمحہ لمحہ قتل ہوتا ہوا

مصحف اقبال توصیفی

دستک

رات کنکناتی ہے
میرے گھر کا دروازہ
ہر طرف ہوا۔ جیسے
سسکیوں کے لہجے میں
لے رہی ہے میرا نام
پوچھتی ہیں خوشبوئیں
راز کیوں مرے غم کا
چاند گھومتا ہوگا
ایک ہی زمیں کے گرد
اس سے کیا علاقہ ہے
میری خاک میں ملتی۔
در بدر جوانی کا
چیر کر چٹانوں کو
گر ابل پڑے چشمہ
اس سے کیا علاقہ ہے
میری سرخ آنکھوں میں
ایک بوند پانی کا

ہ

سرد ہوائیں لائیں گی
خون کی مہک، لیکن
اب بھی میرے چہرے پر
کچھ پرانے زخموں کا
اک نشان ہے تازہ
رات کنکناتی ہے
میرے گھر کا دروازہ [illegible]

صدیق مجیبی

○

شعیب بھائی کے لیے

عجیب دھند ہے آنکھوں کو سوجھتا بھی نہیں
ابھی تو دن کا ورق ٹھیک سے جلا بھی نہیں
یہ کس حصار میں سانسوں نے کس دیا ہے مجھے
یہ کیسا گھر ہے نکلنے کا راستا بھی نہیں
یہ کیسا دکھ ہے کہ روتا ہے سسکیاں لے کر
کھنڈر میں کون ہے روپوش بولتا بھی نہیں
عجیب درد کا رشتہ ہے اک عذاب سے یہ
بھلا دیا ہے جسے ہم نے وہ بھولتا بھی نہیں
مجھے بھی دیکھ مرے حوصلے بھی دیکھ ذرا
مرا تو کوئی نہیں، تو نہیں، خدا بھی نہیں
بہا کے لے گئیں موجیں پہاڑ جیسے پیڑ
یہ کیسا غم ہے کہ اشکوں میں روتا بھی نہیں
ہر ایک خواب کوئی پلکوں کو آکے ستاتا ہے
وہ میرا کون ہے؟ پوچھوں تو بولتا بھی نہیں

○○

مظفر حنفی

○

غم بہت ہوں، خدا کم نہیں ہے
سانس لیں تو ہوا کم نہیں ہے
خشک لب ریگ زاروں سے پوچھو
اوس کا آسرا کم نہیں ہے
سچ کہا ہے کہ دم گھٹ رہا تھا
جانتا ہوں سزا کم نہیں ہے
کیا خلاؤں میں پرواز کرتا
میرے اندر خلا کم نہیں ہے
سانپ اصلی ہیں جادوگروں کے
ورنہ میرا عصا کم نہیں ہے
شوق ہم کو بھی تھا ڈوبنے کا
بادباں کی عطا کم نہیں ہے
لوگ میلے میں کھوئے ہوئے ہیں
دوسرا نقشِ پا کم نہیں ہے
اے مظفر غزل بھی نہ ہو تو
رات کا جاگنا کم نہیں ہے

○○

غضنفر

○

فتہ رفتہ آنکھوں کو حیرانی دے کر جائے گا
ابوں کا یہ شوق ہمیں ویرانی دے کر جائے گا
کھ سر پہ گھرا بادل خشک نگاہیں کہتی ہیں
ج ہمیں یہ ابر یقیناً پانی دے کر جائے گا
ے ٹھہراؤ تو بے شک تجھ سے سفر میں آیا ہے
ین اک دن مجھ کو طغیانی دے کر جائے گا
وڑ کے یہ پھول بھی اپنے چہروں کو فق پائیں گے
ب کے موسم ان کو بھی حیرانی دے کر جائے گا
ے گا تو اک دو پل مہمان رہے گا آنکھوں میں
ے گا تو اک قصہ طولانی دے کر جائے گا

○

جب کوئی چادر رخِ شفاف پر تانی گئی
تب کہیں جا کر ہماری شکل پہچانی گئی
شادماں ہیں لوگ اب دنیا سے من مانی گئی
سچ تو یہ ہے رفتہ رفتہ ان کی حیرانی گئی
عقل و دانش کی کمی کا رنج ہے سب کو مگر
غم زدہ میں ہوں کہ میرے گھر سے نادانی گئی
اب کنارے پہ پہنچنے کا مزا باقی کہاں
کشتیاں سیدھی ہوئیں دریا سے طغیانی گئی
ساتھ اس کے ڈوبے پہچان، لذت سب گیا
میں نے سمجھا تھا فقط آنکھوں سے حیرانی گئی

شاہد میر

○

خاک خاک گھروں کا "دوشالہ" کیا کرتا
گری تھی برف ہی اتنی "سفالہ" کیا کرتا
بجھے لبوں پہ تبسم کا ہالا کیا کرتا
نہتّوں کا سلسلہ ازالہ کیا کرتا
تمام شہر ہی باندھے ہے پیٹ سے پتھر
میں اپنے گھر میں بچا کر نوالہ کیا کرتا
بتا کے آنا پڑا بھید سب سمندر کے
پڑا تھا میرا جزیروں سے پالا کیا کرتا
ورق ورق تھی سیاہی کتاب قسمت میں
نحیف روشنیوں کا حوالہ کیا کرتا

OO

○

سینے میں اپنے درد کوئی جاگتا نہ تھا
یہ اُن دنوں کی بات ہے سبزہ ہرا نہ تھا
آنکھوں کی روشنی بھی ابھی دور کی ہے یاد
سورج ہمارے شہر میں جب ڈوبتا نہ تھا
یہ کیا کہ آنسوؤں نے سراسر جھلس دیا
پانی کا لمس اس کے لیے تو نیا نہ تھا
ملتے ہی اس نے پیار کا اظہار کر دیا
لفظوں کے داؤ پیچ سے وہ آشنا نہ تھا
اترے ہے اس کے واسطے میوہ بہشت کے
جس کی زباں کو یاد کوئی ذائقہ نہ تھا
شاہد کے دل کا حال جہاں سے جدا نہ تھا
اک گنبدِ شکستہ کہ جو بے صدا نہ تھا

OO

ابو الفیض سحر

افکارِ تازہ و جہان تازہ —— پیامِ اقبال پر ایک تازہ نظر

اقبال کی شاعرانہ عظمت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اقبال محض ایک شاعر ہی نہیں بلکہ اس درجہ بلند پایہ مفکر اور فلسفی بھی، تھے کہ بعض لوگ انھیں ایک طرح کی پیغمبرانہ شان سے متصف کرکے دیکھتے ہیں۔ لیکن ہارورڈ یونیورسٹی کی ماہر شرقیات پروفیسر شمل اپنے مخصوص انداز میں، اس حقیقت کو نہایت خوب صورتی سے پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"NO BODY WOULD ACCEPT THAT IQBAL WAS A PROPHET, BUT WE MAY ADMIT THAT HE HAS BEEN TOUCHED BY THE GABRIEL'S WINGS"

دنیا کے دانش کدوں اور علم گاہوں میں فکرِ انسانی کے رواں دواں کاروانِ تگ و دو کا اکثر از سرِ نو جائزہ لیا جاتا ہے اور یہاں یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ماضی کے اس فکرِ اقبال نے بھی کہ اس کا آج کیا RELEVENCE ہے خاص کر ہماری عصری حیثیت کے تعلق سے؟

آج کی نئی دنیا کی خصوصیت، جیسا کہ سبھی جانتے ہیں، یہ ہے کہ اس نے نوعِ انسانی کی مجموعی زندگی کی بابت جدید اندازِ فکر اور جدید رویے اپنائے ہیں جو کہ تہذیب و ثقافت اور ادب کے تمام پہلوؤں پر محیط ہیں۔ اس طرح جب ہم نوعِ انسانی کے سفرِ حیات کی شش کر منزل کے ضمن میں عہدِ جدید کے مفکرین کی دین کا جائزہ لیتے ہیں تو اقبال بھی ایک ایسی پُر وقار شخصیت کی صورت میں ہمارے سامنے ابھر آتے ہیں، جو عہدِ ماضی کے تمام تنگ و تاریک غلط اندازِ فکر و عمل اور غلط فہمیوں کو دور کرکے نئے روشن طریق کار اور رویوں سے سماج کو روشناس کرنے کے لیے ہاتھ میں ایک روشن مشعل لیے ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں تاکہ دنیا مساوات، اخوت اور سماجی انصاف کی تابناک خوب صورتیوں سے مزین ہوسکے۔

اقبال نے اپنے عہد کے مشرق و مغرب کے

سیاسی اور سماجی حالات کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کی اس بصیرت کا اندازہ کرنے کے لیے ملاحظہ ہو

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب کسی کا مرکب کسی کو عبرت کا تازیانہ

پھر اس مطالعہ اور مشاہدے کے دوران، اقبال جس نتیجے پر پہنچے اس کے پیشِ نظر انھوں نے مغربی طاقتوں کے مشرقی ممالک پر سامراجی تسلط پر سخت تنقید کی تھی۔ پھر ایک طرف انھوں نے مغربی تہذیب کو رد کرتے ہوئے کہا تھا۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

دوسری طرف انھوں نے مشرقی اقوام کی اخلاقی قوتوں کو ابھارنے اور انھیں تقویت پہنچانے کی غرض سے ان میں ان کی اپنی تہذیب اور ان کی اپنی تاریخ کے قابلِ فخر سرمایہ کے احساس کو تازہ کیا کیوں کہ اقبال کو غلامی اور غلامانہ ذہنیت اور کردار سے سخت نفرت تھی۔ اس لیے کہا تھا۔

غلامی کیا ہے ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

اس کے علاوہ اقبال نے اپنے ہم وطنوں کو بیدار کرنے اور انھیں ان کی حریت، جمہوریت اور سماجی انصاف کی برکتوں سے واقف کرانے کے لیے زبانِ شعر سے ان کی حمیت اور خودداری کو بیدار کیا اور پھر ارتقاء و ارتفاع کی آبرومندانہ راہوں کو ہموار کیا۔ ان کے اس سنہرے پیغام کو یاد کرتے ہوئے جس کا اطلاق دوسری جنگِ عظیم کے بعد، ویٹ نام، الجیریا، امریکہ کے سیاہ فام باشندے، رہوڈیشیا، انگولا، کمپوچیا جیسے حالات و واقعات پر بھی ہو سکتا ہے ہم ان کے ان اشعار پر نئے زاویہ نگاہ سے غور کر سکتے ہیں

نگاہِ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو
ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی
جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

جیسا کہ یہ بات مسلمہ ہے کہ اقبال کی شاعری کا مقصد محض تفننِ طبع یا شعری کمالات کا اظہار نہ تھا بلکہ ان کی شاعری ایک مضبوط اور مکمل نظامِ حیات کی آئینہ دار اور فکری اور عملی توانائیوں کی جلاکاری کا ایک موثر وسیلہ تھی۔ دعوتِ فکر اور پیغامِ عمل کے نور سے ان کی شاعری کے ایوان آج بھی معمور ہیں اس وسیلے سے انھوں نے مشرق کے پسماندہ عوام میں جنھیں ہم آج تیسری دنیا کے نام سے جانتے ہیں، خود اعتمادی کی نئی روح پھونک دی۔ ان میں زندگی کا نیا حوصلہ اور ولولہ بھر دیا۔ اقبال کا فلسفیانہ نظریۂ وجودیت اور خودی کا تصور، مشرق کی اصلاح اور تعمیر کاری کے موثر حربے تھے جن سے لوگوں میں عرفانِ ذات اور زندگی کی تابش و توانائی سے بھرپور خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ علامۂ مشرق کے پیام کا جوہر یہی ہے۔ اس حدیث کی بہتر مثال آج بھی

زمانہ نمو خاص و عام ہے سب
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

بے ذوقِ نمود زندگی موت
تعمیرِ خودی میں ہے خدائی

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

اقبال عملی سیاست کے انقلابی نہ تھے لیکن ان کی فلسفیانہ فکر اور ان کا شاعرانہ احساس و اظہار یقیناً انقلابی روح کے [illegible] تھے۔ ان کا مثالی کردار، ایک انسانِ کامل، جیسا کہ انھوں نے سمجھایا ہے۔ "مردِ مومن" ہے جو شاہین بن کے جس مقامِ اعلیٰ پر پرواز کرتا ہے وہ "عروجِ آدم" کی منزل ہے۔ "مومن" کو مخاطب کرتے ہوئے اس میں اخلاق اور کردار کی نئی جوت جلاتے ہوئے اور اس کی وساطت سے سارے عالمِ مشرق میں اس روح کو بیدار کرتے ہوئے اقبال نے اسے یقین دلایا کہ وہ مغرب کی سامراجیت پر بھی غالب آ سکتا ہے اور پھر مشرق کی شاندار تاریخ کی از سرِ نو تعمیر و تدوین کر سکتا ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مقامی سیاق و سباق کی طرف لوٹتے ہوئے جب ہم اقبال کے عہد پر نظر ڈالتے ہیں تو حقائق کچھ اس طرح سامنے آتے ہیں کہ اقبال انیسویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوئے تھے اس لیے ان کی فکری اور ذہنی نشوونما پر اس زمانے کے انقلابی محرکات کا اثر انداز ہونا فطری امر تھا۔ اس طرح اقبال کے مزاج اور فکر میں اس انقلاب کی حرارت اور اس آتشِ دوراں کے اثرات سے برابر کرشمے تھے جن کا مقصد ہندوستان، ایشیا، افریقہ اور دوسرے ممالک میں جنھیں ہم آج تیسری دنیا کا نام دیتے ہیں، سماجی، سیاسی، اور معاشی انقلاب رونما کرنا تھا۔ اقبال نے راجہ رام موہن رائے، سرسید احمد خاں اور اروبندو جیسے مفکرین و مصلحین کی جانب سے چلائی گئی اصلاحی و تعمیری تحریکات کا نہ صرف خیر مقدم کیا بلکہ انھوں نے اپنی شاعری کی حرارت سے اس عہد کے انقلاب کی رفتار تیز تر کر دی۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی طرح اس فلسفی شاعر نے بھی برصغیر کے فکری رویوں اور میلانات کو بھی اس حد تک متاثر کیا ہے کہ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اس عہد کی تخلیقات پر اقبال کے اثر کی ناقابلِ انکار چھاپ ہے۔

ہندوستان کی ثقافتی وراثت میں اقبال برابر کے حصہ دار تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کی رفتار و روش کی صورت گری میں نمایاں رول ادا کیا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ انسان اور سماج کے رویہ اور کردار کی تشکیلِ جدید ہو۔ اقبال نے زندگی اور کائنات کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر

سے اپنے زمانے کے لوگوں کے فکری سوتوں کو چھیڑتے ہوئے احساس اور اظہار کی نئی جہتوں کو اپنے شعلہ بار انفاس سے گرمایا جو کچھ اپنے وطن میں ہو رہا تھا اور جو کچھ ترکی، ایران اور افریقہ میں ہو رہا تھا، اقبال اس کے محض ایک غیر متحرک تماشائی بن کے رہ نہیں سکتے تھے۔ انگلستان اور جرمنی میں ان کی تعلیمی، تحقیقی مصروفیات اور ان کے قیام پھر وہاں کے علمی اور ادبی دنیا کے مشاہیر سے ان کی ملاقات اور گفتگو ان کے عہد کے نشیب و فراز کو سمجھنے اور سمجھانے میں ان کی مددگار ثابت ہوئی۔

اقبال نے سامراجی طاقت کو اس کے اپنے شباب اور عروج کے دور میں بھی کبھی ناقابلِ تسخیر نہیں سمجھا۔ انھوں نے بار بار ایشیائی اور ارتقائی طاقتوں کو ان کی عظمتِ رفتہ سے باخبر کیا اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بشارت دی کہ مشرق سے ہی پھر ایک نیا سورج، نئی اور بھرپور زندگی کا پیام لے کر ابھرے گا

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

اقبال کے تصورات کی نئی دنیا حقیقی معنوں میں تیسری دنیا کے حقیقی اتحاد اور ترقی کی وہ دنیا تھی جو مغرب کی بدصورت استبدادیت کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے قابل ہو۔ اور پھر اس دنیا سے جو نئے سورج ابھرے انھیں دنیا نے کبھی بنڈونگ کانفرنس کا نام دیا کبھی غیر جانب دار ممالک کے اتحاد سے تعبیر کیا۔ افروایشین رائٹرس اسوسی ایشن بھی اسی سورج کا ایک سفر ہے۔ اس طرح ہم

بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کی فکر سا
پر بڑی گہرائی سے اثر انداز ہوئی تھی۔ د
کامیابی کی اہم کلید اور جدیدیت کی عظیم اد
کی نشاندہی تھی۔

'زبورِ عجم' کے مطالعے سے وا
پتہ چلتا ہے کہ اقبال نے مغرب کے اف
علمیت کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا ہے۔
علاوہ بہ نظرِ غائر مطالعہ کریں تو معلوم
یورپ کے علم اور دانش کے اس میکانی
نظام کو اور طریقۂ کار کو رد کر دیا جو ایشیا
کے بیشتر ممالک میں یوروپی اقوام کے تر
میں ظاہر ہوا تھا۔ اقبال نے ہمیشہ فرد
کی ایسی آزادی کی وکالت کی ہے جو نو
وقار اور احترام پر مبنی ہو۔ دوسرے لف
انھوں نے بین الاقوامی سرحدوں میں ترق
یافتہ ممالک پر، ان کی کمزوریوں کا فائدہ
انسانی حقوق، آزادی اور ان کے فا
کے استفادہ سے محروم کرتے ہوئے
قبضے اور بڑی طاقتوں کے سامراجی تر
سے مخالفت کی ہے اور اس کے برعکس
نوعِ انسانی کی اخوت اور ان کے بھلا
اقوام اور ملکوں کی حریت اور بین الاقوا
آزادی کامل اور معاشی خوشحالی کی
جس میں انصاف پر مبنی تقسیم دولت
مثالی نظام ہو جس سے ہر ایک کو سماجی
حاصل ہو سکے۔ منشورِ اقوامِ متحدہ کی ا

ہے ۔ بہرکیف انھوں نے تنگ نظر قوم پرستی اور مغرب کی مادہ پرستی پر ضرب لگائی اور ایک ایسی حکمت عملی کی دعوت دی جس میں سیاست، اخلاقی قدریں اور انسان دوستی سب باہم شیر و شکر ہوں کہتے ہیں ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہماری یہ دنیا، دراصل بڑے پیمانے پر اختلافات رنگ و بو خاص کر ثقافتی، مذہبی، سیاسی اور لسانیاتی دائروں کی رنگا رنگی کا ایک مجموعہ ہے آج بھی علم کے عام ہو جانے اور زندگی کے ہر شعبے میں ترقیات اور فروغ کے سلسلوں کے تواتر کے باوجود ہم محسوس کرتے ہیں کہ ان زمروں میں ہنوز بڑی خلیجیں موجود ہیں ۔ آج کی جدید حسیت کا بنیادی کام ان خلیجوں کو وسیع سے وسیع تر کرنا ہے تاکہ ہر قسم کے فروعی اختلافات دور ہوں اور تمام اقوام اور کل نوع انسانی زیادہ بہتر طریقے پر ایک دوسرے سے مستفید ہو سکیں ۔ اقوام متحدہ کے منشور میں بھی جا بجا اس طرف اشارے ملتے ہیں ۔ خود اقبال جو ہمارے عہد کے ایک برگزیدہ مفکر تھے دنیا کے مختلف دانشوروں کے نقاط نظر پر بلا کسی امتیازی تفریق کے یکساں طور پر غور کیا اور انھیں سمجھنے کی کوشش کی ۔ ان دانشوروں میں نطشے، شوپن ہاور، مارکس، لینن، غزالی، جلال الدین رومی، ڈارون، اینشٹائین، میکٹاگریٹ، وہائٹ ہیڈ اور برگساں، بھرتری، غالب، گیٹے، ٹیپو سلطان اور نہرو قابل ذکر ہیں ۔ اقبال کے لیے اسلام اور قرآن زندگی کے آدرش اور مثالی نصب العین ہیں لیکن ساتھ ہی وہ بھگوان کرشن، وشو متر، رام اور گرو نانک کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں ان کے ہاں اسلامی فکر زرتشتی فکر ہند و فکر اور مغربی فکر کی چاشنی کی وسیع آمیزش ملتی ہے ۔ ایسی غیر متعصب، انسان دوست عالی ظرف اور شفاف شخصیت تھی اقبال کی جس کے آئینے میں ہر شخص اپنے آپ کو اپنی آرزوؤں، جذبات اور احساسات کو منعکس دیکھ سکتا ہے ۔ ان کے سوچنے کا انداز بلاشبہ وسعت میں ہمہ گیر اور ارتفاع میں ہمہ جہت تھا جو انسانی زندگی کے لامحدود کینوس پر محیط ہے ۔ اس طرح اقبال کو صحیح معنوں میں ایشیائی ممالک کے ساتھ ساتھ ساری نسل انسانی کی بیداری کا مفکر شاعر کہا جا سکتا ہے ۔ ان کی سب سے بڑی دین ان کا فلسفۂ خودی ہے ۔ جس میں یہ بات مضمر ہے کہ انسان کائنات میں خالق کائنات کا نائب ہے اور اس "نامکمل" دنیا کو "تکمیل" کی طرف لے جانا اس کا فرض منصبی ہے ۔ میرے خیال میں آج کے عہد جدید کے انسان کا سب سے اہم اور اعلیٰ مقصد یہی ہونا چاہیے ۔ یہاں اقبال نے محض منزل ہی کی نشاندہی نہیں کی ہے بلکہ سفر اور جادۂ سفر کے بارے میں بھی روشنی فراہم کی ہے ۔ خودی کا جامع نظریہ اور عشق کا جامع تصور وہ طاقتیں ہیں جو انسان کو اس سفر پر مائل کرتی ہیں اور پھر منزل مقصود تک بھی لے جاتی ہیں ۔ یہ ایک طرف تو روحانی جذبات کو بیدار کرتی ہیں تو دوسری طرف

وہ مادی اور جسمانی توانائیوں کو بھی ختم کر دیتی ہیں اس سے بھی انسان، جہاں اپنے وجود، نفس اور ضمیر کا کامل عرفان حاصل کرتا ہے وہیں اپنی زندگی کے تعمیری اور تخلیقی کردار کی قدر و قیمت سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے۔ معرفت کے اس عالم میں وہ محبت، محنت، زندگی اور کائنات حق کے وقار سے بھی بہرہ ور ہو جاتا ہے۔ اقبال کی فکر اور ان کے پیام کا بغور مطالعہ کیا جائے اور گہرائی سے تجزیہ کیا جائے تو یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ ان کا فلسفہ، آس پاس اور ماحول سے آگاہی اور ساز و سامان کے علم کی تلقین بھی کرتا ہے۔ ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال نے عشق کو علم پر فوقیت دی ہے۔ اپنی نظم "علم اور عشق" میں اقبال نے علم کو "متاعِ صفات" سے تعبیر کیا ہے جب کہ عشق کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ "مکان و مکین" ہے "زمان و زمیں" ہے۔ مزید ارشاد فرماتے ہیں کہ

عشق سراپا یقین اور یقین فتحِ باب

ایک اور مقام پر اقبال نے عمل، محبت اور جد و جہد کی عظمت کی وضاحت کرتے ہوئے فرد اور سماج کے مسائل کو بھی ذہن میں رکھتے ہوئے کہا ہے کہ ؎

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

پھر آگے چل کے اسی خونِ جگر کی معجزہ کاری کی تفسیر یوں فرماتے ہیں ؎

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

مختصر یہ کہ اقبال نے ایک ایسے وقت فکری و ذہنی قیادت فراہم کی جب کہ جمود اور پست ہمتی انسانوں اور قوموں کا مقدر بن چکے تھے۔ ایسے میں بیدار ہونے، سرگرمِ عمل ہونے، ایک بہتر جہانِ نو اور ایک بہتر زندگی کی تعمیر اور ترتیب کے لیے ساری نوعِ انسانی کو دعوتِ فکر و عمل دی۔ اس کی شعاعیں ہمارے ذہنوں تک آج بھی پہنچ رہی ہیں، دلوں کو گرما رہی ہیں۔ انھوں نے اس عمل کو ایک مضبوط اور مستقل تحریک اور ایک مسلسل جد و جہد کے طور پر جاری رکھنے کی بھی ترغیب دی ہے

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

غرض ان کی درسیات اور تعلیمات کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کامل اور جہدِ مسلسل سے عاری کوئی بھی عمل، زندگی کی حرکت نہیں بلکہ موت ہے۔ ان کے الفاظ میں:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

اس کے علاوہ اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ ؎

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

(باقی صفحہ [illegible] پر دیکھیے)

ایوب خاور

ماں

ماں تیرے قدموں تلے جب راکھ اُڑتی ہے
تو سینے میں خلا جیسی کوئی شے گونجتی ہے
میری بینائی کے حصے میں تو اب تک صرف تیرے چُپ لبوں کا زہر آیا ہے
میری بینائی
جس نے آج تک تیرے سلگتے ہوئے قدموں کے نیچے راکھ دیکھی ہے
بھرے کھیتوں کی فصلوں کا نمو والی جوانی
زرد پھولوں کی طرح سنسان آنکھوں کی کہانی کہتے کہتے آج کس منزل پہ پہنچی ہے
مجھے اس کی خبر بھی تو نہیں

تیرے محبت ڈھونے والے دل نے
اپنی اُجرتوں میں اپنے بیٹوں کے علاوہ کیا نہیں پایا
مجھے اس کی خبر بھی تو نہیں

ہم خشک پتوں کو جلا کر سردیوں میں
اپنے چھوٹے چھوٹے ذہنوں کو بڑے لوگوں کے قصے بانٹتے تھے
اور تیری جاگتی آنکھوں کی لَو میں خواب جیسی کوئی دنیا دیکھتے تھے
صبحِ کاذب کی صدا
چکی کے پاٹوں اور تیرے ہاتھ کے چھالوں کے بیچ اک گیت کی صورت
اُترتی تھی

وہ گیت اب کھو گیا ہے
تری اب چپ بھلی ہے اس اُجالے کا دیا ہے
مرے [illegible] ہے

مگر کچھ بولتا بھی تو نہیں
اقرار کی ساعت ہمیشہ سے ادھوری ہے

نہ جانے کونسا کوہ گراں ہے تیرے ہاتھوں پر
کہ اب تک تیرے ہاتھوں کے لیے پہرا تر ستا ہے
تجھے دیکھوں تو جی یہ چاہتا ہے
تجھ سے پوچھوں
ماں ——— یہ کن روگی زمانوں کے بھروسے پر ابھی تک جی رہی ہو
کون سے صحراؤں میں اب تک تیرے دریا روانی رو رہے ہیں
کون سے دشت و جبل ہیں جن میں تیری عمر کا بے رنگ سناٹا
سفر طے کر رہا ہے
اور یہ کن گرد دیواروں کے سائے میں تیری تقدیر کی چمپا چمبیلی بجھ رہے ہیں
کچھ تو بول
زمیں پر گر کے سورج کیوں ترے رستوں میں ٹکڑے ہو گیا ہے
کچھ تو بول

یہ تو ہے
یہ کوئی خیمہ طنابوں کی شکست آثار مٹھی سے نکل کر
زرد موسم کی ہوا میں لڑکھڑاتا ہے

یہ میں ہوں
یا کوئی سایہ تری ممتا کی ٹھنڈی روشنی سے ٹوٹ کر
پامال اندھیروں میں ڈوبتا جاتا ہے

ہم دونوں
محبت کی گواہی کی طلب میں
اپنے اپنے دل کی جانب رخ کئے اپنے خدا سے پوچھتے ہیں
حشر کب تک آئے گا!

رعنا حیدری

یہ بھی شعلہ یہ بھی شبنم

کون سے روز کی رُوداد سنائیں تم کو
جب کہ دل چونک اٹھا، درد کی سوغات ملی ؟
یا کہ جب اشک نے آنکھوں میں اُترنا سیکھا ؟
یہ بھی کہہ دیں کہ کبھی شام کو جی بیٹھ گیا
اور آنکھوں میں کٹی رات کبھی
صبح آتی رہی امید کا پیغام لیے
کسی دامن کی سمیٹے ہوئے سوندھی خوشبو
منزلِ جاناں مگر آنکھ سے اوجھل ہی رہی
پاؤں اٹھتے رہے ہر روز نیا عزم لیے
وقت مرہم ہے ہر اک گھاؤ بھی بھر جائے گا
کیا خبر تھی کہ زمانوں کو بھی موت آتی ہے
دَور خوشیوں کے، فراغت کے بھی مر جاتے ہیں
عہدِ الفت کے، ریاضت کے بھی مر جاتے ہیں
زہرِ نفرت ہی بچا کرتا ہے نسلوں کے لیے !
ہر طرف اُڑتی ہوئی گرد
گھٹتی سانسیں
اُبلتی آنکھیں
دور رہتی ہیں لپکتی ہیں تو کلیوں کی طرف

(سب یہ کہتے ہیں کہ تقدیر کا لکھا تھا یہی)
زخم رہنے دو یونہی اور یوں ہی رِسنے دو
پیپ اور خون کے اس دَور کو ہنس کر سہہ لو
اپنی گذری ہوئی خوشیوں کا یہ کفارہ
سر جھکائے ہوئے، بے نور سی آنکھوں سے
ادا کرتے رہو
آنکھ تو روح بھی ہے۔ دل بھی ہے
جسم اندھا ہے جو دیوانہ بنا سکتا ہے
چند فرزانے، ہر اک دَور کے زندہ انسان
اپنے پیالوں میں اپنا ہی لہو ڈالے ہوئے
بڑی منت سے ہر اک جسم کو دیتے ہیں مداوا کے لیے
جیسے وہ خون نہ ہو
گھولی ہوئی تعویذ کی تحریریں ہوں
قطرہ قطرہ یہ لہو اور مقدس الفاظ
ان کے جسموں میں رواں
ان کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے دھیرے دھیرے
بس اسی آس پہ آتے ہیں کہ
زیست مگر
جو کبھی ذرّہ ہے
اور جو ہر ہے کبھی
کسی انسان میں سما جائے تو شبنم بن جائے
اور پتھر میں اتر جائے تو شعلہ بن جائے

نظام الدین نظام

O

سناٹا چیختا رہا خالی مکان کا
نازل ہوا عذاب بڑی آن بان کا

آئے گا بات بات پہ اظہار کا خیال
روٹے گا پھوٹ پھوٹ کے چھالا زبان کا

بھیگا ہوا تھا گاؤں کے پنگھٹ کا راستہ
احساس تشنہ لب تھا سفر کی تکان کا

نکلی تھی ایک بات کسی کے شکار کی
آیا تھا ایک تیر کسی کی کمان کا

جاتے ہوئے ندیم کے ہمراہ بزم میں
اک قافلہ رواں ہوا وہم و گمان کا

پرواز، احتمال کے شعلوں کے درمیان
درپیش اجتہاد تھا پہلی اڑان کا

منزل کے آس پاس بھٹکتا رہا نظام
پایا نہیں سراغ بھی کھوئے نشان کا

غیاث صدیقی

O

جب تو نے "کن" کہا تھا مخاطب سے تب سے ہیں
پروردگار، ہم تری دنیا میں کب سے ہیں
گرداب میں گرے تھے مگر سرخ رو اٹھے
حاصل ہیں تاج و تخت مگر جاں طلب سے ہیں
ہر گوشۂ جمال میں سرگوشیاں ہوئیں
کچھ پھول آشنا ترے رخسار و لب سے ہیں
لیلیٰ سے اور شیریں سے راہ رضا ہے ہم کلام
اردو ادب کے رشتے ہمارے عرب سے ہیں
علم و عمل کے سامنے جھکتے رہے غیاث
کیوں بے ادب کے روبرو دیکھے ادب سے ہیں

آدم شیخ

کتاب شناسی

مرحوم پطرس نے اپنے ایک مضمون میں ایک ایسے نیک خصلت کتے کا تذکرہ کیا ہے جو بیچ سڑک آنکھیں موندے اور دُم دبائے، لیٹا ہوا ہے۔ راہگیروں میں جو شریف ہیں، وہ کتے کو اپنے سے بچاتے ہوئے نکل جاتے ہیں اور بعض بدبخت اُسے خواہ مخواہ ٹھوکر لگا جاتے ہیں۔ اس واقعہ سے سبق یہ ملا کہ بھونکنے کاٹنے کے علاوہ انسان کا کام بھی قدرت نے کتوں کے سپرد کر رکھا ہے اور افسوس اس بات کا ہوا کہ انسان کو اپنی شرافت اور خباثت پہچاننے کے لیے کتوں کا شرمندۂ احسان ہونا پڑا، اسی بنا پر بعض اشرف المخلوقات قسم کے انسان پطرس سے محض اسی لیے بدظن ہیں کہ اس نے کتے کو انسانی شناخت کی کسوٹی بنا کر، "ان شریفوں کی شرافت کا اڑایا ہے مذاق"۔

استاذی مرحوم پروفیسر بازیگر، کتوں سے اپنی محبت کی بنا پر، اس معاملے میں پطرس کے طرفدار تھے، اکثر فرماتے تھے کہ پطرس کا کتا خود انہی کی طرح ایک ایسا پہنچا ہوا مبصر ہے جو سر راہ بیٹھا بدل کر تماشائے اہل کرم دیکھتا تھا۔ استاذی مرحوم کی یہ خدا لگتی بات میرے دل کو کچھ ایسی لگی کہ آج بھی جب کوئی کتا دکھائی پڑتا ہے تو بے اختیار مرحوم کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

بات چلی تھی کتاب شناسی کی اور پہنچی کتا شناسی تک۔ اس ذہنی ترنگ کی شانِ نزول یہ ہے کہ خاکسار "نالۂ ادب" نامی رسالے میں ایک کتاب "اردو پر ــــ انقلابِ فرانس کے اثرات" پر ایک ممتاز اہلِ قلم کا تبصرہ پڑھ رہا تھا کہ اچانک یہ الہام ہوا کہ تبصرہ نگار بھی پطرس کے کتے کی طرح بھلی بری کتابوں کی کسوٹی بن کر بازاروں اور چوراہوں پر آ گئے ہیں اور ایسا اس لیے ہوا آج کے ہر فن کار کی انفرادیت لا اعتدالی، بے اصولی اور آزادی کی اس قدر خوگر ہو چکی ہے کہ اردو گھروں کی ٹوٹتی ہوئی دیواروں اور اردو اکاڈمیوں کے درباروں میں اس کا دم گھٹنے لگا ہے اور کھلی ہواؤں کی جستجو نے اسے زندگی سے بھٹکی ہوئی راہوں پر لا کھڑا کیا ہے شاید اسی لیے بہت سے تبصرہ نگار خریدار نہ ہونے کے باوجود بازار سے گزرتے رہتے ہیں اور کسی نہ کسی کتاب سے ٹکرا کر اپنے تبصرہ نگار ہونے کا ثبوت فراہم کرتے رہتے ہیں۔ گو کہ ہمارے مبصر، کتابوں کی سنسرشپ کو اپنا موروثی حق سمجھتے ہیں لیکن

ان کے طرزِ عمل میں پطرس کے کُتّے جیسا سلیقہ، صبر اور دیانت داری نظر نہیں آتی۔ ہمارے کرم فرما ہر اچھی بری کتاب کو اپنی علمیت اور انانیت کے لیے ٹھوکر سمجھ کر تلملا اٹھتے ہیں اور اُن کی تحریریں ذاتی تاثرات و تعصبات کی ترجمان بن جاتی ہیں۔ بعض بے ضرر قسم کے تبصرہ نگار تو ٹائٹل کی خوبصورتی، کاغذ کی چکنائی، کتابت کے پیچ و خم اور قیمت کی گرانی اور ارزانی کو ہی تبصرہ نگاری سمجھ بیٹھے ہیں۔

اُردو ادب کی طویل اور ہیجان انگیز تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس کائنات میں اکثر تبصرہ نگار تخلیقی میدان کے ہارے ہوئے پیادے ہیں جو لایعنی اور بے سود تبصرے لکھ لکھ کر اپنی شکست کا انتقام لے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اُردو میں تبصرہ نگاری کی وبا کو عام کرنے میں وقت کی قلت کے علاوہ ذہنی اور مالی افلاس کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ہمارے پاس کتابیں خرید کر پڑھنے کا وقت نہیں (مفت کی کتابیں پڑھنے کا ہے) اور اگر بالفرضِ محال رسائل اور کتابیں خرید بھی لیں تو یہ اعتماد نہیں کہ انھیں پڑھ کر اور سمجھ کر ہم اپنے پیسوں کی قیمت وصول کر پائیں گے لہٰذا اپنی ذہانت، دولت اور وقت کو بچانے کا آسان اور تیر بہدف نسخہ یہی قرار پایا کہ مار کٹاری مر جائیں لیکن کتابیں اور رسائل نہ خریدیں اور یہی کٹاری ادیبوں اور شاعروں کے سینوں میں اتار دیں۔

تبصروں سے غریب قارئین کو کوئی فیض پہنچا ہو یا نہ ہو لیکن تبصرہ نگاروں کے مرضِ افلاس و اختلاج کو اس کم خرچ بالانشیں علاج سے کافی افاقہ ہوا ہے۔ وہ حضرات جو ادبی مقبولیت اور اہمیت کو ثابت کرنے کے لیے مفت کے رسائل اور کتابیں حاصل کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں، ہزاروں کتابوں کی لائبریری کے بلا شرکت غیرے مالک بن بیٹھے ہیں۔ حتیٰ کہ "مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے" کے بہ مصداق اردو کے یہ ہمدرد "سنٹرل ریلوے ٹائم ٹیبل"، "ملکہ نورجہاں کا شاہی دسترخوان"، اور "موٹر ڈرائیونگ کے زرّیں اصول" جیسی کتابوں کو "دیوانِ میرؔ"، "امراؤ جان ادا" اور "آتشِ گل" کے پہلو بہ پہلو سجا بیٹھے ہیں۔ ہماری زبان میں بعض رسائل اور اخبارات کا اجرا اسی لیے ہوتا ہے کہ ہر ماہ بیس مربع سنٹی میٹر کے تبصرے چھاپ کر دو سو کتابیں آسانی سے اینٹھی جا سکتی ہیں۔ یہاں یہ ملحوظِ خاطر رہے کہ اُردو کا کوئی بھی تبصرہ نگار ایک ہی کتاب کے دو نسخے بٹورے بغیر قلم چلا ہی نہیں سکتا، اس میں رمز یہ ہے کہ تبصرہ نگار کے ساتھ ساتھ رسالے کا پبلشر، پرنٹر اور ایڈیٹر (اُردو میں یہ تینوں صفات ایک ہی ذات میں مجتمع رہتی ہیں) بھی غریب فن کار کے خون کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو سکے۔

اب ان کو کون سمجھائے کہ تخلیق وجود نہ ہو تو تبصروں کی، ایک جان لیوا عمل ہے کہ اس سے زندگی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مبصر جگر سوزی اور عرق ریزی کے بعد ہی قلم اٹھانے کی ہمت کر پاتے ہیں جب کہ ہمارے

ہل انگار شہسواریوں ہی تلوار اٹھا کر فن و ادب کی
ُوں ریزی شروع کر دیتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو وہ
ور لوگ ہوں گے جنھیں اس دشت میں مشکلات کا
سامنا کرنا پڑتا ہوگا، ہم جیسی خوگردد، امت نے تو
شکلات سے چشم پوشی کر کے معاملات پر کچھ اس طرح
ابو پالیا ہے کہ تبصرہ نگاری ہمارے گھر کی لونڈی
ین کر رہ گئی ہے جسے ہم جب چاہیں اور جس طرح
چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ انگریز تبصرہ نگار سینٹ
بیو۔ کس قدر ناعاقبت اندیش تھا کہ ایک چھوٹے
سے تبصرے پر ہفتے کے سات دن اور دن کے
بارہ گھنٹے سر کھپاتا تھا ورنہ ہماری دنیا میں تو ایسی
ایسی خدا رسیدہ اور سگ گزیدہ ہستیاں موجود ہیں
کہ ایک گھنٹے میں ساٹھ کتابوں پر تبصرے گھسیٹ
دیں اور پانی تک نہ پئیں۔ یوں بھی اس قبیل کے بزرگ
لکھنے وقت پانی کے علاوہ کچھ اور پیتے رہتے ہیں
اور اُن کے تبصرے دیکھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا
ہے کہ یہ قلم کار "کچھ اور" پینے کے بجائے صرف پانی
پئیں تو اُن کے تبصرے بہکے ہوئے نظر نہ آئیں۔

کالرج (Coleridge) نے تبصرہ نگاری
کو ایک مستقل فن کی حیثیت دی اور "امام المبصرین"
بن بیٹھا۔ بعد کے آنے والے معتقدوں نے کالرج
کی شریعت میں کئی بدعتوں کا اضافہ کیا اور گمراہی کا شکار
ہوگئے اور بے اصولی اور سودے بازی کو اصولوں
کی لچک کا خوب صورت نام دے کر دھڑلے سے
قصیدہ خوانی اور تبرہ بازی کرنے لگے۔ تبصروں کو تول
کر بیچنے والے کاروباری مبصروں کی مرادیں بر آئیں

سوئنبرن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تبصرہ نگار وہ ہے
جو ہاتھ میں ترازو پکڑے بیٹھا ہے اور بقول
ظ انصاری "وہ ترازو میں مینڈک نہیں تولتا
کون کافر اس سے انکار کرتا ہے کہ تبصرہ نگاری
کے پلڑوں میں، آج مینڈک نہیں بلکہ مروت، تعلقات
سکے، عہدے اور مستقبل کے سنہرے خواب ملتے ہیں
اپنے منہ اپنی تعریف کرنے کا اس سے
زیادہ قابلِ تعریف اور کوئی گر نہیں ہے کہ آدمی لوک
لاج کا خیال کئے بغیر تبصرہ نگاری شروع کر دے
اسی لیے بسا اوقات تبصرے پڑھ کر قاری کو کتاب
سے زیادہ کتاب شناس سے واقفیت حاصل ہو جاتی
ہے۔ استاذی مرحوم جنھیں ہم شاگرد ان کے تبصروں
کی وجہ سے اردو کا طٰہٰ حسین کہتے تھے (واضح رہے
کہ استاذی مرحوم طٰہٰ حسین کی طرح بظاہر نابینا
نہیں تھے)، اکثر کتاب شناسی کی پگڈنڈیوں سے گزر
کر خودستائی کی منزل پر پہنچ جاتے تھے۔ جب بھی
مرحوم، اپنے کسی شاگرد کا لکھا ہوا کچا تبصرہ چھپواتے
شہر کے لوگ ان کے پیچھے پڑ جاتے (آٹوگراف
کے لیے) اور چند برخود غلط قسم کے سیانے قارئین
سرِ بازار ان کی مزاج پرسی کرنے لگتے۔

ہندوستان سے خاندانِ عاشقاں اور
معماراں یعنی مغل حکمرانوں کا دور ختم ہوا تو وہ اشخاص
جن کا پیشہ سات پشتوں سے سپہ گری تھا اور شمشیر زنی
اور تیر اندازی جن کی گھٹی میں پڑی تھی، اپنے جذبۂ
حرب و ضرب کی تسکین کے نئے نئے راستے
ڈھونڈنے لگے لہٰذا شمشیر زنی، تیر باری پر ختم

ہولی اور تیر اندازی پتنگ بازی سے بدل گئی ریشمی حسیناؤں کے صندلی بدن ٹٹولتے والے کڑیل جوان داستانوں کی افیون کھا کر سرشار ہو گئے لیکن جو حل طلب مسئلہ تھا وہ یہ کہ صدیوں درباروں اور سرکاروں کے منہ چڑھے یاوہ گو اور فحش گفتار کیسے اپنے لب سی لیں اور سکون سے جی لیں۔ بھلا ہو تبصرہ نگاری کا کہ اس آڑے وقت وہ کام آئی، خدا کی اس مخلوق کو اس کے دامن میں پناہ ملی جہاں انھیں مکمل تسکین حاصل ہوئی۔ طعن و تشنیع، طنز و نشتر، سب و شتم اور ضلع جگت وغیرہ کا اردو تبصروں میں کھل کر استعمال ہوا اور اہلِ اردو کو گالم گلوج کے لیے الفاظ و تراکیب کا بیش بہا خزانہ ہاتھ لگا۔ اس قسم کے تبصروں میں تبصرہ نگار، دوسروں کی عزت کا خیال کرتے ہوئے اپنا پورا نام نہیں دیتا بلکہ چند حروف کے پس منظر سے فاتحانہ جھانکتا ہے۔ پروفیسر بازیگر تمثیلاً "حف" اور پنڈت پنا لال اگروال کے نام پیش کرتے تھے اسی نکتے کے پیشِ نظر "حف" اپنے تبصروں کے آخر میں "ح ف" اور پنڈت پنا لال اگروال "پلا" لکھا کرتے تھے۔

موجودہ دور میں اردو نے فساد پھیلانے اور ووٹ دلانے کے علاوہ ایک کارِ خیر یہ بھی کیا کہ اس کے تبصروں نے بہت سے دانشوروں کی علمی اور کم آگاہی کو روزِ روشن کی طرح آشکار کر دیا گو تبصرہ نگاری اردو ادب کی ایسی شاخ بن گئی جس پر بیٹھ کر اردو کا مبصر یہ واضح کر دیتا ہے کہ آیا وہ ہما ہے یا بوم میرے دوست زوردار خاں قدیم قسم کے مبصروں کو ہمیشہ ارنسٹ ہیمنگوے کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کرتے تھے۔ ہیمنگوے ہمیشہ برفانی تودہ کے اصول پر لکھا کرتا تھا جس کا ۸/۱ پانی کے باہر دکھائی دیتا ہے اور ۸/۷ پانی کے اندر رہتا ہے۔ زوردار خاں صاحب کا یقین تھا کہ اردو کے بہت سے مبصر ہیمنگوے کے اس اصول کو اگر اپنالیں تو ان کی صرف ۸/۱ حماقت ہی منظرِ عام پر آئے گی اور اردو زبان و ادب شرمندگی سے بچ جائیں گے۔

دکنی لوک گیت

بچے والی ماں کو ___ بچے کتے[۳۷] پوچھو ___ اللہ صبح اللہ
گنتی نئیں دیوں گی ___ بیٹی میں کھیلتیں دیکھو
اللہ صبح اللہ ___ اللہ صبح اللہ ___ اللہ صبح اللہ

---

۳۷ کتے: ۳۷ باہر کا کھلا حصہ۔

اظہار متین
غزل میں ایک تجربہ

○

میزان میں آزما رہا ہے کوئی
احساس میں پھر کھلا ہے کوئی

میں تو نہ زمیں فلک کی شئے ہوں گو
جانے مجھے کیا سمجھ رہا ہے کوئی

دن رات مرے لہو میں زندہ رہ کر
دیوار بدن کی چاٹتا ہے کوئی

ہے نشہ بلندیوں کا اس منزل میں
سورج کو چراغ کہہ رہا ہے کوئی

سچائی ہے بازگشت کے پس منظر
آدم کسی دشت کی صدا ہے کوئی

سارے در و بام ہو گئے ہیں خالی
آنکھوں میں غبار بھر گیا ہے کوئی

سایہ نہ ہما کا سر پہ پڑنے پائے
شاید کہ فقیر کی دعا ہے کوئی

کس طور کہاں یہ قتل کردے علیم
کب سے مری [illegible] کوئی

٭٭

صاحب جیکب آبادی

○

میں اپنے دور کا شاہِ زباں بریدہ ہوں
مثالِ چرغ مگر صد ہزار دیدہ ہوں

میں مرثیہ بھی نہیں، گو ستم رسیدہ ہوں
ترے جمالِ جہاں سوز کا قصیدہ ہوں

امیدِ صبحِ بہاراں ہوں، شب گزیدہ ہوں
سپہرِ فکر کی دنیائے خوش عقیدہ ہوں

بہت سہی گل و مُل تیری بزم میں لیکن
شکستہ جام ہوں، میں دامنِ دریدہ ہوں

اٹھائے پشت پہ ہوں، بار کتنی صدیوں کا
میں اپنے وقت کی دیوارِ سر خمیدہ ہوں

نہ روکو مجھ کو، مجھے راس ہے بلا نوشی
شراب کیا ہے کہ ہجراں کا سم چشیدہ ہوں

ہے میری ہستی میں چشمِ غزال کی مستی
وہ میرے پیچھے ہے جب کہ خود رمیدہ ہوں

میں محترم سہی مثلِ زبور کیا ہے مجھے
پڑھے گا کون کہ تحریرِ خط کشیدہ ہوں

گہر سے بڑھ کے مری قدر، قدرداں جانے
نہیں میں آبِ صدف، میں تو آبِ دیدہ ہوں

بہارِ باغِ جناں ہے نثارِ نقشِ قدم
پیامِ وصل کا قاصد ہوں، نارسیدہ ہوں

نہیں یہ بات کہ اک دستِ نارسا ہوں میں
کچھ ایسا رنگ ہے مثلِ حنا، پا کشیدہ ہوں

کسی کی زلف کی چھاؤں کی آس میں صاحب
سرابِ دشتِ تمازت [illegible]

شفیع اللہ خان آتش

○

جو لوگ محوِ خواب ہیں پتھر اُچھال کے
ان کو جگا رہا ہوں گُل تر اچھال کے
ہمدرد قاتلوں کی ادائیں تو دیکھیے
آنسو بہا رہے ہیں مرا سر اچھال کے
اب آئینوں کے دیس میں رہنا محال ہے
پتھر پرکھ رہے ہیں ستمگر اچھال کے
قسمت بنا رہی ہے فضاؤں میں زندگی
دیکھیں گے ہم بھی اپنا مقدر اچھال کے
یہ میکدے پہ کونسی افتاد آ پڑی
ہر رند اشکبار ہے ساغر اچھال کے
کتنی نظر فریب بہاروں کی رات ہے
کانٹوں پہ سو رہا ہوں گُل تر اچھال کے
پانی میں ان کا عکس نظر آ رہا ہے راز
جو خشک ہو گئے ہیں سمندر اچھال کے

▲▲

نظیر علی عدیل

○

نہ لاسکی وہ اُجالا ہمارے گھر کے لیے
کیا تھا قتل اندھیروں کا جس سحر کے لیے
نہیں ہے طاقتِ جنبش بھی مرنے والوں میں
مگر بضد ہیں عدم کے نئے سفر کے لیے
خدا کے گھر میں اندھیرا رہے تو فکر نہیں
چراغ کرتے ہیں روشن سب اپنے گھر کے لیے
مرا معاملہ پہلی نظر کا ہے واعظ
سزا کا حکم تو ہے دوسری نظر کے لیے
جلا کے برق نشیمن کو مٹ گئی خود بھی
گھر اپنا پھونک دیا ہے پرائے گھر کے لیے
دکھاؤ جتنی چمک بھی دکھا سکو تارو
ملا ہے وقت تمہیں صرف رات بھر کے لیے
فرازِ طور پہ ہو یا نشیبِ طور میں ہو
نظارہ ہر کہیں ممکن ہے دیدہ ور کے لیے
کہیں سے نقشۂ دیر و حرم اٹھا لاؤ
اک آستاں کی ضرورت ہے میرے سر کے لیے
نہ جانے کیسے ہو آسودگی نظر کی عدیلؔ
نئے نئے ہیں مناظر نظر کے لیے

ابوالفضل سید محمود قادری

دکنی کے چند لوک گیت

لوک گیتوں کی ثقافتی، تہذیبی، تمدنی، اور لسانی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ لوک گیت ہی ہیں جن میں عوامی زندگی مکمل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان کی زبان، ان کا انداز بیان اس مقولے کے مصداق ہوتا ہے کہ "دل سے نکلے، دل میں اترے"۔ لوک گیتوں میں جہاں ایک طرف جذبات کی صداقت ملتی ہے وہیں اظہار و بیان کی بے باکی ایک مسلّم حقیقت کے روپ میں صداقتوں کی ایک وسیع و عریض دنیا سمیٹے ہوئے ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ یوں تو ہندوستان کی کم و بیش ساری زبانوں میں لوک گیت موجود ہیں، لیکن دکنی زبان کے لوک گیتوں کا انداز خاص ہے۔

حسنِ اتفاق سے دکن کو اس بات کا شرف حاصل رہا ہے کہ اردو زبان میں ادب کی اولین تخلیقات اسی خطہ کے رہنے اور بسنے والوں کی یادگار ہیں۔ ابتدائی دور میں ہمارے صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کا اس زبان پر بڑا احسان رہا ہے کہ انھوں نے صدقِ دل اور خلوصِ نیت سے اس کی بڑی خدمت کی ہے اور دکنی زبان، ان کے اور عوام کے درمیان ایک ایسا وسیلہ بنی رہی ہے اس کے نتیجے کے طور پر مذہب اور اس کے متعلقات اس زبان کے ذریعہ عوام تک پہنچتے رہے ہیں۔ دکنی لوک گیتوں میں ہمیں مذہبی عقائد، رسم و رواج، تہذیب و شائستگی کے دلکش مظاہر ملتے ہیں۔ دکنی لوک گیتوں پر جہاں ایک طرف ہمیں مذہب اور معتقدات کی گہری چھاپ ملتی ہے وہیں وہ ہماری سماجی زندگی کے کم و بیش سارے گوشوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے ان میں موضوعات کا تنوع موجود ہے۔

سہاگ نامے، لوری نامے، دکنی لوک گیتوں کی چند اقسام ہیں۔ ان لوک گیتوں کی تعداد ہزاروں میں نہ سہی سیکڑوں میں ضرور موجود ہے، لیکن ان میں مؤخر الذکر یعنی اکھلی و موسل کے دکنی لوک گیتوں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ لوری نامے، چکی اور ڈھولک کے گیت ہمارے سماج میں کافی مقبول ہیں، لیکن اوکھلی اور موسل کے گیت خصوصاً شہری زندگی میں زیادہ مقبول نہیں ہیں۔ بڑی حد تک ان سے ہمارے کان ناآشنا ہیں۔ اس کے برعکس خطۂ دکن کے اکثر دیہاتوں اور قریوں میں ان کا رواج آج بھی ہے۔

جہاں تک اوکھلی کا اجتماعی استعمال کا سوال ہے اس میں یا تو دھان کوٹے جاتے ہیں یا ملیدہ۔ دکنی رسم و رواج اور تہذیب و تمدن میں ملیدے کی آج بھی بڑی اہمیت ہے خوشی کا کاج ہو، یا فاتحہ کی رسم، چھٹی چلہ ہو کہ مہندی منڈوہ، مانجھے کی رسم ہو کہ رسمِ گل پوشی ان سب میں ملیدے کا رواج آج بھی دیہی زندگی میں عام ہے۔ جہاں کہیں کسی تقریب

یا کاج کا جلسہ ہوتا ہے، اڑوس پڑوس کی خواتین رشتے دار اور قریبا کل محلے کی عورتیں جمع ہو جاتی ہیں اور سب مل کر ملیدہ بنانے اور اس کی تیاری میں ہاتھ بٹانے کو ایک طرح سے اپنی اخلاقی ذمہ داری تصور کرتی ہیں۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر مسرت اور عقیدت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رات بھیگنے پر ملیدے کی تیاری شروع ہوتی ہے۔ دالان لال مٹی سے لیپ پوت کر پہلے ہی سے تیار ہے، بورے یا شطرنجی پر درمیان میں ایک صاف چادر بچھی ہے، آٹا پیسنے کے لیے چکی پہلے ہی سے رکھ دی گئی ہے، چکی میں کچھ حد تک نم، پانی میں بھگوئے ہوئے گیہوں پیسے جا رہے ہیں۔ تاکہ آٹا ملیدے کی خاطر کچھ موٹا موٹا رہے چکی کے گیت چل رہے ہیں، تین چار خواتین مل کر چکی پیس رہی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آٹا تیار ہے۔ ساتھ ہی آٹا بھگو دیا گیا، گوندھنے کے بعد پیڑے بنائے جانے لگے، موٹی موٹی روٹیاں بیلی گئیں، مٹی کا توا چولھے پر رکھا ہے، روٹیاں سینکی جا رہی ہیں، اتنے میں چار خواتین نے کوٹنے کی ذمہ داری سنبھالی، جن میں دو اوکھلی کو درمیان میں لیے آمنے سامنے بیٹھ گئیں، ان کی مدد کے لیے دو اور خواتین ان کے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ غرض ان چاروں کے اشتراک سے اوکھلی کی "دھما دھم" شروع ہوئی اور ملیدہ کوٹا جانے لگا۔ دیر تک یہ ملیدہ کوٹنے کی "دھما دھم" کا سلسلہ مکن دکنی لوک گیتوں کے ساتھ بڑے زور و شور سے چلتا رہا۔ ہم نمونتاً یہاں صرف دو[2] اوکھلی کے گیت پیش کرتے ہیں۔ اس میں پہلا گیت بڑی حد تک مذہب کے مخلصانہ اور عقیدت مندانہ جذبات سے مملو ہے:

گیت نمبر (۱)

اللہ ہو جی اللہ۔ اللہ ہو جی اللہ۔ اللہ ہو جی اللہ
پیراں کا عرس — پیر زادے بٹھائے — اللہ ہو جی اللہ
ہری شال کے بھائی — پہلا دین جگائے — اللہ ہو جی اللہ
پیلی شال کے بھائی — پہلا دین جگائے — اللہ ہو جی اللہ
جیو صاحب پاشاہ — پہلا دین جگائے — اللہ ہو جی اللہ
لوٹے کو مٹی — میٹھا بھر کو پوچی — اللہ ہو جی اللہ
میں گھڑ دیتی — مالن جیسی بیٹی — اللہ ہو جی اللہ
اُجلی، اُجلی — وہ کون پیر کی درگاہ[1] — اللہ ہو جی اللہ
دُور سے دُور دِکھتی — خواجہ کا گھر کہ — اللہ ہو جی اللہ
اللہ اللہ بول کو — ایک اک سیڑھی چڑھی — اللہ ہو جی اللہ
ہاتھ میں ناڑا پوڑی — مراد منگتے کھڑی — اللہ ہو جی اللہ
پیر الدین ال کو — کیا کیا منت[2] کیے — اللہ ہو جی اللہ
حضرت خواجہ صاحب — گنبد[3] مقام کیے — اللہ ہو جی اللہ

گیت تبسلسلہ نمبر (۱)۔ (۱) درگاہ (۲) منت (۳) گنبد۔

سہاگن کا ڈولا ــ چلتا چھانوں ے چھاؤں ــ اللہ صوجی اللہ
ڈولے کے راہداری ــ چلتے ننگے پانوں ــ اللہ صوجی اللہ
اللہ صوجی اللہ ــ اللہ صوجی اللہ ــ اللہ صوجی اللہ

دوسرا گیت گھریلو زندگی کے آپسی رشتے ناطوں کا مذاق، سہیلی کی پھبتی، بیٹی داماد کی تعریف و توصیف دیورانی اور جٹھانی کا مشغول، نند بھاوج کے تیکھے طنز و مزاح، بھائی سے محبت، غرض قریبی رشتے ناطوں میں آپسی بجھتی اور ہم آہنگی کے ساتھ جذبات کے بے باک اور مخلصانہ انداز پر مبنی ہے۔

گیت نمبر (۲)

اللہ صوجی اللہ ــ اللہ صوجی اللہ ــ اللہ صوجی اللہ [۱]
اوکلی میں ڈالی ــ سوامن کی گھانی ــ اللہ صوجی اللہ
موسل لے کو آئیں ــ مدد کو دیورانی ــ اللہ صوجی اللہ
دیورانیاں جٹھانیاں ــ مجھے ممّ[۲] کے رانیاں ــ اللہ صوجی اللہ
پنتیئں زر کے ساڑیاں ــ دستیں لگے بھاناں ــ اللہ صوجی اللہ
میرے گھر کے پچھے ــ گاڑی گڑگڑاتی[۳] ــ اللہ صوجی اللہ
وہ کون سہیلی آتی ــ گلا بھر کو موتی ــ اللہ صوجی اللہ
سہیلی سہیلی بول کو ــ بولیوں دل کی بات ــ اللہ صوجی اللہ
سہیلی سے کم ذات ــ لائیے جان کی گھات ــ اللہ صوجی اللہ
بھائی کے گھر کو گئے تو ــ بھاوج آڑ کو ملی تیڑی ــ اللہ صوجی اللہ
رکھ لے ساڑی چولی ــ بھائی سے مل کو چلی ــ اللہ صوجی اللہ
چندن کے ناماں کو ــ لال گنوارے باندو ــ اللہ صوجی اللہ
بھائی میرا جینو ــ بھاوج میری نا مرو ــ اللہ صوجی اللہ
نینبو نارنگیاں سے ــ توڑ گئے ڈالی ــ اللہ صوجی اللہ

ت نمبر ۲: ۔ (۱) اوکلی میں یک مٹھی [illegible] کے لیے ڈالی جانے والی [illegible]۔
(۲) [illegible] سکتا سے زندگی بسر کرنا۔ [illegible] ہے

ڈالی چھوڑ رے مالی — بھتیاں بچے والی — اللہ ھو جی اللہ
بچے والی ماں کو — کو ٹنے تکو دیؤ — اللہ ھو جی اللہ
رو ئین گا اس کا بالا — بیرے دنے بھاؤ — اللہ ھو جی اللہ
گانوں گنگا پور — یہاں سے کیتی دور — اللہ ھو جی اللہ
وہاں کے ریشمی ساڑیاں — پلو موتی چور — اللہ ھو جی اللہ
دور کی شہنائی — نزدیک بجتے آیئے — اللہ ھو جی اللہ
[۱۸] دل میں سمجھو بھائی — بھنا منجالا ہے — اللہ ھو جی اللہ
[۱۹] اُنچی میری ماڑی — بیرن بجلی کا گھوڑا — اللہ ھو جی اللہ
کیسے بھاندوں سیرا — منڈل میں ہات میرا — اللہ ھو جی اللہ
بیٹی لانے گئے تو — بن میں ہو گئی رات — اللہ ھو جی اللہ
[۲۵] چھوٹے دیور سات — میانے اوپر ہات — اللہ ھو جی اللہ
دستگیر کی گائی — دروازے پو آئی — اللہ ھو جی اللہ
چھیڑو نکو بھائی — پرائی ماں کی جائی — اللہ ھو جی اللہ
بیگی بیگی آئے — بیپاری کی چال — اللہ ھو جی اللہ
ہات میں کیا ہے لال — ریشمی رومال — اللہ ھو جی اللہ
میرے گھر کا نالا — پانی جاتا ہے کالا — اللہ ھو جی اللہ
منھ دھوتا ہے متوالا — منڈل کا اُجالا — اللہ ھو جی اللہ
سامنے کا صوفا — دیور دیورانی کا — اللہ ھو جی اللہ
[۳۱] پردہ لہریاں پلنا — کائی کو تگے گوری کا — اللہ ھو جی اللہ
میرے گھر کے پیچھے — بہال کی بھتی — اللہ ھو جی اللہ
کیا بھیجوں رسانا — پیپل پان کی ڈبی — اللہ ھو جی اللہ
اروسنے کھائی کوری — اردے اتاراں کے — اللہ ھو جی اللہ
پانوں پڑتی دیوراں کے — جھلاجے بیرن کے — اللہ ھو جی اللہ
[۳۴] گنوارا بنوائی — رنگین لال جی کا — اللہ ھو جی اللہ
چاند سو تلے گودی کا — محل ہے موتی کا — اللہ ھو جی اللہ
(باقی صفحہ ۱۴۲ پر)

---

۱۳ بن ۱۴ بچے ۱۵ شہنائی ۱۶ [illegible] ۱۷ [illegible] ۱۸ [illegible] ۱۹ اونچی ۲۰ [illegible] ۲۱ [illegible]
۲۲ سہرا [illegible] ۲۳ [illegible] گئے ۲۴ بیٹی ۲۵ جلدی ۲۶ بیوپاری ۲۷ گرمی ۲۸ کمرہ ۲۹ پیچھے ۳۰ [illegible] ۳۱ [illegible] ۳۲ [illegible]
بعد [illegible] ہونا ۳۳ بیر کو جمع [illegible] جھولا —

اردو نامہ — وقار خلیل

اردو کی علمی ادبی تہذیبی خبریں

یکم فروری: عثمانیہ یونیورسٹی کی سینیر پروفیسر اور سابق صدر شعبہ اردو ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے ڈاکٹر راجا جو سے ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے عہدہ کا جائزہ حاصل کیا۔ ڈاکٹر سلطانہ تین سال تک اس عہدہ پر کارگزار رہیں گی۔ موصوفہ کا شمار ملک کے نامور ادیبوں، نقادوں اور اساتذہ میں ہوتا ہے۔

۳ فروری: برطانوی ناول نگار مس باربرا کارٹ لینڈ کا حیدرآباد کے علمی و لسانی نیز ادبی حلقوں میں پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ حیدرآباد ایجوکیشنل اینڈ کلچرل اسوسی ایشن اور مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کی طرف سے استقبالیہ تقریب میں مس باربرا نے عہد آصفی کی چالی تہذیب و تمدن پر مبنی آواز اور روشنی کے پروگرام سے استفادہ کیا۔

۶ فروری: (۸) رکنی پاکستانی صحافیوں کی ٹیم نے حیدرآباد کے اردو اخبارات، عثمانیہ یونیورسٹی اور سالار جنگ میوزیم کا معائنہ کیا اس ٹیم میں مسرز الطاف حسین قریشی (اردو ڈائجسٹ) شاہ علی ظفر (جنگ) اقبال زبیری (مشرق) معین بنگالا اور حفیظ الرحمن (اسوسی ایٹڈ پریس) نثار احمد شیخ (ریڈیو پاکستان) اے بی ایس جعفری (نیشنل پریس) اور محمد علی شیخ (آئی اے پی) قابل ذکر ہیں۔

ادارہ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی نے جناب محمد منظور احمد سابق لکچرار گورنمنٹ سٹی کالج کو رکن مجلس انتظامی منتخب کیا ہے۔ جناب منظور اپنی بے لوث تدریسی، علمی، ادبی خدمات اور شاعرانہ بصیرت و بصارت کے لحاظ سے حیدرآباد کے تہذیبی اور ادبی حلقوں میں عزت و احترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ چند سال پہلے حرف کے نام سے آپ کا شعری مجموعہ قبولیت حاصل کر چکا ہے۔

۱۳ فروری: محفل نوتیق کا ادبی اجلاس محترمہ عبدالقادر کی صدارت میں آراستہ ہوا۔ محترمہ ساجدہ سلطانہ نے "اردو غزل میں محبوب کا تصور" کے زیر عنوان مضمون سنایا۔ خواتین شعرا نے کلام پیش کیا۔ محترمہ سیدہ طیبہ بیگم سکریٹری نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۱۵ فروری: حلقہ ارباب ذوق کا ماہانہ اجلاس نظاس اردو ٹرسٹ لائبریری میں بصدارت جناب معظم حسین منعقد ہوا۔ جناب اختر حسن مددگار معتمد ریاستی اردو اکیڈیمی نے ڈاکٹر احمر لاری کی کتاب "حسرت موہانی حیات اور کارنامے" پر سیر حاصل تبصرہ پیش کیا۔ جناب محمد منظور احمد معتمد اعزازی نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۲۰ فروری: نامور سیاست داں اور دانشور جناب بدرالدین طیب جی نے آزاد میموریل لکچرس زیر اہتمام ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو مخاطب کیا۔ اسلام عصری عالمی مسائل اور ہندو مسلم تعلقات آپ کے لکچرس کا موضوع تھے، صدر انسٹی ٹیوٹ ڈاکٹر میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی نے صدارت

۲۱ فروری: ہندی بیلمک جنگمہ کے زیر اہتمام ڈاکٹر انور معظم کی نظم "قتل" کو رنگ و صدا ڈراما سوسائٹی نے اسٹیج کیا۔ اس موقع پر تلگو اور ہندی کے ڈرامے بھی اسٹیج کیے گئے۔

۲۲ فروری: حضرت جوش ملیح آبادی کا اسلام آباد (پاکستان) میں ۸۴ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ چیف منسٹر مسٹر ٹی انجیا اور جناب مکرم شاہ صدر ریاستی قانون ساز کونسل نے تعزیتی بیانات کے ذریعہ برصغیر کے نامور شاعر حضرت جوش کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔

○ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے امتحانات اردو فاضل، اردو عالم، اردو دانی اور زبان دانی ۲۳ سے ۲۸ فروری تک حیدرآباد اور اضلاع میں ایک ساتھ منعقد ہوئے۔

۲۷ فروری: ممتاز افسانہ نگار، ناول نویس اور ادیبہ محترمہ عصمت چغتائی کو ریاستی اردو اکیڈیمی کی طرف سے ۱۱ ہزار روپے کا دوسرا سالانہ مخدوم ادبی ایوارڈ عطا کیا گیا۔ مولانا حافظ ابو یوسف صدر اردو اکیڈیمی نے اس خوشگوار تقریب کی صدارت کی۔ جناب ایم ایم پانڈے وزیر اردو اکیڈیمی نے عصمت صاحبہ کو ایوارڈ، توصیف نامہ اور شال پیش کرتے ہوئے ان کی ادبی خدمات کو خراج تحسین ادا کیا۔ عصمت چغتائی نے ایوارڈ قبول کرتے ہوئے مخدوم اور حیدرآباد سے اپنی رفاقتوں کی یاد تازہ کی۔ مسز ڈاکٹر حسینی شاہد، فضل الرحمٰن، کے یل ہندرا (ایم یل سی) ابراہیم خاں (نائب صدر اکیڈیمی) نے عصمت چغتائی اور مخدوم کے فکر و فن کو خراج ادا کیا۔ جناب چندر سری واستو ڈائرکٹر و سکریٹری اکیڈیمی نے رپورٹ پیش کی۔ جناب اختر حسن مددگار معتمد اکیڈیمی نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور ڈاکٹر عبدالرزاق ڈپٹی ڈائرکٹر اکیڈیمی نے شکریہ ادا کیا۔

۲۸ فروری: [illegible] شہر حیدرآباد اور چارمینار کے دامن میں واقع مغل پورہ میں انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد کے ادبی اور علمی مرکز "اردو گھر" کا جناب نظیر احمد سابق سفیر سعودی عرب نے شمع روشن کر کے افتتاح کیا۔ جناب شاہ عالم خاں نے صدارت کی۔ نواب میر احمد علی خاں سابق وزیر و صدر ریاستی انجمن نے اردو گھر کے قیام کو جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کی حوصلہ مند مسلسل جدوجہد کا ثمرہ قرار دیا۔ جناب سید مکرم شاہ صدر نشین ریاستی قانون ساز کونسل، محترمہ عصمت چغتائی اور صادقین احمد نے بھی اس خوشگوار اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے اردو گھر کی تکمیل پر اظہارِ مسرت کیا۔ مسز منہاج سکینہ صدر انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ جناب ذہانت علی بیگ نے جناب عابد علی خاں کی تقریر سنائی۔ اردو گھر کے سلسلے میں عوامی طور پر تعاون کے لیے اظہار تشکر کرتے ہوئے جناب عابد نے یہ نوید دی کہ اردو گھر ٹرسٹ ایک لاکھ روپے سے قائم کیا جانے والا ہے جس کے لیے ۴۰ ہزار روپے جمع کیے گئے ہیں۔ اردو گھر میں نصابی کتابوں کی لائبریری اور اردو میں ابتدائی تعلیم کے تدریسی مراکز کے علاوہ گوشۂ حیدرآباد نامی کتب خانہ قائم کیا گیا ہے۔ جناب غلام صادق الدین معتمد انجمن نے شکریہ ادا کیا۔

مارچ ۱۹۸۲ء

۲ر مارچ : سروشٹی آف انڈیا سوسائٹی کی جانب سے مخدوم ادبی ایوارڈ یافتہ ادیبہ محترمہ عصمت چغتائی پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست نے صدارت کی۔ جناب مجتبیٰ حسین اور جناب کے ایم عارف الدین نے عصمت صاحبہ کی شخصیت اور فن پر اظہارِ خیال کیا۔ عصمت چغتائی نے کہا کہ " نئی نسل میں احسن روایات پروان چڑھتے دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ میں جس جذبہ کو پیش کرتی رہا ہوں، نئی نسل بھی انھیں جذبات کی ترسیل میں کوشاں ہے۔

۳ر مارچ : برصغیر کے مور گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ شاعر پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ۸۶ سال کی عمر میں دہلی میں انتقال کر گئے۔ مسٹر یم باگا ریڈی صدر اردو اکیڈیمی، محترمہ عصمت چغتائی، جناب شاذ تمکنت اور جناب کنول پرشاد کنول کے علاوہ جناب مسز سروجنی ناستیو نے تعزیتی بیان میں عمومی احساس کو دہرایا کہ فراق کی وفات سے اردو غزل کا ایک روشن دور ختم ہو گیا۔

○ بین الاقوامی شہرت یافتہ پاکستانی مصور و خطاط جناب صادقین احمد نے اردو گھر میں "روزنامہ سیاست" کی طرف سے منعقدہ پریس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے ہند و پاک کے درمیان آرٹسٹوں اور قلم کاروں کے باہمی تبادلہ کو دونوں ملکوں کے تعلقات میں خوش گواری کے لیے ضروری قرار دیا اور کہا کہ کاش ان کا دورۂ ہند نئے دور کی نوید بنے۔

۴ر مارچ : آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کی گولڈن جوبلی تقاریب کے لیے ۵ ہزار روپے کی گرانٹ منظور کی۔

○ روزنامہ سیاست حیدرآباد کے زیرِ اہتمام "اردو گھر" میں پاکستانی مصور و خطاط جناب صادقین احمد کے آرٹ اور خطاطی کی نمائش کا افتتاح جناب سکندر شاہ صدر نشین ریاستی قانون ساز کونسل نے کیا۔ جناب شاہ عالم خاں رکن سینٹ عثمانیہ یونی ورسٹی نے صدارت کی۔ مسٹر منوہر راج سکسینہ صدر شہری انجمن نے خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر انور معظم اور مسٹر پی ٹی ریڈی نے صادقین کے آرٹ کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ جناب مجتبیٰ حسین نے دل چسپ خاکہ سنایا۔ جناب زاہد علی خاں نیوز ایڈیٹر نے صادقین اور مہمانانِ خصوصی کی گلپوشی کی۔ محترمہ جیلانی بانو نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ صادقین کی اس بے نظیر نمائش سے ہزاروں اردو دوست خواتین و حضرات نے استفادہ کیا۔

۶ر مارچ : حلقہ اربابِ ذوق کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب سید ہاشم علی اختر معتمد عمومی ادارۂ ادبیاتِ اردو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب صادق نقوی لکچرار تاریخ عثمانیہ یونی ورسٹی نے حیدرآباد کی معاشرت اور تہذیب پر انگریزی میں مسٹر راجن کی مطبوعہ کتاب پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ صدرِ جلسہ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ عہدِ آصفی کی تاریخ کو صحیح حالات کے پس منظر میں لکھا جانا چاہیے۔ جناب محمد منظور احمد معتمد حلقہ اربابِ ذوق نے حضرات جوش و فراق کی وفیات پر قرار دادِ تعزیت پیش کی۔

○ شنکر جی یادگار کل ہند ساتواں سالانہ مشاعرہ جناب سید سکندر شاہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر سی جگن ناتھ راؤ ڈپٹی چیف منسٹر مہمانِ خصوصی تھے۔ میزبان و مہمان شعرا عالم تمہیدی نذیر بناری، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

رفیعہ شبنم عابدی، ملکہ نسیم، نکہت خان امیر احمد خسرو، کنول پرشاد کنول، انیس یعقوبی، رحمٰن جامی، علی الدین نوید، فاروق شکیل اور جگ جیون استھانی سحر نے کلام سنایا۔

۸ مارچ : دوروزہ کل ہند مسلم یوتھ کنونشن نے ایک قرارداد کے ذریعہ اردو کو آندھرا پردیش اور کرناٹک میں دوسری سرکاری زبان قرار دیے جانے کا مطالبہ کیا۔

○ پاکستان کے نامور مصور اور خطاط جناب صادقین احمد نے ادارۂ ادبیات اردو کے تمام شعبوں بشمول مرکزِ خوشنویسی (زیرِ انتظام ترقی اردو بورڈ حکومت ہند) کا معائنہ کیا۔ جناب سید ہاشم علی اختر معتمد اعزازی نے جناب صادقین کا ایوانِ اردو میں خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر جناب صادقین نے اپنی ایک نظم "روح عصر کا پیام مصور کے نام" (مطبوعہ آجکل دہلی دسمبر ۶۴ء) ادارہ کے کتب خانہ سے حاصل کرکے سنائی۔ جناب محمد اکبر الدین صدیقی اور جناب محمد منظور احمد نے مختلف شعبوں کا معائنہ کرایا۔ جناب میر سراج الدین علی خاں آفس سکریٹری نے مرکزِ خوشنویسی کی کارکردگی سے واقف کرایا۔

۹ مارچ : ڈاکٹر وحید اختر کے شعری مجموعہ "زنجیر کا نغمہ" کی اشاعت پر خوش گوار ادبی تقریب جناب اختر حسن کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ محترمہ عصمت چغتائی، صادقین، مجتبیٰ حسین اور عزیز آرٹسٹ نے مخاطب کیا۔ ڈاکٹر وحید اختر نے کلام سنایا۔ حسن فرخ نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۱۰ مارچ : حسامی بک ڈپو کی مطبوعہ کتاب "بالآخر" کی رسمِ اجرا محترمہ قرۃ العین حیدر نے انجام دی۔ ڈاکٹر ثریا حسین صدر شعبہ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ نے صدارت کی۔ بالآخر کے مصنف مشہور فکاہی ادیب جناب مجتبیٰ حسین کے فن اور شخصیت پر ڈاکٹر وحید اختر، شاذ تمکنت، رشید قریشی، نریندر لوتھر نے اظہارِ خیال کیا۔ طالب خوندمیری نے نظامت کی۔

۱۲ مارچ : نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری کی طرف سے "یادِ جوش و فراق" کو نامور ادیبوں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر ثریا حسین اور صادقین احمد نے مخاطب کیا ڈاکٹر میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی نے صدارت کی اور صابر کمال نے شکریہ ادا کیا۔

۱۳ مارچ : چار بجے شام: رویندرا بھارتی میں جناب محمد ہدایت اللہ نائب صدر جمہوریۂ ہند نے کل ہند انجمن ترقی اردو کی سالانہ کانفرنس کا افتتاح فرمایا اور اردو والوں کو اس امر کا مشورہ دیا کہ وہ زبان کو سہل بنانے کی طرف توجہ دیں۔ اس اجلاس کو پرنس معظم جاہ، جسٹس آنند نرائن ملا، مسٹر ٹی انجیا سابق چیف منسٹر، مسٹر سی جگناتھ راؤ ڈپٹی چیف منسٹر، مسٹر آئی۔ کے گجرال سابق سفیر سوویٹ یونین، جناب سید کمتر شاہ، پروفیسر جی رام ریڈی وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ، بیگم عابدہ احمد، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ڈاکٹر خلیق انجم نے مخاطب کیا۔

○ ۵ بجے شام بمقام گنبد محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ، ادارۂ ادبیات اردو کی گولڈن جوبلی تقاریب کا جناب محمد ہدایت اللہ نائب صدر جمہوریہ ہند نے ہزاروں اردو دوستوں اور نامور اسکالروں، دانشوروں اور کل ہند اردو کانفرنس کے مندوبین کی موجودگی

میں افتتاح کیا اور تہذیب، اتحاد اور ثقافت کے اہم علمی و ادبی مرکز حیدرآباد اور جنوبی ہند کے اہم ریسرچ سنٹر ادارۂ ادبیاتِ اردو، اس کے بانی ڈاکٹر زورؔ کو زبردست خراج ادا کیا اور کہا کہ یہ ادارہ دکنی ادبی روایات سے نئی نسلوں کو فیضان پہنچاتا رہے گا۔ جناب میر اکبر علی خاں صدرنشین گولڈن جوبلی تقاریب اور صدر ادارہ پروفیسر سیدہ علی اکبر نے نائب صدر ہند کا پرتپاک خیرمقدم کیا۔ پرنس مفخم جاہ نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ جناب سید ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) معتمد اعزازی ادارہ نے گولڈن جوبلی تقاریب ادارہ کے بارے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ دکن کے ادب اور کلچر کی پاسداری میں اس ادارہ نے عہد ساز خدمات انجام دی ہیں۔ اس موقع پر موصولہ مشاہیر کے پیامات بھی سنائے گئے۔ جناب ہدایت اللہ نے ادارہ کی مطبوعہ کتاب "تاریخ ادب اردو" اور ... حمانی کی کتاب "ڈاکٹر زورؔ، شخصیت اور کارنامے" کے علاوہ "سب رس گولڈن جوبلی اشاعت" کی رسم اجرا انجام دی، جناب رمن راج سکسینہ شریک معتمد ادارہ نے نظامت کے فرائض انجام دے اور شکریہ ادا کیا۔ مختصر وقفہ کے بعد یوم محمد قلی قطب شاہ کا ۲۰ واں سالانہ اجلاس جناب سید بشر شاہ صدر ریاستی قانون ساز کونسل کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ بیگم عابدہ احمد (ایم پی) مہمانِ خصوصی تھیں۔ جناب رمن راج سکسینہ معتمد یوم محمد قلی قطب شاہ نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ مسٹر ارجن راؤ اسپیشل آفیسر حیدرآباد میونسپل کارپوریشن، جناب معظم حسین سابق منسٹر اقلیتی ... جناب مصطفےٰ اشروانی نے محمد قلی اور دکنی کلچر پر مخاطب کیا۔ مہمان دانشور پروفیسر گوپی چند نارنگ صدر شعبۂ اردو و ڈین فیکلٹی آف آرٹس جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی نے بھی خطاب کیا اور ادارہ ادبیاتِ اردو کی ۵۰ سالہ خدمات اور ڈاکٹر زورؔ کی جہد آفریں شخصیت اور کارناموں کو زبردست خراج ادا کیا۔ رحمٰن جامی اور صادق نقوی صاحبان نے منظوم خراجِ تحسین ادا کیا۔ بیگم و ڈاکٹر رضی الدین نے محمد قلی اور دکنی نیز حیدرآبادی شعرا کا کلام سنا کر سماں باندھا۔ عزیز احمد خاں وارثی کی قوالی سے نائب جمہوریۂ ہند اور ہزاروں افراد نے کیف اٹھایا۔ جناب محمد منظور احمد نائب معتمد گولڈن جوبلی تقاریب کمیٹی نے شکر ادا کیا۔ گنبد محمد قلی پر ۹ بجے سہ پہر ادبی جوں اور شاعروں کا سالانہ پاش کیک اور شاعرہ منعقد ہوا۔ جناب سعید شہیدی نے صدارت کی۔ مشاعرہ کے کنوینرز بشیر وارثی اور رئیس اختر صاحبان کی دلچسپی سے یہ محفل کامیاب رہی۔ جناب رمن راج سکسینہ نے شاعروں کو مخاطب کیا اس مشاعرہ میں حبیب الدین حبیب، منوہر لال بہار، وقار خلیل، محمد منظور احمد، رئیس اختر، بشیر وارثی، علی احمد جلیلی، صادق نقوی، داؤد نصیب، احمد اللہ حسینی احمد اور شیدا نے کلام سنایا۔

۱۲ مارچ ۸۲ء اردو زبان و ادب کی ترقی میں ادارۂ ادبیات اردو اور ڈاکٹر زورؔ کا حصہ" کے موضوع پر ادارہ کی گولڈن جوبلی تقاریب کے سلسلہ میں "بمقام ایوانِ اردو" ادبی اجلاس پروفیسر گیان چند جین صدر شعبۂ اردو حیدرآباد یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب ملک یام اللہ ڈاکٹر ثریا حسین مہمانِ خصوصی تھے۔ ڈاکٹر خلیق انجم جنرل سکریٹری کل ہند انجمن ترقی اردو پروفیسر سیدہ سلطانہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس جامعہ عثمانیہ نے ادارہ کی خدمات اور ڈاکٹر زورؔ پر مخاطب کیا۔ حضرات

جگن ہنرافی کی دو نیات برقرار رہا اور تلگو صحافی میں صحافی پر جناب ملک رام نے جناب ایچ کریم نگری کی تصنیف تحیب اشرف ندوی کی علمی و ادبی خدمات کی رسم اجرا بھی انجام دی۔ جناب صلاح الدین نیر نے معتمدی کے فرائض انجام دیے۔

○ سالار جنگ میوزیم میں گولڈن جوبلی تقاریب ادارہ کے سلسلے میں دکنی ادب و ثقافت کی ایک خصوصی نمائش کا جناب میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی نے افتتاح کیا۔ جناب عبدالصمد سکینہ (کیوریٹر) نے شکریہ ادا کیا۔

۱۹ رمارچ: اردو مجلس اور محفلِ خواتین کی طرف سے اردو ہال میں شامِ افسانہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ محترمہ قرۃ العین حیدر مہمان خصوصی اور ڈاکٹر زینت ساجدہ صدر تھیں۔ محترمہ جیلانی بانو اور صفی صاحبہ نے کہانیاں سنائیں۔ ڈاکٹر ساجدہ نے صفی کی ناول نویسی پر اظہارِ خیال کیا۔

۲۰ رمارچ: مسٹر بھاونم وینکٹ رام چیف منسٹر نے "مسلم تلگو مصنفین" کی کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے تلگو زبان و ادب کے فروغ میں مسلمانوں کے حصے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ آندھرا پردیش لسانی ہم آہنگی اور یکجہتی کا آئینہ دار ہے اور ریاست میں تلگو کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی مساویانہ موقف حاصل ہے۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی چیرمین سرکاری زبان کمیشن نے تلگو کے پہلے مسلم شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دورِ حکومت میں تلگو کی سرپرستی کا ذکر کیا۔ جناب آصف پاشا صدر ریاستی اقلیتی کمیشن نے بھی مخاطب کیا۔

۲۵ رمارچ: ڈاکٹر حبیب ضیاء کے طنز و مزاح سے لبریز مضامین کا پہلا مجموعہ "گوئم مشکل" کی رسم اجرا اردو ہال میں ڈاکٹر حفیظ قتیل کے ہاتھوں انجام پائی۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ، جناب رشید قریشی، جناب مصطفےٰ کمال ایڈیٹر شگوفہ، جناب بدیع حسینی، جناب موسیٰ کلیم اور جناب عارف مجاہد نے کتاب اور مصنف پر اظہارِ خیال کیا۔ آخر میں زندہ دلانِ حیدرآباد کے نمائندہ شعرا نے کلام سنایا۔

۲۶ رمارچ: ڈاکٹر مرزا صفدر علی بیگ صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی کتاب "تصوف، فلسفہ اور شاعری" کی اشاعت کے موقع پر ادبی اجلاس اور مشاعرہ منعقد ہوا۔ پروفیسر غلام عمر خاں صدر شعبۂ اردو نے صدارت کی۔ رفیعہ سلطانہ، مولانا عابر، ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر محمود رضوی، ڈاکٹر یوسف سرمست اور صاحبِ کتاب پر اظہارِ خیال کیا۔ جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست نے بہ حیثیت مہمان شرکت کی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم کی صدارت میں محفلِ شعر ہوئی۔ مسرز ڈاکٹر مظفر شہ میری، سعید شہیدی، یعقوبی، علی احمد جلیلی، راشد خیرات ندیم، فیض الحسن خیال، نیر، رحمٰن جامی، ڈاکٹر اکبر علی بیگ، رئیس اختر اور صادق نقوی نے کلام سنایا۔ صلاح الدین نیر نے فرائض انجام دیے۔

○ اقبال شناس سخن ور جناب ... کے ساتھ ایک شام کا ادارے نے اہتمام کیا۔ جناب نعیم زبیری نے صدارت کی۔ ڈاکٹر یوسف کمال اور مظہر الزماں نے مجاز کی شعری اور منظوم ترجموں کی صلاحیت پر اظہارِ خیال کیا۔ محفلِ شعر میں مغنی رؤف نجم، محمد منظور احمد، ضیا صلاح صمدی، یوسف کمال، ... اور طالب خوندمیری نے حصہ

APRIL / MAY 1982.

R.
Regd.

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (

اسلوب اور انتقاد



بالِ جبریل

ب کلیم

مکاتیبِ رشید



سن اجراء: ۱۹۳۸ء

فون نمبر ۳۸۴۶۹

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

گولڈن جوبلی تقاریب ادارۂ ادبیات اردو مارچ ۱۹۸۲ء تا فروری ۱۹۸۳ء

ماہنامہ

سب رس

مدیر اعزازی: ڈاکٹر مغنی تبسم

معاون مدیر: وقار خلیل

جلد (۴۴) جون تا اگست ۱۹۸۲ء شمارہ (۶، ۷، ۸)

ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

زرِ سالانہ

۲۰ روپے

کتب خانوں سے ۲۵ روپے

بذریعہ رجسٹری ۴۵ روپے

فی پرچہ ۲ روپے

بیرونی ملکوں سے

	ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
شرق وسطیٰ	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
امریکہ	۱۶ ڈالر	۶ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون	۸ ڈالر	۳½ ڈالر
انگلستان	۷ پونڈ	۳ پونڈ

مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان، حیدرآباد ۲

ترتیب

○

باتیں

حیدرآباد کی ہونہار ادیبہ محترمہ ناز صدیقی اچانک ۹/مئی ۱۹۸۲ء کو ایک میٹرنٹی ہوم میں لڑکی کی ولادت کے بعد رحلت کر گئیں۔ ناز صاحبہ جامعہ عثمانیہ کی فارغ التحصیل، ذہین و فطین دختر تھیں، اردو تنقید اور شعر و ادب سے قلبی لگاؤ تھا۔ ایم اے کی طالبہ تھیں کہ ان کے مضامین کا متنوع مجموعہ "انداز بیاں" کے نام سے شائع ہوا اور سرمۂ صاحب نظراں ..... کا مقام پا گیا۔ پھر انہوں نے ساحر لدھیانوی کی شخصیت اور شاعری پر وسیع مقالہ قلمبند کیا اس مقالہ کی اشاعت سے اُن کا ادبی اور تنقیدی حلقوں میں شہرہ ہونے لگا۔ "شبلی نعمانی، نقادوں کی نظر میں" نامی مجموعۂ مضامین نے بھی ناز صدیقی کے فکر و نظر کو چمکایا۔ "حلقۂ ارباب ذوق" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے مقالہ تحریر کر رہی تھیں۔ بہت کچھ کام ہو چکا تھا لیکن اجل نے مہلت نہ دی کہ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتیں ملک کے نامور نقاد اور سخن ور ڈاکٹر مغنی تبسم کی شریکِ زندگی کی حیثیت سے ناز صاحبہ نے گھریلو مصروفیات کے دوش بدوش درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ خود کو مصروف اور درخشاں رکھا کہ ناگاہ پیکِ اجل نے اس گل تر کو اپنا لقمہ بنا لیا۔ ناز صاحبہ کی وفات ادبی دنیا کے لیے ایسا سانحہ قرار پاتا ہے کہ ان کی تنقیدی صلاحیتوں سے دنیائے ادب کو استفادہ کا بھرپور موقع نہ مل سکا۔ مرحومہ کو ادارۂ ادبیاتِ اردو اور اس کے ترجمان سب رس سے دیرینہ تعلقِ خاطر رہا۔ ادارہ اس المناک سانحہ پر ڈاکٹر مغنی تبسم سے اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے اس امر کی خواہش کرتا ہے کہ وہ ناز صاحبہ کی غیر مطبوعہ ادبی تحریروں کا یادگار انتخاب شائع فرمائیں

ع خدا بخشے ....

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ

حیدرآباد کے ممتاز ماہر تعلیم جناب سید علی اکبر

دنیا میں ایسی ہستیاں کم ملیں گی جو حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت کی بھی حامل ہوں جن کے پاس علم کے ساتھ ساتھ دولت بھی ہو، تقریر کی صلاحیت کے ساتھ تحریر پر بھی قدرت رکھتے ہوں۔ خاندانی شرافت کے ساتھ دنیوی دولت و عزت بھی حاصل ہو۔ مذکورۂ بالا تمام خصوصیات حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی یادگار شخصیت سید علی اکبر (سابق ناظم تعلیمات) کے پیکر میں جلوہ گر ہیں۔

سید علی اکبر ۱۲ اکتوبر ۱۸۹۰ کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے سید علی اکبر کے والد محترم سید محمد صاحب "امپیریل سروس ٹروپس" میں تھے وہاں سے سید محمد صاحب کی خدمت "پائیگاہ آسمان جاہی" کو منتقل ہو گئیں۔ وہاں وہ کمانڈر کی حیثیت سے کام کرنے لگے ۱۹۰۵ء میں سید محمد صاحب کا انتقال حیدرآباد دکن ہی میں ہوا۔ سید علی اکبر کے دادا کا نام بھی سید علی اکبر تھا۔ وہ ایرانی نژاد تھے اور ایران کے ایک شہر محلات کے رہنے والے تھے۔ آغا خاں کی دعوت پر وہ ایران سے ہندوستان آئے۔ آغا خاں کو ریس کا بہت شوق تھا اس لیے ان کے اصطبل میں بے شمار گھوڑے تھے۔ اُن گھوڑوں کو ٹرینڈ کرنے کے لیے سید علی اکبر کو ملازم رکھا گیا۔ سید علی اکبر کے صاحبزادے سید محمد نے بمبئی میں تعلیم حاصل کی اُس کے بعد حیدرآباد تشریف لائے۔

سید محمد مرحوم نے تین شادیاں یکے بعد دیگرے کیں انھوں نے چھ لڑکے اور چار لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑیں ان دس اولادوں میں سے صرف دو فرزند سید علی اکبر اور سید محمد حسین اور ایک دختر قمر النساء بیگم بقید حیات ہیں۔

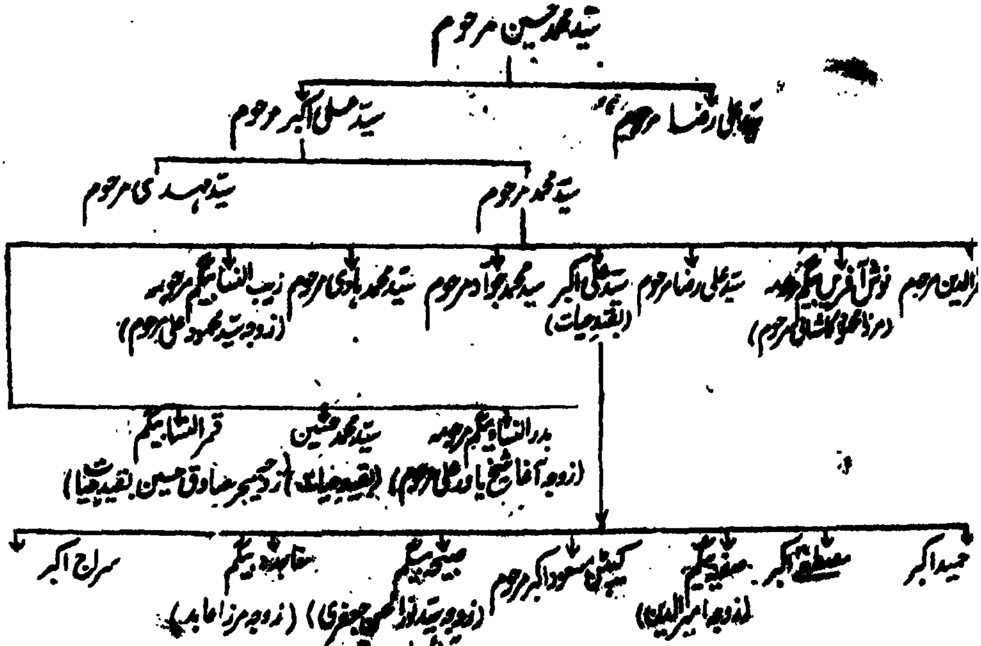
سید محمد کی پہلی بیوی اُن کی خالہ زاد بہن کشور خانم تھیں۔ ان سے دو اولادیں ہوئیں۔ ایک صاحبزادے سید مظفر الدین مرحوم مہتمم پولیس اور ایک لڑکی نوشِ آفریں بیگم مرحومہ زوجہ مرزا محمود کاشانی۔ کشور خانم کا انتقال ۱۸۸۵ء میں ہوا۔ سید محمد نے دوسری شادی امیر النساء بیگم عرف حاجی بیگم سے کی اُن سے چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ حاجی بیگم کی چھ اولادوں میں سب سے بڑے فرزند سید علی رضا مرحوم اپنے والد سید محمد کی جگہ پائیگاہ میں کمانڈر تھے۔ دوسرے فرزند سید علی اکبر ایم۔ اے (کینٹب) سابق ناظم تعلیمات ہیں۔ تیسرے صاحبزادے سید محمد جواد مرحوم مہتمم آبکاری تھے۔ چوتھے صاحبزادے مشہور اسپورٹس مین سید محمد ہادی مرحوم کمشنر بوائے اسکاؤٹ و نائب ناظم تعلیمات تھے۔ حاجی بیگم صاحبہ سے پہلی دختر زیب النساء بیگم مرحومہ زوجہ سید محمود کی

مرحوم (فرزند باقر نواز جنگ بہادر) دوسری دختر بدر النساء بیگم مرحومہ زوجہ آغا شیخ یاور علی مرحوم سابق ناظم عطیات تھیں۔

حاجی بیگم صاحبہ نے ۱۸۹۷ء میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے بعد سعید محمد صاحب نے اردو اور انگریزی کے ممتاز ادیب مورخ و عالم جناب چراغ علی مرحوم (اعظم یار جنگ) کی صاحبزادی حمیدہ بیگم سے عقد کیا۔ حمیدہ بیگم صاحبہ سے ایک فرزند جناب سید محمد حسین اور ایک دختر قمر النساء تولد ہوئے۔ جناب سید محمد حسین ہندوستانی کرکٹ کے ممتاز کھلاڑی رہ چکے ہیں۔ موصوف بقید حیات ہیں اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کے جلیل القدر عہدہ سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے ہیں۔ سید محمد حسین صاحب کی بہن قمر النساء زوجہ سجاد صادق بھی بقید حیات ہیں اور پاکستان میں مقیم ہیں۔

شجرۂ خاندان

سید علی اکبر صاحب



سید علی اکبر کی ابتدائی تعلیم مدرسۂ عالیہ میں ہوئی۔ ۶ سال کی عمر میں وہ کنڈرگارٹن میں شریک ہوئے۔ اُس وقت عالیہ اسکول پبلک اسکول کے خطوط پر چلایا جاتا تھا انگلو انڈین اساتذہ پڑھایا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ اُمراء اور رؤساء کے بچوں کی مشہور درس گاہ تھا۔ کنگ کوٹھی کے جنوب میں "رم بولڈ کوٹھی" میں یہ اسکول قائم تھا۔ مس لانگ پرائمری اسکول کی ہیڈ مسٹریس تھیں۔

سید علی اکبر کے اس زمانے کے ہم جماعت نواب سعید جنگ بہادر اور نواب خسرو جنگ بہادر (فرزند نواب افسرالملک بہادر) قابلِ ذکر ہیں۔

نواب سالار جنگ بہادر مرحوم (سالار جنگ سوم) سید علی اکبر سے دو سال سینیر تھے۔ دوسرے دوستوں میں ہاشم علی جج ہائی کورٹ (فاطمہ عالم علی خاں کے خسر) راجہ نرسنگ راج عالی اور فرام روز شاہ قابلِ ذکر ہیں۔ اُس زمانے میں نظام کالج اور مدرسہ عالیہ ایک ہی انتظامیہ کے تحت تھے کیونکہ ایک ہی عمارت میں واقع تھیں۔ کالج کے اساتذہ مڈل اور ہائی اسکول کو بھی پڑھایا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ ۱۹۱۱ء تک اسی عمارت میں رہا۔ یہ آصف جاہ ششم نواب میر محبوب علی خاں مرحوم کا زمانہ تھا سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں مرحوم آصف سابع کے زمانہ میں رم بولڈ کوٹھی کو قصرِ خاص مبارک کے علاقہ میں شامل کر لیا گیا۔ مدرسہ اور کالج اسد باغ (موجودہ نظام کالج) میں منتقل کر دیا گیا۔ سید علی اکبر کے اُس زمانے کے اساتذہ میں ارونا چلم شاستری، الفریڈ گوریا اور حاکم علی قابلِ ذکر ہیں۔ حاکم علی اردو فارسی پڑھایا کرتے تھے وہ پنجابی تھے لیکن اردو اور فارسی کے عالم تھے۔ سید علی اکبر کو اپنے ان اساتذہ پر فخر ہے۔

مدرسہ عالیہ سے سید علی اکبر نے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اُس کے بعد وہ بمبئی جاکر ولسن کالج میں انٹرمیڈیٹ میں شریک ہوئے۔ ولسن کالج سے انٹرمیڈیٹ کامیاب کرنے کے بعد جب وہ بی اے کے آخری سال میں پڑھ رہے تھے انھیں "یوروپین اسکالرشپ" کے لیے منتخب کیا گیا اُن کے ساتھ پروفیسر حسین علی خاں مرحوم اور ڈاکٹر محمد اعظم (اعظم جنگ) کا انتخاب عمل میں آیا۔ ۱۹۱۲ء کے اواخر میں وہ اعظم جنگ کے ساتھ بغرضِ اعلیٰ تعلیم انگلستان روانہ ہوئے۔ اعظم جنگ اور سید علی اکبر کیمبرج یونیورسٹی میں شریک ہوئے۔ پروفیسر حسین علی خاں مرحوم نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ سید علی اکبر نے معاشیات میں آنرز کی ڈگری درجہ دوم میں حاصل کی اور ۱۹۱۶ء کے اواخر میں حیدرآباد دکن واپس ہوئے اسی سال ان کا تقرر مددگار پروفیسر تاریخ و معاشیات کی حیثیت سے نظام کالج میں ہوا۔ اس وقت اُن کی عمر ۲۶ سال تھی۔ تقرر کے وقت سید علی اکبر سے اربابِ مقتدر نے وعدہ کیا تھا کہ بہت جلد اُن کو یوروپین گریڈ دیا جائے گا لیکن یہ گریڈ اُن کو اس لیے نہیں دیا گیا کہ وہ ہندوستانی تھے۔ یہ جائداد خالی تھی مگر انگریزوں کے لیے محفوظ کر دی گئی تھی۔ اس ناانصافی کی وجہ سے سید علی اکبر دل برداشتہ ہو گئے انھوں نے آئی۔ای۔ایس (انڈین ایجوکیشنل سروس) کے لیے درخواست دی

نواب سعید جنگ بہادر اپنے گہرے دوست سید علی اکبر
کے جذبات سے بخوبی واقف تھے انھوں نے سید علی اکبر
کے ساتھ اس ناانصافی کا ذکر اپنے جگری دوست سر راس
مسعود مرحوم (نواب مسعود جنگ بہادر) سے کیا جو اس
وقت ناظم تعلیمات، حکومت حیدرآباد تھے۔ سر راس
مسعود نے ترقی پر ان کو سررشتہ تعلیمات میں بحیثیت صدر
مہتمم تعلیمات تقرر کیا۔ گلبرگہ پر سید علی اکبر کی تعیناتی عمل میں آئی۔
چار سال تک سید علی اکبر گلبرگہ میں صدر مہتمم تعلیمات
رہے وہاں سے ۱۹۲۳ء میں اُن کا تبادلہ حیدرآباد پر ہوا۔
ممتاز ماہر تعلیم محمد سجاد مرزا مرحوم نے اُن سے مہتمم تعلیمات گلبرگہ
کا جائزہ حاصل کیا۔ تیرہ سال تک وہ صدر مہتمم تعلیمات
بلدہ حیدرآباد رہے۔ قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ کرنے والی
عظیم شخصیت "مارمیڈ ڈیوک پکتھال" اور مشہور اردو
شاعر شوکت علی خاں فانی بدایونی مرحوم سید علی اکبر کے
تحسین میں سے تھے دونوں مقامی ہائی اسکولوں پر
بحیثیت صدر مدرس کارگزار تھے ۱۹۳۶ء میں صدر مہتمم
تعلیمات سے اُن کی ترقی بحیثیت نائب ناظم تعلیمات
حیدرآباد ہوئی نائب ناظم تعلیمات کے عہدہ سے وہ ترقی
پر ۱۹۴۳ء میں پرنسپل نظام کالج مقرر ہوئے بحیثیت پرنسپل
وہ بہت کامیاب رہے۔ ۱۹۴۵ء تک وہ اسی خدمت
پر فائز رہے۔ اسی سال ناظم تعلیمات ریاست حیدرآباد
کے جلیل القدر عہدہ پر اُن کو ترقی دی گئی ۱۹۴۷ء میں وہ
اس عہدہ سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے
ان کا شمار ریاست حیدرآباد کے بہت ہی محنتی اور ایماندار
عہدہ داروں میں ہوتا ہے۔

۱۹۴۸ء میں پولیس ایکشن کے بعد جنرل جے
این چودھری ملٹری گورنر نے محکمہ جاتی ناانصافیوں،
لوٹ مار، قتل و غارتگری کی شکایتوں کی تحقیقات
کے لیے ایک سہ رکنی کمیٹی تشکیل دی جس کے ارکان
سید علی اکبر، راجہ گروداس اور انڈین آرمی کے میجر
بوملا تھے۔ ۷ مہینے تک اس کمیٹی نے اپنا کام کیا
اواخر ۱۹۴۹ء میں جامعہ عثمانیہ نے حیدرآباد ایوننگ
کالج قائم کیا اس کے پہلے پرنسپل کی حیثیت سے
سید علی اکبر کا انتخاب عمل میں آیا۔ ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۳ء
وہ "حیدرآباد ایوننگ کالج" کے پرنسپل رہے۔ سید
علی اکبر کو اس کالج کا معمار کہا جاتا ہے۔ ۱۹۵۳ء
میں حیدرآباد ایوننگ کالج کی پرنسپلی سے سبکدوش
ہونے کے بعد وہ انوارالعلوم کالج کے پرنسپل مقرر
کئے گئے۔ انوارالعلوم کالج حیدرآباد کا قدیم تعلیمی
ادارہ ہے۔ یکم اگست ۱۹۵۳ء کو اس کالج کا افتتاح
ہوا اس کالج کے بانی ڈاکٹر نظام الدین ہیں۔ نواب
لیاقت جنگ بہادر، عبدالسلام سعید، کرنل تاج احمد،
محمد جواہر خاں اور محمد رحیم الدین نے قیام کالج کے
سلسلہ میں ڈاکٹر نظام الدین کی بڑی مدد کی۔ اس
کالج کے پہلے پرنسپل محمد رحیم الدین تھے جو صرف
چھ ماہ تک کارگزار رہے۔ اس نوزائندہ کالج
کے دوسرے پرنسپل سید علی اکبر مقرر ہوئے۔ اُس
وقت اس کالج کی حیثیت جونیر کالج کی تھی جس میں
انٹرمیڈیٹ کی جماعتیں قائم تھیں اور صرف
۲۲ لڑکے زیر تعلیم تھے۔ تقریباً پندرہ سال تک
وہ اس کالج کے پرنسپل رہے اُن کی شب و روز
کی محنت رنگ لائی۔ ۱۹۶۷ء میں جب وہ انوارالعلوم
کالج کو وداع کر رہے تھے تب یہ کالج انٹرمیڈیٹ
کالج سے ترقی کرتے ہوئے ڈگری کالج بن چکا تھا۔

آرٹس کے علاوہ سائنس اور کامرس کے شعبے بھی اس کالج میں قائم ہوچکے تھے طلبہ کی تعداد ۲۲ سے بڑھ کر ایک ہزار سے متجاوز کرچکی تھی۔

سید علی اکبر کی شادی ۱۱ر جون ۱۹۱۸ء کو میجر محمد علی مرزا مرحوم کی دختر شاہجہاں بیگم سے ہوئی۔ ان سے چار لڑکے اور تین لڑکیاں تولد ہوئیں ایک صاحبزادے مسعود اکبر کا انتقال ہوچکا ہے جو انڈین آرمی میں کیپٹن کے عہدہ پر فائز تھے۔ سب سے بڑے صاحبزادے حمید اکبر کراچی میں مقیم ہیں اور ایک کمپنی کے جنرل منیجر ہیں۔ دوسرے صاحبزادے مصطفےٰ اکبر کراچی لوکل باڈی کے ڈائرکٹر ہیں۔ تیسرے صاحبزادے سراج اکبر "ویکو" کے زیجنل منیجر ہیں اور آج کل بریلی میں مقیم ہیں۔ بڑی صاحبزادی صفیہ بیگم زوجہ امیرالدین ہیں دوسری صاحبزادی صبیحہ بیگم عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی کی ریڈر ہیں۔ موصوفہ سید نورالحسن جعفری آئی۔ اے۔ ایس ریٹائرڈ کی رفیقۂ حیات ہیں تیسری صاحبزادی ساجدہ بیگم، مرزا عابد سکریٹری۔ سینک بورڈ، رنگا ریڈی ڈسٹرکٹ کی رفیقۂ حیات ہیں۔

انوارالعلوم کالج کی پرنسپلی سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی سید علی اکبر شب و روز علمی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ اسلامک کلچر کے وہ وائس پریسیڈنٹ ہیں۔ یہ انگریزی سہ ماہی جریدہ اب بھی پابندی کے ساتھ شائع ہورہا ہے اس کی چیف پیٹرن " ایچ۔ ای۔ ایچ دی نظامس نواب برکت علی خاں ہیں۔ گورننگ باڈی میں ہادی بلگرامی، محامد علی عباسی، ڈاکٹر ایس۔ اے منان، شرف الدین احمد، سید ہاشم علی، محبوب حسین لطیف، میر معظم حسین، نظام الدین احمد، خواجہ عبدالغفور جیسی معزز ہستیاں شامل ہیں۔ ایڈیٹوریل بورڈ میں ڈاکٹر قاری کلیم اللہ عطاءالرحمٰن، ڈاکٹر ہاشم امیر علی، سید وحید الدین، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر منظور عالم، پروفیسر عالم خوندمیری جیسے علماء اور دانشور شامل ہیں۔

سید علی اکبر کئی اور اہم اداروں سے بھی وابستہ ہیں۔ وہ "صغرا ہمایوں مرزا" وقف کے چیرمن ہیں۔ "صفدریہ ہائی اسکول کمیٹی" کے صدر ہیں۔ "ادارۂ ادبیاتِ اردو" کے تقریباً بیس سال سے صدر ہیں اور ماہنامہ "سب رس" کے نگران ہیں۔ "دی انڈین جرنل آف ایجوکیشن" کے وائس پریسیڈنٹ بھی رہے یہ جریدہ کانپور سے شائع ہوتا تھا۔

۱۹۲۷ء میں سید علی اکبر صاحب نے حیدرآباد اسٹیٹ گورنمنٹ کے ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے محمد حسین جعفری مرحوم سابق ناظم تعلیمات ریاست حیدرآباد کے ساتھ "امپریل ایجوکیشن کانفرنس (منعقدہ لندن) میں شرکت کی اور جامعہ عثمانیہ پر اپنا مقالہ پڑھا وہاں سے وہ جرمنی بھی تشریف لے گئے جرمنی کے تعلیمی حالات کا بغور مطالعہ کیا۔ [illegible]ء میں سید علی اکبر کو دوبارہ یورپ جانے کا موقع ملا۔ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان خاں مرحوم آصف سابع نے ان کو اپنے بھائی نواب صلابت جاہ بہادر کے ہمراہ سات ماہ کے تعلیمی دورے پر روانہ کیا۔ یورپ کے اس دورے پر وہ انگلستان کے علاوہ فرانس، جرمنی، اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور اسکاٹ لینڈ بھی تشریف لے گئے۔ اس طویل دورے سے واپس ہونے کے بعد سید علی اکبر نے اپنی معرکتہ الآراء کتاب " دی

جرمن اسکول سسٹم" (THE GERMAN SCHOOL SYSTEM) لکھی اس کا پیش لفظ لارڈ ایس ٹیس پرسی، پریسیڈنٹ آف دی بورڈ آف ایجوکیشن انگلینڈ نے تحریر کیا۔

نفسیات کے ماہر "گلوور" کی مشہور کتاب "KNOW YOUR OWN MIND" کا اردو ترجمہ "اپنے نفس کی شناخت" کے نام سے کیا۔ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی سے شائع ہوئی۔

سید علی اکبر کے توسیعی لیکچرس "ایجوکیشن اینڈ ڈیماکریسی" کے نام سے انگریزی میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اساتذہ کی کارکردگی کو بڑھانے اور اس پیشے سے دل چسپی لینے کے لیے ایک دو لسانی جریدہ کا بھی آغاز کیا تھا جس کا نام "حیدرآباد ٹیچر" تھا۔ انگریزی شعبہ کے وہ خود مدیر تھے۔ اردو شعبہ کے مدیر عبدالنور صدیقی تھے۔ اٹھارہ سال تک یہ رسالہ پابندی سے شائع ہوتا رہا۔

۱۹۳۵ء میں سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں مرحوم آصف سابع کی سلور جوبلی تقاریب کے موقع پر سید علی اکبر کی خدمات کے اعتراف میں انھیں "تمغۂ آصفی" عطا کیا گیا۔ سلور جوبلی تقاریب کے اس یادگار موقع پر سید علی اکبر نے "سررشتۂ تعلیمات کی تاریخ" انگریزی زبان میں مرتب کی جو سررشتۂ تعلیمات کی جانب سے "ایجوکیشن انڈر آصف جاہ دی سیونتھ" (EDUCATION UNDER ASIF JHA THE VII) کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔

موجودہ تعلیم کے نقائص پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ "پہلا نقص یہ ہے کہ پرائمری تعلیم کی طرف سے غفلت برتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے ابھی ہمارے ملک میں ناخواندگی بہت زیادہ ہے۔ اب تک صرف ۴۰٪ خواندگی ہے اس جانب توجہ کی جانی چاہیے"۔

دوسرا نقص یہ ہے کہ "نظام تعلیم میں یکسانیت ہے اس کی اصلاح کے لیے ہمیں چاہیے کہ ہری یونیورسٹی کورس شروع کریں۔ صنعت و حرفت کو تعلیم کے ساتھ شامل کیا جائے اس سے غفلت نہ برتی جائے۔ سب طلبہ اہل نہیں ہوتے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ سائنس، آرٹس اور کامرس کی تعلیم ایسے طلبہ حاصل کریں جن میں اس کے حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ ہائی اسکول کی سطح پر اس بات کا خیال رکھا جائے کہ طالب علم آئندہ کس شعبے میں تعلیم حاصل کرے گا۔"

سید علی اکبر صاحب کا نظریہ ہے کہ صرف علم کافی نہیں ہے۔ اخلاق کی تربیت بھی ضروری ہے اس لیے تعلیمی نظام میں کردار سازی کو اہمیت دی جائے۔ والدین کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت میں زیادہ دلچسپی لیں۔ آج کا بچہ کل کا ایک ذمہ دار شہری بنے گا اس لیے طلبہ ماں باپ اور اساتذہ کا پاس و ادب کریں تاکہ اُن کی زندگی کامیاب رہے۔ سید علی اکبر صاحب نے مزید فرمایا کہ بیرونی اثرات سے طلبہ کو محفوظ رکھنا چاہیے یعنی طالب علم سیاست سے دور رہیں۔

اس وقت سید علی اکبر صاحب اپنی قیام گاہ موقوعہ ہمایون نگر میں عزلت گزینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بیٹا، بیٹی، پوتے

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر دیکھیے)

محمد بدیع الزماں

اقبال اور اُن کی نوائے پریشاں

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ!
کلی کو دیکھ کہ ہے تشنۂ نسیمِ سحر
اسی میں ہے میرے دل کا تمام افسانہ!

اقبال کے مندرجہ بالا اشعار ان کے پورے نفسِ شاعری پر محیط ہیں۔ ان اشعار میں اقبال نے اپنی چالیس سالہ شاعری کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اردو شاعری میں نوا، نالہ اور آہ و فغاں و دعا جیسی چیزیں ہیں۔ ان نالوں اور آہوں کے ذریعے گل و بلبل کی حکایتیں اور حسن و عشق کی داستانیں سنی اور سنائی جاتی تھیں۔ مقہور اور مجبور عاشقوں کے لیے یہ آہیں مرہم کا کام کرتی تھیں اور ان سے اُن کے دلوں کو تسکین پہنچتی تھی۔ اقبال ان سب روایتوں سے واقف تھے مگر گرد و پیش کے حالات، تمدنِ ثقافتی اور سماجی ابتری کے پیشِ نظر انھوں نے اپنے نالوں کو ولولۂ تازہ پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بنایا اور ایسا بنایا کہ ہر شخص یہ سمجھنے لگا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اوائل شاعری ہی میں وہ خدا سے دعا گو تھے۔

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

اقبال کے سارے کلام میں دو چار نظموں اور غزلوں کو چھوڑ کر ہر نظم اور غزل میں نوائے شوق، فغاں، فریاد، آہِ سحر، درد، سوزِ آرزومندی، جنون، نوا، آہِ سحرگاہی، دردِ مہجوری، نوائے سحرگاہی، اشکِ سحرگاہی، شعلۂ نوا، چاکِ گریباں، نوائے پریشاں، نوائے صبح گاہی جیسے الفاظ بار بار آتے ہیں اور بے شمار آتے ہیں۔ یہ الفاظ ان کی اردو شاعری اور خصوصاً غزل میں رچ بس گئے تھے۔ اقبال روایت سے ہر معنی میں بغاوت کرنا نہیں چاہتے تھے مگر ان الفاظ سے ایک شاطر اور ماہر فن کار کی طرح کام نکالنا یہ ان کی دیو قامت شخصیت سے ہی ممکن ہو سکا۔ گل و بلبل کے الفاظ انھوں نے بھی استعمال کیے مگر ہجر و وصال کی گتھیاں سلجھانے کے لیے نہیں بلکہ اپنے پسماندہ کاروان کے دلوں میں ولولۂ تازہ پیدا کرنے کے لیے خود اعتمادی

خطر پسندی اور ستاروں سے آگے کے جہاں کی سیر کرانے کے لیے ملاحظہ ہو اقبال کی نوا بلبل کی زبان سے اور اس نوا سے وہ کیا کام لینا چاہتے تھے:

نوا پیرا ہو اے بلبل، کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

وہ بلبل کی نوا اور ترنم سے ایسا انوکھا کام اس لیے لینا چاہتے تھے کیوں کہ وہ سامریِ فن سے ناامید تھے۔ ان کی تلاش ایک نئی دنیا کی تھی جہاں ولولے ہوں، نئی تمنائیں ہوں اور نئی آرزوئیں جنم لیتی ہوں:

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی ہے فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز

اقبال نے زندگی کے حقائق سے گریز نہیں کیا بلکہ حقائق کو اور زیادہ پُراثر بناکر جلوہ گر کیا اور ہم میں ہمدردی، دل سوزی اور انسانیت دوستی کی روح کو جگایا۔ واقعیت اور تخئیلیت شیر و شکر ہوکر "روحِ عصر" کے علاوہ "ماورائے عصر" کے عنصر کو بھی شامل کرکے یہ نوائیں ہر زمانے کی چیز بن گئیں۔ یہ کہ اقبال نے صرف اپنی نواؤں کو دوسروں تک پہنچانے کو اولیت دی اور شاعری کو ہیچ سمجھا ایسی بات نہیں۔ ان کا نظریۂ شاعری کچھ اور تھا:

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگِ صورِ سرافیل دل نواز نہیں

یہ نوائیں تو بانگِ صورِ سرافیل تھیں۔ ان سے حریمِ ذات میں شور مچائے جانے، گنبدِ صفات میں غلغلہ ہائے الاماں کی صدا بلند کرنے، تخئیلات میں حور و فرشتہ کو اسیر کرنے اور بارگاہِ ربّ العزت کی تجلیات میں خلل ڈالنے کا کام لیا جانا چاہیے تھا۔ کعبہ و سومنات میں ان فضاؤں سے رستخیزی پیدا کرنی تھی۔ اتنی باتیں بھلا رمز و ایما کی زبان میں کہاں سما سکتی تھیں۔ اقبال نے اپنی پوزیشن واضح کی:

رمز و ایما اس زمانے کے لیے ممکن نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن

انھوں نے دو ٹوک کہا:

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے؟

اپنی نوائے پریشاں کا جواز ان کے پاس یہ تھا کہ:

عجب نہیں کہ پریشاں ہے گفتگو میری
فروغِ صبح پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

پھر بھی اقبال پُرامید تھے:

کیا عجب میری نوائے سحرگاہی سے
زندہ ہوجائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے

اقبال کی نواؤں میں درد و غم کا اظہار ذاتی نہیں آفاقی ہے۔ یہ اُس عہد کی افراتفری اور ذہنی انتشار کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ میر نے بھی اپنے عہد کی بے سر و سامانی اور تنزلی حال پر بہت کچھ کہا مگر اُن میں یاس اور قنوطیت کا عنصر زیادہ تھا۔ ان میں جد و جہد کا جذبہ اور زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی دعوت نہیں ملتی۔ ولولۂ تازہ پیدا کرنے کے عنصر مفقود ہیں۔ مگر اقبال موت کے پردے میں حیات کا منظر پیش کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی نواؤں میں صرف حال کا آئینہ ہی نہیں بلکہ مستقبل کا اشاریہ بھی ملتا ہے۔ اُن کے جتنے اشعار "نوائے پریشاں" کے طور پر

ہیں ان میں ہمیں اقبال کی فکری انفرادیت کا ثبوت ملتا ہے اسے انانیت یا شاعرانہ تعلّی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اُن کی طبیعت کا فطری تقاضا ہے۔ ان نواؤں میں ہمیں ایک عظیم فن کار کی دیو قامت شخصیت کا پتہ ملتا ہے۔ اُن کی ایسی سارے نواؤں میں سرتاسر حقیقتِ حال کی ایک بے اختیارانہ چیخ ہے۔ اُن کی عظیم شخصیت ہی ہمیں ان کی نواؤں کی طرف متوجہ کرتی ہے اور ہمارا جذبۂ پرستش ہمیں اُس مقام پر لے جاتا ہے جہاں وہ ہمارا ذہنی آئیڈیل بن جاتا ہے۔ ان کی نواؤں میں اُن کی شخصیت کس طرح چھائی ہوی ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے:

خونِ دل و جگر سے ہے مری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں، صاحبِ ساز کا لہو!

نوائے صبح گاہی نے جگر خوں کر دیا میرا
خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے؟

مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا
نسیمِ صبح چمن کی تلاش میں ہے ابھی

یہی میری نماز ہے، یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی!

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ان نواؤں میں اکثر و بیشتر شعوری یا غیر شعوری طور پر طنز کے تیکھے اور کھلے نشتر بھی ہیں جو

. . . .

ردِّ عمل ہیں ملت، انسانیت اور روحِ انسانی کی انتہائی پستی کا۔ ان نشتروں میں بعض لطافت سے لبریز ہیں اور بعض میں تلخی کے عناصر بھی شامل ہیں۔ کہیں خطیبانہ ہیجان و طغیانی ہے تو کہیں صرف ہلکی سی ناراضگی کا اظہار۔

کیا صوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی
اِن کا سرِ دامن تو ابھی چاک نہیں ہے

اے پیرِ حرم، رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

میری مشکل؟ مستی و شور و سرور و درد و داغ
تیری مشکل؟ مے سے ہے ساغر کہ مے ساغر سے ہے

تیری متاعِ حیات علم و ہنر کا سرور
میری متاعِ حیات ایک دلِ ناصبور!

ایک زمانے سے ہے چاک گریباں میرا
تو ہے ابھی ہوش میں! میرے جنوں کا قصور!

اقبال کے سارے کلام میں شروع سے آخر تک اُن کے قلبی واردات کی ہیجانی کیفیت کارفرما ہے جو جنون کی شکل بھی اختیار کرلیتا ہے۔ جس کی صحرانوردی کے لیے ان کو یہ دنیا بھی تنگ نظر آتی ہے اور خدا سے یہ گلہ کرنے لگتے ہیں۔

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لیے لامکاں میرے لیے چار سو!

اور اقبال کا جنوں جب حد سے تجاوز کرجاتا ہے تو دیکھیے کیا کچھ کرنے کو بھی تیار ہوجاتا ہے۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک

ان نواؤں کے ذریعہ اُن کے دل میں لہریں اور ولولے اوائل شاعری ہی سے اُٹھنے شروع ہوتے ہیں اور ان سے جذبات کی تخلیق ہونے لگتی ہے۔ ان میں اجتماعی زندگی کے رجحانات ہیں۔ جس میں انتہائی سنجیدگی اور گہرائی اور ساتھ ساتھ ایک سنبھلا اور سوچا ہوا انداز ہے۔ ان کے ذریعہ زمانہ کے داعیوں، زندگی کے تقاضوں، ماحول کی ضرورتوں کی یاددہانی، ترجمانی اور توجہ دہانی کا کام لیا جاتا ہے اور ترغیبِ عمل کے رجحانات انھیں جذبات ھیلانا سے جنم لینے لگتے ہیں اور زندگی ایک سعی مسلسل اور کوششِ پیہم کا نام ہوجاتی ہے۔

اقبالؔ نے جب انیسویں صدی کی آخری دہائی کے آخری سالوں میں اپنی شاعری کا آغاز کیا تو اپنی ہلکی پھلکی نظموں میں بھی جو اس وقت لکھی گئیں انھوں نے اپنے دردِ دل کی آگاہی دینی شروع کردی یہ وہ وقت تھا جب ۱۸۵۷ء کے غدر کو مشکل سے پینتیس ۳۵ سال گزرے تھے جو کسی ملک اور قوم کی تاریخ میں بہت قلیل سی مدت ہے۔ انگریزوں کے جور و استبداد کے پیشِ نظر ہر طرف قبرستان کا سناٹا تھا۔ سبھوں کے لبوں پر مہرِ سکوت لگا تھا۔ بقول اقبالؔ تب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس" کا عالم تھا۔ اقبالؔ نے اپنی نظم "صدائے درد" میں اس طرح زبان کھولی :۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آتی نہیں

اُس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں
دانۂ خرمن نما ہے شاعرِ معجز بیان
ہو نہ خرمن ہی تو اُس دانے کی ہستی پھر کہاں
کب زباں کھولی ہماری شدتِ گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے

ایک اور نظم "ایک آرزو" میں "نوائے پریشاں" کا عالم دیکھیے :

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب!
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

پھر نظم "گلِ پژمردہ" میں اقبال اپنی نواؤں سے ہمارے احساس میں وہی روح تڑپاتے ہیں جو اُن کے دل میں کروٹیں لے رہی تھی :

تجھ پہ برساتا ہے شبنم دیدۂ گریاں مرا
ہے نہاں تیری اُداسی میں دلِ ویراں مرا
میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو
خواب میری زندگی تھی جس کی ہے تعبیر تو

نظم "ماہِ نو" میں اپنے قلبی اضطراب کا اظہار چاند سے یوں کرتے ہیں :

ساتھ اے سیارۂ ثابت نما لے چل مجھے
خارِ حسرت کی خلش رکھتی ہے اب بیکل مجھے
نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں
طفلکِ سیماب پا ہوں مکتبِ ہستی میں میں

نظم "خفتگانِ خاک سے استفسار" میں حرماں نصیبی ملاحظہ ہو:

منظرِ حرماں نصیبی کا تماشائی ہوں میں
ہم نشینِ خفتگانِ کنجِ تنہائی ہوں میں

اور ذرا "خفتگانِ خاک" سے چند استفسار ملاحظہ ہوں۔ اشعار کیا ہیں اقبال نے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔

یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل
شعر کی گرمی سے کیا واں بھی پگھل جاتا ہے دل؟
واں بھی کیا فریادِ بلبل پر چمن روتا نہیں؟
اس جہاں کی طرح واں بھی دردِ دل ہوتا نہیں؟

نظم "شمع" میں سوزِ دروں کی بے کلی قصہ دار و رسن تک چھیڑنے کے منصوبے بنانے لگتی ہے:

بزمِ جہاں میں میں بھی ہوں اے شمع! دردمند
فریاد در گرہ صفتِ دانۂ سپند
دی عشق نے حرارتِ سوزِ دروں مجھے
اور گل فروشِ اشکِ شفق گوں کیا مجھے
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں
غربت کے غم کدے کو وطن جانتا ہوں میں
منزل کا اشتیاق ہے، گم کردہ راہ ہوں
اے شمع! میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں
ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

یہاں تک کہ بچوں کے لیے جو نظمیں لکھی گئیں ان میں بھی وہی نوائے پریشاں ملتی ہیں۔ نظم "پرندے کی فریاد" کے چند اشعار:

آتی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

نظم "رات اور شاعر" میں اقبال کی تپشِ شوق اور سوز آموز دمندی کا تماشہ دیکھیے:۔

مجھ میں فریاد جو پنہاں ہے سناؤں کس کو
تپشِ شوق کا نظارہ دکھاؤں کس کو
برقِ ایمن مرے سینے پہ پڑی روتی ہے
دیکھنے والی ہے جو آنکھ، کہاں سوتی ہے؟
صفتِ شمعِ لحد مردہ ہے محفل میری
آہ! اے رات بڑی دور ہے منزل میری
ضبطِ پیغامِ محبت سے جو گھبراتا ہوں
تیرے تابندہ ستاروں کو سنا جاتا ہوں

وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شدت بڑھتی گئی ہے یہ نوائیں جذبے کی آنچ میں تپ کر نکلنے لگیں۔ ان کی تخیل کے پرتو نے اسے اور رنگین بنانا شروع کیا۔ اظہار میں فلسفیانہ استدلال کے ساتھ پختگی آنے لگی۔ ناامیدی امید میں بدلنے لگی۔ لوگوں کو ہمی طلب دیکھ کر ان کے حوصلے بڑھنے لگے۔ اب بانگِ درا کا دور ختم ہوا، اب وقت آیا جبرئیل کے پر لگا کر اڑانے اور ضربِ کلیمی لگانے کا:۔

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے
ابھی محفل میں ہے شاید کوئی دردآشنا باقی!
تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہِ صبح گاہی میں ہے!
تعمیرِ آشیاں سے میں نے یہ راز پایا

اہلِ نوا کے حق میں بجلی ہے آشیانہ
میری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے انھیں ذوقِ آتش آشامی
میں نے پایا ہے اشکِ سحرگاہی میں!
جس دُرِ نایاب سے خالی ہے صدف کی آغوش!
اندھیری شب ہے، جدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل!
اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی!

ہندوستان کی سرزمین ہو یا یورپ کی، اقبال کے نواؤں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ان نواؤں کے ذریعے وہ ہر جگہ انسانوں کی زندگی، ماحول، تضاد، جدوجہد، کشمکش، جنبش اور حرکت کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان سے اجتماعیت اور انفرادیت دونوں ایک مزاج بن کر ہمارے ذوقِ حسن اور ذوقِ عمل دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کرتے ہیں۔ جب ہندوستان کی سرزمین پر وہ نوا پیرا ہیں تو ملک و قوم سے یوں مخاطب ہیں:

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا
وہ گُل ہوں میں، خزاں ہر گُل کی ہے گویا خزاں میری
ریاضِ دہر میں نا آشنائے بزمِ عشرت ہوں
خوشی روتی ہے جس کو میں وہ محرومِ مسرت ہوں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

مگر ان میں حرماں نصیبی نہیں آئی، امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ اپنی نواؤں سے وہ آفتابِ تازہ کا پیغام دینے لگے:

ہوں وہ آج اپنے زخمِ نہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
مجھے اے ہمنشیں! رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں
کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

غم و الم اور افسردگی کے تمام وقتی تاثرات کے باوجود ان نواؤں میں تازہ تر اور شاداب تر قدریں جمع ہونے لگیں۔ قرطبہ پہنچے پر امید کا یہ دامن وہاں بھی نہیں چھوٹتا:

ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا
مری نوا میں ہے سوز و سرورِ عہدِ شباب

اور پھر یورپ میں یہی نوائے سحرگاہی نئی دنیا تعمیر کرنے کی آئینہ دار بنی:

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

اقبال نے اپنی نوائے پریشاں کے ذریعہ پرانی نفسیات کے خلاف جنگ کرنے اور نئی نفسیات کو منظم کرنے کا کام لیا۔ پرانے طریقِ فکر، عادات اور خصلتوں کے جواب میں نیا طریقِ فکر، نئی عادتیں اور نیا نفسیاتی ردِ عمل پیدا کیا۔ ان کا یہ تخلیقی فعل ایک جذباتی ہیجان کا نتیجہ ہے مگر وہ فقط جذبے کی ہیجان کا نتیجہ ہے مگر وہ صرف جذبے کی ہیجانی کیفیت کو پیش کر کے خاموش نہیں رہ جاتے۔ ان کا یہ اضطراری فعل شعور کو بھی شامل کر کے شعر کی شکل میں ظہور پذیر ہونے کے قبل ان میں تناسب و توازن پیدا کرتا اور نظم و ترتیب سے کام لیتا ہے اور اس طرح اُن کی

صورت یا ہیئت میں جمالیاتی تصور کا خون نہیں ہوتا۔

اقبال میرِ کارواں تھے مگر ایک درماندہ کارواں کے۔ انھیں لوگوں کے دلوں کے تاریک گوشوں میں ایک بڑے نصب العین کے حصول کے لیے شمع جلانی تھی۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ذرا ان کی ہمت دیکھیے:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

اقبال کی نوائے پریشاں میں "سوز و ساز و درد و داغ و جستجوئے آرزو" کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو ان کی چالیس سالہ شاعری پر مختلف رنگوں میں ظہور پذیر ہوتا رہا۔

کبھی حیرت، کبھی مستی، کبھی آہِ سحر گاہی
بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا دردِ مہجوری

اقبال کا دل روایتی شعرا کا دل نہیں تھا جو ہجومِ غم سے فرار حاصل کرنے کے لیے، فانی کی طرح، موت کی آس لگائے بیٹھا ہو، یا جو غالب کی طرح موت تک سے ناامید ہوچکا ہو بلکہ اس دل میں آتشِ گل کو اور تیز تر کرنے کی تمنا تھی، ایک ولولہ تھا، جوش تھا طغیانی تھی۔ اقبال کا دل:۔

دل نہیں شاعر کا، ہے کیفیتوں کی رستخیز
کیا خبر تجھ کو، درونِ سینہ کیا رکھتا ہوں میں

اقبال کیا کچھ کہنا چاہتے تھے اس کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ اس کے لیے انھیں نفسِ جبرئیل چاہیے تھا:

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

اقبال نے پھر بھی بہت کچھ کہا اور خوب کہا اور کامیاب بھی ہوئے۔ تشنہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے مگر رگِ تاک کو تھامنے کی سکت کتنوں میں ہے۔ اقبال محرمِ رازِ درونِ میخانہ تھے۔ انھیں اس کا اندازہ ہوچکا تھا کہ سارا قصور میخانہ اور ساقی کا ہے۔ میخانہ کا یہ عالم کہ پیمانہ ہے تو بے صہبا اور جہاں ایک ٹوٹی ہوئی مینا میکشوں کو رو رہی تھی۔ اقبال کا ساقی شرابِ خانہ ساز لایا۔ لگا مئے پردۂ سوز پلانے جس میں سوز و سازِ ازل تھے۔ شراب خانے میں بھیڑ لگنے لگی کہ:

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز!

جب لوگوں نے تلچھٹ تک پی لی تو سبھوں پر راز ہائے بادہ و ساغر کھل گئے اور اقبال اپنی کامیابی پر خوش ہوئے:

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

ایک وہ وقت تھا جب اقبال نے جھنجھلاہٹ میں میں لکھا تھا:

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد!
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد!

اور ایک وقت وہ آیا جب سرمایۂ غمِ فرہاد سے عشرتِ پرویز خریدنے کے منصوبے لوگوں نے بنانے شروع کیے، لوگوں کے مقاصد ہمدوشِ ثریا ہونے لگے۔ بھٹکے ہوئے آہوؤں کو سوئے حرم لوٹنے کا رستہ دکھائی دینے لگا اور محرومِ تماشا کو دیدۂ بینا حاصل ہوگیا۔ اقبال کی نوائے پریشاں کام کر گئی۔ اس کا احساس انھیں بھی تھا:

(باقی صفحہ ۲۳ پر دیکھیے)

سعادت سعید

انور سجاد کے افسانے

استعارے انور سجاد کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے اس میں سولہ افسانے شامل ہیں۔ سازشی، شہر کے عین وسط میں صحرا تھا، پتھر، لہو کتا، شیرانے سنڈریلا، پرومیتھیس، گائے، پرندے کی کہانی: سروئیر درشن ۲، دوب ہوا اور لیجا، چھٹی کا دن، کارڈ ٹیک دمہ، کیکر کی کونپل واپسی، دیو جانس، روانگی، پچھو غار نقش "۔۔۔ یہ وہ افسانے ہیں جن کی بدولت انور سجاد نئے اردو افسانے کے صفِ اول کے افسانہ نگار ہیں۔ یہ افسانے بیسویں صدی کے نصف آخر کی پہلی اور دوسری دہائی کے وجودیاتی مسائل کی دستاویز ہیں۔ سسی فس کی لایعنیت اور پرومیتھیس کی زندگی بخش تمنائیں دو انتہائیں ہیں جن کے درمیان ان افسانوں کے آشوب اور کشمکش میں مبتلا بے اسم مگر حقیقی کردار متحرک ہیں۔ ان کرداروں کا استفسار ہے کہ وہ نہر جس سے نکلی ہوئی مٹی کی ٹوکریاں اٹھا اٹھا کر وہ ٹرکوں میں ڈالتے رہتے ہیں کب مکمل ہوگی؟ اس عہد کے ویسٹ لینڈ کو کیسے کارآمد بنایا جا سکتا ہے؟ شہر حقیقی صحرائی ویرانوں میں تبدیل ہو چکے ہیں چھاتیوں والی کہاں ہے جو اپنی تخلیقی قوتوں سے چھپکلیوں، گوہوں، گدھوں اور ڈھانچوں کے طلسماتی حصار کو توڑ کر زندگی اور آزاد آبادیوں کی نشاندہی کر پائے گی؟ کتوں کی پھونکاریں انسانی پیروں میں کیوں الجھتی ہیں، فسطائی طاقتوں کے قائم رہنے کے کیا اسباب ہیں "سیاہ پتھر" کی حصول کی جنگ میں ٹوٹی والا آبلہ پا اور پستول والا نقاب پوش دونوں مارے جاتے ہیں کتا زندہ رہتا ہے؟ سامراجی چالوں کی حیثیت کیا ہے ہماری آبادیوں اور دولت کے ذخائر پر کیسے قابض ہوتے ہیں؟ سماجی جکڑبندیوں میں آئیڈیل کی تلاش کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ کچلے ہوئے وجود کو مزید کچلنے والا خوفی زبان کا حامل خصیلہ کتا محبت کی متلاشی روحوں پر کیسے حملہ آور ہوتا ہے؟ ضمیر کی یہ ظاہر دیوانی اور مجذوبانہ آوازوں پر کان کیوں نہیں دھرے جاتے؟ قلم اور اس کے بطن کی آتش لایعنیت کے برفستان میں کیوں کر گم ہوتی ہے؟ زبان ہلانے پر لوگ بوچڑ کیوں بنتے ہیں چتکبری گائے یا نیکے کے وجود کو بوچڑ خانے لے جانے کے لیے کیا کیا حکمت عملیاں سامنے آتی ہیں دشمن کون ہے؟ انسان کے اپنے وجود کی کمزوری یا خارجی فسطائی ماحول بندوق کی نالی کسے نشانہ بنائے؟ گائے کو بچھڑے کو ڈاڈیوں کو بابا کو یا اپنے آپ کو؟ ہر کردار ایک دوسرے سے

واقعاتی طور پر کچھ یوں متحد ہے کہ دشمن کی پہچان مشکل ہے۔ سفید فام سیاہ دربان کو رشوت دے کر خونخوار پرندے کو کیسے گرفتار کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر پرندہ اسے مکمل طور پر زخمی کر کے مقامی ماحول کے پروردہ بچے کے پاس رہنے پر خوش ہے؟ حب الوطنی کی اس قسم کی صورتِ حال سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ہر گلی لیبر تھہ کی سی کیفیت پیش کر رہی ہے اور ہر مکان کے نیچے کا پائپ پھٹا ہوا نظر آتا ہے سرویئر لڑکی تعفن اور بدبو کے ماحول سے گھبراتی بھی ہے اور خوف زدہ بھی ہے بوڑھیا کا شوہر کارپوریشن میں شکایت درج کرانے گیا تھا بارہ سال سے یا بارہ ہزار سال سے غائب ہے اور خستہ مکانوں کی بنیادوں میں پانی گھستا چلا آ رہا ہے اس طور کے تبدیل ہونے کے امکانات تک نظر نہیں آتے! منتظر مسائل سے بھری دنیا امام مہدی کے ظہور کے معاملات میں الجھی ہے مادی مفادات کی صورتِ حال میں حقیقی انسانی رشتے غائب ہو چکے ہیں مردوں کے لیے گوشت پوست کی عورتوں کے بجائے ان کی چھاتیوں کے عین درمیان لٹکتے لاکٹوں سے فریفتگی کی حد تک پیار ہے۔ آمرانہ سیاسی ماحول کے خاتمے کے لیے احتجاجی صداؤں کا شور بھی بلند ہوتا ہے مگر ماحول جوں کا توں رہتا ہے انسانوں کا دم گھٹ رہا ہے اور پرندے سانس کی نوید لے کر پلٹنے سے قاصر ہیں۔ زمین پر بانجھ بادلوں کا سایہ ہے ایڑیاں مارتے مارتے ایڑیاں چھل گئی ہیں مگر سفیدی سبز نہیں ہو پاتی اور سبزی سرخ ہونے کا نام نہیں لیتی دریا کی جانب قدم بڑھاتے لوگ زندگی کی کشمکش میں فیصلے اور انتخاب کی اہمیت سے واقف ہیں دریا کہ جو زرخیزی اور زندگی کی علامت ہے۔ اذیت خانوں میں تشدد کا نشانہ بنتے دلیر افراد سماج کی مکمل تبدیلی کے آئیڈیل رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کے بعد نئی نسل کو اس کونپل کا تحفظ کرنا ہے جس میں مستقبل کی تبدیل ہونے والی صورتِ حال کی خوشبو، رنگ اور تاثیر پوشیدہ ہے۔ عوامی تحریکیں شکستہ وجودوں کو جینے کا حوصلہ دیتی ہیں یہ زخمی پرندوں کو کو دوسرے پرندوں کی آوازوں سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔ انور سجاد کے افسانوں کے کردار اور واقعات موجود زندگی سے امکانی زندگی کے پر پیچ راستے طے کرتے ہیں اور پھر اپنے مرکز کی جانب پلٹتے ہیں۔ مرکز کہ جو انور سجاد کا مرکز تجسس بھی ہے۔ اپنے عہد کی اصلی اور مسائل سے بھری زندگی! جہاں انسانوں کی قلبِ ماہیت عمومی ہے کافکا کا میٹا مورفسس (META MORPHOSIS سارتر کا فلائز، کامیو کا پلیگ، انور سجاد کے افسانوں میں تحد الوجود ہونے کے عمل میں ہیں۔ وجود کے چولا بدلنے، نامرد ہونے اور سیاسی و سماجی آشوب میں گھرنے کی داستان انور سجاد کے افسانوں میں کھل کر سامنے آتی ہے۔ انور سجاد کے شعور کا فیبرک واقعات و مسائل کی جوہری تفتیش سے تیار ہوتا ہے۔ مختلف النوع انسانوں کے چہروں اور بوقلمونی واقعات کے پس پردہ حقائق کی پہچان نے انور سجاد کے ویژن کو باریکیوں اور تہہ داریوں سے ہمکنار کیا ہے۔

انور سجاد نئے اردو افسانے کی اہم ترین شخصیت ہیں۔ انھوں نے اپنے وجود اور اس کے حوالے سے

خارجی دنیا کی انسانی شخصیت کو مسخ کرکے بنیادی مسائل کو اپنے افسانوں کی حدود میں سمیٹا ہے ان کے تہہ داریوں سے آشنا تخلیقی انداز کی بدولت نئے افسانے کو ایسے کوزے مہیا ہوئے ہیں جن میں معانی کے ہمہ سمت بہتے دریا بند ہو سکتے ہیں۔ انور سجاد کے اس قول کی " انھوں نے افسانہ لکھنے کا فن پہلے "منٹو" سے سیکھا ہے" اعترافی سچائی کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ بدستور موجود ہے کہ جورایا اور استعارہ کی افسانوی تخلیقات نے اردو افسانے کو جس اسالیبی تنوع، تکنیکی پھیلاؤ اور موادی وسعتوں سے ہمکنار کیا ہے اس کی مثال اردو افسانے کے ماضی میں موجود نہیں ہے۔ انور سجاد کے افسانوں کو گنجلک اور چیستان نما بھی کہا گیا ہے لیکن یہ معاملہ بھی اضافی ہے گنجلک اور چیستان نما ان کے لیے جو دبستان پریم چند کے فارغ التحصیل ہیں۔ استعاراتی اور علامتی اسالیب کے شناسا قارئین کے لیے مبہم اور مہمل نہیں ہیں۔ استعارہ شناس اور علامت پسند قارئین کے لیے استعارے اور علامتیں اشیا یا وقوعات کی نمائندگی نہیں کرتے اشیا اور وقوعات ہی ہوتے ہیں۔ استعارہ سازی اور علامت بندی انور سجاد کے لیے وجود سازی اور جوہر بندی ہے ان کے افسانے "وجود فی الحال" کے اظہار سے معمور ہیں۔ وجود فی الحال کا تخلیقی اظہار ادب کو سماج کی برہنہ طلسم کاریوں سے نبرد آزما ہونے کا سلیقہ عطا کرتا ہے۔ خالق کا ضمیر حالتِ اضطراب میں رہتا ہے۔ وجود کشمکش اور بحران سے بغل گیر ہوتا ہے۔ احساس اور تعقل معانقے کے عالم میں ہوتے ہیں۔ انور سجاد کے طریقِ اظہار میں ان عناصر کا بھرپور عمل دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے آؤٹ لک اور ویژن کی درست اور مثبت سمتوں کے امین ہیں۔ بے بنیاد مابعد الطبیعات، بے کار حکایاتی اسلوب اور داستانی سبق آموزیاں انور سجاد کی تحریروں سے خارج ہیں۔ تشبیہی اور سطحی تمثیلی اسلوب ان کے دائرۂ کار میں نہیں ہے۔ ان کی علامتوں میں واضح اور یقینی رابطے تلاش کرنا بے سود ہے۔ استعاراتی گہرائیاں اور تمثالاتی پیچیدگیاں ان کے فن پاروں کی آئینہ بندی میں شریک ہیں۔ غیر یقینی پھیلاؤ اور جمالیاتی ابہام انور سجاد کے وجود کے آشوب اور ضمیر کی تعقلاتی جہتوں کا منطقی نتیجہ ہیں۔ مفروضاتی اور غیر ارضی سینسیبلٹی ان کی اقلیم ادراک کا ممنوعہ علاقہ ہے۔ وہ نہ تو کسی صوفیانہ مسلکے کی از سرِ نو معانی بندی کے قائل ہیں اور نہ ہی انھیں زرعی تہذیب کے وفادار دانشوروں اور عالموں کی تشکیل شدہ اخلاقی قدروں سے کوئی انسیت ہے۔ انور سجاد صنعتی تہذیب کا المیہ یا زوال اس لیے منعکس نہیں کرتے کہ زرعی تہذیب کی "جنتِ گم گشتہ" کی مدحت ہو۔ ان کے افسانوں میں زرعی تہذیب کے اقداری مظالم اور صنعتی تہذیب کی میکانکی نفسیات ہر دو کی بھرپور خدمت کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ ان کے افسانوں میں فرد نشانۂ تنقید نہیں ہے بلکہ فرد سازی کا وہ کلچر یا وہ نظام مطعون ہے جس میں فرد کی فردیت اور اجتماع کی اصلی اجتماعیت

غائب ہوجاتی ہے۔ وہ جزو، حصے، ٹکڑے یا اکائی پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے کل اور تکمیلیت کا احاطہ ..... کرتے ہیں۔ شجرِ تہذیب کے پتوں، ٹہنیوں یا تنے کے امراض کا مرکز جڑوں میں تلاشتے ہیں۔ استعارے کے افسانے اس سستی رومانیت سے علاقہ نہیں رکھتے جو قاری کو نظامِ موجود کی چمکتی دمکتی بھول بھلیوں میں بھٹکاتی ہے۔ ان افسانوں میں اساطیری کرداروں کی اساطیری سوچوں کی تشکیلِ نو سے احتراز کیا گیا ہے۔ یہ افسانے ترقی پسندوں کی نصابیاتی کتب میں درج شدہ جواب مضمون بھی نہیں ہیں۔ زندگی اور اس کے مسائل کی عکاسی محض یا ان کی بلاکم و کاست تصویر کشی انور سجاد کے لیے روا نہیں ہے۔ انسان دوستی کا تجریدی تصور جس میں انسان دشمنوں اور انسان دوستوں کی واضح شناخت نہ ہو ان کے لیے دیانتداری کا مظہر نہیں ہے۔

انور سجاد کے اسلوب اور مواد کا جائزہ یہ حقیقت منکشف کرتا ہے کہ ان کے افسانے اردو افسانے کی تاریخ میں ایک نئے جاندار دور کی شکل ابھارتے ہیں۔ سادہ بیانیہ انداز سے واضح گریز، براہِ راست اظہار سے کھلی علحدگی، روایتی گھڑی گھڑائی جملہ سازی سے دانستہ احتراز اور ان کی جگہ پیچیدہ اظہاریاتی انداز کی تزئین، گنجلک علامتی انداز کی آئینہ بندی، نئی شکستہ و ریختہ تلازماتی زبان کا استعمال انور سجاد کو اسلوب کے اعتبار سے روایتی اردو افسانے سے منفک کرنے کے تخلیقی اسباب ہیں۔ موضوع اور مواد کی نئی جہتیں اور نئے تناظر میں ان کے نئے مرکبات بھی انور سجاد کے افسانوں کو روایتی افسانوی اثاثے سے ممیز کرتے ہیں۔

عشقیہ اور رومانوی موضوعات اور ماحول کی یک سطحی عکاسیاں ان کے دائرہ فن سے خارج ہیں۔ سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند کے عہد کے موضوعات اور طریقِ اظہار انور سجاد کے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں۔ نئے عہد میں فرد کی منتشر سائیکی، سماجی اور اخلاقی قدروں کی اتھل پتھل، نچلے طبقوں کی مجبوریاں، فسطائیت کی متنوع قومی اور بین الاقوامی صورتیں، سیاسی آمار چڑھاؤ کی واردات اور نظریاتی وابستگیوں کے معاملات انور سجاد کے افسانوی کل کے خصوصی اجزا ہیں۔ روحوں کے ریشم کو کاٹنے والی تنہائی، اعصاب کے مہین دھاگوں کو کترنے والے اجنبیت کے دانت، جسموں کی زرخیزیوں کو چاٹ لینے والی جلاوطنی کی زہریلی ہوائیں، منور آنکھوں کو بے بصر..... کرنے والی لایعنیت اور مہملیت اور اعضاء کو تھکا دینے والی میکانکی بے مصرف زندگی یہ سب کچھ انور سجاد کے افسانوں کو جدید ترین افسانے کی وسعتوں سے ہمکنار کرنے کے لیے کافی ہے۔ سماج کے بطن میں زوال کا سرطان داخل کرنے والا اقداری ڈھانچہ، بین الافرادی دشمنیاں، نفرتیں اور ان کے ردِ عمل میں نشو و نما پانے والا مخصوص ماحول، طمع، ہوسِ زر اور ان رذیلوں کا ثمرہ حاصل کرنے کے لیے جذبات کشیاں، انسان کشیاں، محبتوں اور ہمدردیوں کا روزمرہ سکرین سے غائب ہونا یہ وہ صورتِ حال ہے جس میں انور سجاد کے ضمیر کی تجسیمی صورتیں یا فن کارانہ چیخیں ان کے اکثر و بیشتر افسانوں کے تار و پود میں شامل ہوئی ہیں۔ محنتوں اور جوہروں کے استحصال سے زرعی اور صنعتی نہنگوں کی شکم سیریاں، انسانوں کی

یسیاں، غیر معیاری رہن سہن کیڑوں مکوڑوں کی سی زندگی
ںور سجاد کی فنکارانہ صلاحیتوں کی گرفت میں ہے۔ ضمیر اور
جبر کے اظہار میں حائل رکاوٹیں، غلامانہ شعور کار دزافزوں
ال، ہر نوع کے غیر انسانی رویوں کی زہرناکیاں یہ غلافہمی
نعتی قزاقوں کی چالبازیاں انور سجاد کی تحریری توجہ سے
ہر نہیں ہیں۔ وہ اس سارے ماحول کی بیخ کنی کے لیے
اضح نقطۂ نظر کا سراغ لگا چکے ہیں۔ ان کے ذہن میں ایسے
ظرنامے موجود ہیں جو ایک نئی طرز کے انسانی نظام کی
امتیں لیے ہوئے ہیں۔ انور سجاد اپنی معنوں میں ایک
ابستہ افسانہ نگار ہیں۔ ان کی وابستگی زندگی اور سماج
آزادانہ نشوونما کا جوہر رکھنے والے نظام سے ہے۔

انور سجاد کی نثر صحافتی سادگی سے کوئی رابطہ نہیں
بلکہ ان کے افسانوں میں واقعات اور معاملات داخلی
یفیات کا پرتو لیے ہوئے ہیں۔ خارجی زندگی اور داخلی
یفیاتی ادراک کے متوازن وصل نے انور سجاد کے اسلوب
یں متنوع ڈائمنشنز (DIEMENSIONS) اجاگر
ی ہیں۔ واقعاتی صداقتوں کو منعکس کرنے الفاظ کی
رگوں میں جب ویژن اور داخلی کیفیات کا لہو دوڑتا ہے
و زبان متحرک اور زندہ ہوجاتی ہے۔ حرکی اور زندہ زبان
متحرک اور زندہ حقائق کی امین ہوتی ہے۔ انور سجاد
منجمد تصویروں کے مصور نہیں ہیں۔ ان کے اسلوب میں
لفاظ تخلیقی چمک دمک اور امکانی وسعتوں سے معمور
ہیں۔ استعاراتی نامیات معلامتی توانائی اور تاثراتی
ندخیزی انور سجاد کے ..... نثری اسلوب کو خزاں زدگی
سے بچانے میں معاون ہیں۔ تلازماتی ایمجری، ایمائی

انسلاکات، اشاراتی رابطے اور نشاناتی حوالے ان
کے نظریات اور ضمیر کی بھٹی میں پگھل کر کندن ہوتے ہیں
یوں اردو افسانے کی تاریخ میں اسلوب کا زرِ خالص
دکھتا نظر آتا ہے۔ انور سجاد کے افسانوں میں الفاظ
کی اکائیاں خانوں میں مقید نہیں ہیں باہمدگر پیوست
ہیں۔ زبان کا اس نوع کا برتاؤ افسانہ نگار کے خیالات،
جذبات، تاثرات اور نظریات کے متحد الوجود ہونے کی
دلیل ہے۔ ان کے ایک افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

[سڑک کے کنارے لاریاں، جیپیں، ایک
طرف کو ہٹ کر آگ بجھانے والی ٹینکی کی لاری، لوہے کے
خود، سنگینیں جن کی دیوار کے پار پھولے ہوئے پیٹ،
لکڑی زبانیں، زخمی نرخرے اور ان سب کے سروں
پر فضا میں لہراتے پوسٹروں بینروں پر لکھے ہوئے لفظ
جن سے منعکس دھوپ کی کرنوں کے صرف دو رنگ قلم کی
سیاہی، خون کی سرخی جذبے کی حدت لیے، صرف ایک
آواز، صرف ایک خیال جو صدیوں کے بعد حلق کی کال کوٹھڑی
کی دیواروں کو توڑ کر اب بادِ مخالف کی دوسری مدافعتی
دیوار سے ٹکرانے کو تیار ہے۔ کر آلٹی گڑی میخوں والے
فل بوٹ۔ جن کی نوکیں صدیوں سے صحت مند سینوں
کا لہو پیتی رہی ہیں۔ آج یہ سینے ان میخوں والے فل بوٹوں
سے اپنا خون بہا چھینیں گے] [افسانہ: واپسی،
دیوجانس۔ روانگی: استعارے]

بیدار بخت
(صدر انجمن اردو کینیڈا)

سلام مچھلی شہری ، چند تاثرات

کوئی پچیس تیس برس پرانی بات ہے۔ ہم دلی کے ایک مشاعرے میں تھے۔ جب شمع مشاعرہ سلام مچھلی شہری کے سامنے آئی تو ہم "مچھلی شہری" جیسے غیر شاعرانہ نام سے بہت محظوظ ہوئے مگر جب سلام جھومتے ہوئے آئے اور نشے کی سی لکنت میں ایک ایک لفظ جما جما کر اپنی نظم پڑھنے لگے تو ہم ان کے بارے میں پہلے سے قائم کی ہوئی رائے بھول کر ان کی نظم میں گم ہو گئے۔

تم ہتھیلی کی طرف صبح کو آیا نہ کرو
باغ میں منچلے بھونرے بھی ہوا کرتے ہیں
وہ نشانہ جو بنائیں گے تو پھر کیا ہوگا

کم عمری میں شعر کی گہرائیوں تک پہنچنے کی نہ سمجھ تھی نہ دماغ مگر الفاظ کی سادگی اور شعر کی دلکش صوتی شکل نے دل پر ایسا اثر کیا کہ سارے مشاعرے کے دوران ذہن میں بس یہی گونجتا رہا کہ :

بار بار آئینے کے سامنے آیا نہ کرو
بعض آئینے بھی جاندار ہوا کرتے ہیں
بڑھ کے سینے سے لگا لیں گے تو پھر کیا ہوگا

اسی روز سے سلام صاحب ہمارے "ہیرو" بن گئے۔ بچپن کے اور بہت سے ہیرو، مثلاً شفیق الرحمن، شوکت تھانوی، وغیرہ۔ عمر کے ساتھ جاگتے ہوئے شعور کا ساتھ نہ دے سکے [illegible]

کا جادو نہ اترا۔ وہ اشعار جو بچپن میں الفاظ کی نغمگی اور چلبلے پن کی وجہ سے اچھے لگتے تھے کچھ شعور آنے کے بعد احساس کے کچھ اور تاروں کو بھی چھیڑنے لگے۔

اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ اردو کے کون سے شاعر کے کلام پڑھنے سے ہمیں سب سے زیادہ خوشی ملی تو ہم بلا تامل سلام صاحب کا نام لے دیں گے۔ ان کے کلام پر تبصرہ کرنے سے ہم جھجکتے ہیں، اس لئے کہ ان کے اشعار سے لاشعوری طور سے مرعوب ہیں۔ شاید غیر جانب دار ناقدانہ نظر سے انھیں پرکھ نہ سکیں۔ سچ پوچھئے تو ہمیں سلام صاحب پر ایک اعتقاد سا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اعتقاد کی بنیاد منطق پر کم اور جذبات پر زیادہ ہوتی ہے۔ ہم اس کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے کہ ہمارے "اعتقاد" کی نازک سی دیوار کو، جس نے ہمیں اس قدر خوشی دی ہے، تنقید کی سرد اور بے رحم سنگینی سے کچھ ٹھیس پہنچے۔

اس مضمون میں اگر آپ اسے مضمون کہنا چاہیں تو نہ تو آپ کو سلام کے کلام پر عالمانہ تنقید ملے گی اور نہ ہی ان کی زندگی کے ایسے حالات جو عوام کے علم میں نہیں ہیں، ان سے ذاتی طور سے بس ہم اس قدر ہی واقف تھے کہ وہ ہمارے ایک بزرگ کے آشنا تھے اور ایک دوست کے ہم پیالہ۔ اس مضمون کا [illegible] یہ ہے کہ :

جب کبھی دلّی جاتے تو اپنے بزرگ سے اصرار کرتے
یسی طرح سلام صاحب سے ملوا دیں۔ ہر دفعہ یقین دلایا جاتا
ہ جب کہو" اور بات ہمیشہ آج کل پر ٹل جاتی۔ جب ۱۹۷۲ء
ں خبر ملی کہ سلام صاحب کا انتقال ہو گیا تو کیا بتائیں کیسا قلق ہوا
ن سے نہ مل سکنے کا!

معلوم ہوا کہ دلّی کے ولنگڈن نرسنگ ہوم میں ایک بڑے
آپریشن کے بعد ۱۹ر نومبر ۱۹۷۳ء کو ان کا انتقال ہوا۔ آپریشن
سے کچھ دن پہلے ایسی حالت میں کہ زندگی سے پیار بھی تھا اور
[illegible] بھی انہوں نے یہ نظم کہی:

سحر کا دھندلکا
بلند اور گھنیرے درختوں کے پیچھے
کلس برلا مندر کے یوں لگ رہے ہیں
کہ جیسے کوئی دیوتا آسماں سے
سفید ابر پاروں پہ بیٹھے ہوئے
آسماں سے
زمیں کی طرف آ رہے ہیں
ولنگڈن کے سینتیس[۳۷] نمبر کے کمرے کا
یہ سبز پردہ اٹھا کر
[illegible]
[illegible] کو ہوگا
مگر دیوتا برکتیں اپنی لے کر
[illegible] سے میرے ہی لیے آ گئے ہیں
[illegible] اے اجل کوشش!
[illegible] فیانو!
[illegible] سے کیوں مجھکو گھیرے ہوئے ہو
میرے پردۂ ذہن سے اب ہٹو بھی
کہ مجھ کو سحر کا یقین ہو گیا ہے
یقیناً ابھی کام کرنا ہے مجھ کو
یقیناً ابھی اور زندہ رہوں گا

اُردو شاعری کے شاہ کاروں میں شاید اس نظم کا شمار کبھی نہ ہو مگر یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سلام کے بیان میں خلوص اور صداقت ہے اور یہ کہ وہ صرف شعر موزوں کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے بلکہ فطرتاً شاعر ہیں۔ ایسا شاعر جو زندگی کے تجربے کو نظم کر کے صفحۂ قرطاس پر رقم کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ جب موت اتنے قریب آئے تو کسے ہوش رہتا ہے کہ شعر کہے؟

سلام کو دنیا کی حسین چیزوں سے، جن میں زندگی بھی شامل ہے، بہت پیار تھا۔ موت کا خیال گوارا نہ تھا، مگر آخری دنوں اس کا احساس بہت شدت سے تھا۔ بارہا اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں دیں کہ "نہیں ابھی اور زندہ رہنا ہے"۔

بہت علیل ہو لیکن یہ بزدلی ہے سلام!
کہ تم کو موت کا سایہ دکھائی دینے لگا

سلام کو موت کا خیال ناگوار تھا مگر اس سے ہار ماننے کو تیار نہ تھے

زبردستی جو موت آئی
(وہ آتی ہے اور آئے گی)
تو میں کوشش کروں گا شاخ ہائے لالہ و گل کو
جکڑ لوں اپنے ہاتھوں سے
گلابوں سے کہوں گا تم ابھی مجھ کو نہ جانے دو
اگر ہارا تو اس دنیا کی ساری دلکشی لے کر
زمیں کی گود میں ایک گہری نیند سو لوں گا
میں محبوبہ نہیں ماں سے کہوں گا پھر جگہ دینا
بڑا ضدی سا بالک ہوں
میں تیری گود میں پھر شعلۂ گل بن کے ابھروں گا

اُردو شاعری کی روایت کے برعکس سلام کے ہاں کمتر ہی شعر ایسے ملیں گے جو صرف اس لیے کہے گئے ہوں کہ بات خوبصورت ہے۔ ان کے اکثر شعر زندگی جیسی پیچیدہ صنف

کے تجربے پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کی ایک نظم کے کچھ حصے ملتے ہیں جو ان کی بچی سلمیٰ کی علالت کے بارے میں ہے:

میرے آنگن میں جو "بیلے" کا حسیں پودا ہے
اس میں ایک پھول ہے اور تین سہانی کلیاں
اک کلی زرد ہے، بیمار ہے، افسردہ ہے

٭

اسی عالم میں وہ بیمار کلی کہتی ہے
باغباں مجھ کو بھی اک پیار کا بوسہ دے دو
ساز ہوں لاکھ شکستہ سہی، نغمہ دے دو
شمع ہوں، لاکھ فسردہ ہی، جلوہ دے دو

٭

اور پھر بیلے سے ایک شورِ فغاں اٹھتا ہے
میرے خوشبو بھرے آنگن میں دھواں اٹھتا ہے
راس پھولوں کا بھی صد حیف نہ انداز آیا!
"زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا"

عبدالسلام ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ اسکولوں میں صرف میٹرک تک پڑھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں رومانی نظموں کا مجموعہ "پھول" شائع ہوا۔ مگر برطانوی سرکار نے ان کی انقلابی نظموں کے مجموعے "انگارے" کو چھپنے کی اجازت نہ دی۔

۱۹۴۲ء میں شادی ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں ملازم ہوئے۔ پھر کماسٹرس والس اور بی بی سی لندن میں بطور شاعر اور گیت کار کے کام کیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے رسالے "مضراب" کے ایڈیٹر رہے۔ اور پھر آکاش وانی سرنگھم لکھنؤ اور دلی میں فیچر رائٹر رہے۔ آخری دنوں میں آکاش وانی کی "اردو مجلس" سے متعلق تھے۔

سلام صاحب کو نظم اور نثر دونوں پر بڑی قدرت تھی۔ سنتے ہیں کہ وہ "اردو مجلس" کے لئے اسکرپٹ ہمیشہ آخری چند گھنٹوں میں صرف ایک نشست میں بغیر کسی قطع و برید کے مکمل کر دیا کرتے تھے۔ کئی ناولٹ، افسانے، اور ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے۔

سلام کی ایک ابتدائی دور کی نظم میں منظر کشی کی کیفیت ملاحظہ کیجیے۔ نظم ہے: "جنگل کا ناچ"

جنگلی لباس میں ایک پیکرِ گداز
چل رہا ہے جھاڑیوں میں سانپ جھوم جھوم کر
اڑ رہا ہے مور اپنے بال چوم چوم کر

٭

دستِ صندلی اٹھے
پاؤں لہر کھا گئے
جسمِ ناز کے شرار
جھیل کے کنارے مست ہو کے ناچنے لگے

٭

عکسِ ماہتاب میں
ایک پیکرِ گداز اور ناچنے لگا
ڈھولکوں کی مست چیخ اور تیز ہو گئی
جنگلی حسینہ اور شعلہ ریز ہو گئی
مورتی کا دیوتا، خود ہی مسکرا اٹھا
اور جیسے چونک کر
رقص بند ہو گیا
کس قدر غرور تھا
کامیاب رقص پر

اس نظم کو پڑھ کر شاید وہ لوگ اپنے خیال بدل دیں، جو کہتے ہیں کہ اگر شعر روایتی طریقے سے پابند نہ ہو تو ترنم و تغزل سے محروم ہو جاتا ہے۔

الفاظ کی کفایت اور مصرعوں کی چستی سلام کے اشعار کی خاصیت ہے۔ ان کے اکثر مصرعے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر نثر کی جائے تو ایک لفظ اِدھر سے اُدھر کرنے کی ضرورت نہ ہو:

ہاں چھیڑیے حضور کوئی دلنواز بات

خوش قسمتی سے آج کا موسم حسین ہے
وہ دیکھئے نا چاند کے ماتھے پہ کس قدر
ان بادلوں کا گیسوئے پُرخم حسین ہے
آخر یہ کس خیال میں ڈوبی ہوئی ہیں آپ؟
ذمّہ مرا جو چاند نہ قدموں میں آ جھکے
بس اک ذرا حضور اسے آواز دیجئے

عمیق حنفی نے سلام کے لئے بڑی صحیح بات کہی ہے کہ وہ زندگی بھر زندگی میں شاعری اور شاعری میں زندگی کا حسن ڈھونڈتے رہے اور میٹھے میٹھے نرم نرم گنگناتے ہوئے ریشمی اور رنگین لفظوں میں قدرت، عورت اور زندگی کی تصویر کشی کا تجربہ کرتے رہے۔ وہ حسن کے دلدادہ تھے۔ اس لئے قدرتی طور سے عورت کا حسن بھی ان کا موضوعِ سخن رہا مگر ان کا طرزِ تخاطب روایتی شاعری سے ہٹا ہوا تھا۔ ان کی ایک نظم ہے "پھول پر وار" اس میں وہ پہلے حسن کی تعریف کرتے ہیں:

شکریہ آپ کے اس درجہ حسیں ہونے کا
آپ نے حسن کی تاریخ کو وسعت دی ہے
سائیکی سیکھتی ہے آپ سے آدابِ جمال
آپ ہی نے دلِ کیوپڈ کو لطافت دی ہے
جان پڑتا ہے اجنتا کی حسینہ کوئی!
آئینہ خانۂ پیرس میں سنور آئی ہے

پھر تنبیہہ کرتے ہیں کہ:

آپ کالج کے جوانوں کی غزل ہیں بیشک
پھر بھی روحِ دلِ فنکار نہیں بن سکتیں

روحِ دلِ فنکار بننے کی شرط یہ ہے کہ حسین ہونے کے علاوہ آپ وہ احساس بھی پیدا کریں کہ:

میں کسی شعر میں گر حسن کی تعریف کروں
تم اسی شعر کی تشریح مجسم ہو جاؤ
بہکے وقت کسی پھول کو گر دیکھوں اداس
اک ذرا سوچ کے دردِ دلِ شبنم ہو جاؤ

ایک جگہ حسن کو خبردار کرتے ہیں کہ حسن و جوانی غیر پائیدار ہے:

کہاں تک رُخوں کے غزالوں کے ہمراہ
یہ گیسوؤں کے پاسباں جاگیں گے
ابھی دو قدم پر زمانے کی آندھی
بہارِ گلِ یاسمن لوٹ لے گی
لب و عارض و چشم و گیسو کا
ہنستا ہوا مسکراتا چمن لوٹ لے گی

میں شاعر ہوں اس واسطے بندہ پرور
شگفتہ بہاروں کا غم جانتا ہوں

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

آج ایک بات بھی سن لو کبھی کام آئے گی
ہم سے دل والوں میں پتھر بھی ہوا کرتے ہیں
جب کوئی پھول بہت تیز مہک اٹھتا ہے
اس کی نکہت کے لئے سرف دعا کرتے ہیں

یوں نہیں کہ ہمیشہ انھیں حسن سے ڈر لگتا ہے۔ کبھی کبھی وہ حسن کی تزئین بڑے کلاسیکی انداز میں، مگر اپنے بیان کی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے کرتے ہیں:

"بول" ایک گرتے ہوئے سانس ایک آواز ہے
آج اک بانکپن، ایک انداز ہے
آج کچھ بات ہے، آج کچھ راز ہے
میرا دل کہہ رہا ہے خدا کی قسم!
آج آئے گی شاید قیامت کہیں
حسن خود بیں بھی ہو، حسن تنہا نہیں!
شمع جیسی بھی ہو، بن پتنگا نہیں!
ان دلوں اہلِ دل کا بھروسا نہیں!
دیکھنا اس مچلتی حیا کی قسم
آ نہ جائے کسی کی طبیعت یہیں

سلام صاحب وہی کہتے تھے جو محسوس کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے آپ ان کے خیالات سے متفق نہ ہوں، مگر شاید اس

اتفاق کریں گے کہ ان کے بیان میں صداقت ہے۔ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی نظم کے کچھ حصے سنیئے۔ اس نظم کا عنوان ہے 'تیری سلمیٰ تیری عذرا نے کہا' اس کو وہ نذر اختر شیرانی لکھتے ہیں

جھانک کر پردۂ مہتاب سے سلمیٰ نے کہا
'میرے محبوب کا پیغامِ محبت یہ ہے
زندگی حسن کے قدموں پہ لٹائی جائے'
چھپ کے سازِ گل و نسریں میں یہ عذرا نے کہا
"ملکۂ حسن کا انعامِ محبت یہ ہے
دل کے ایوانوں میں خود آگ لگائی جائے"

٭

ساحلِ کوثر و تسنیم سے آئی یہ صدا
'آدم و حوا کی عظمت کی نشانی یہ ہے
جسم اور روح کی ہر پیاس بجھائی جائے'

سلام صاحب کی انقلابی نظموں کے مجموعے کا بس ذکر ہی سُنا ہے۔ اس کی نظمیں کبھی نظر سے نہیں گذریں۔ آزادی کے بعد کی نظموں میں ایک 'سیاسی' نظم ہے۔ 'سکوتِ رقص' یہ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کا مضمون کم و بیش وہی ہے جو فیض کی مشہور نظم "صبحِ آزادی" کا ہے۔ سلام صاحب کی نظم کے کچھ حصے سنئے! دیکھئے کیسے سنگین مضمون کے لئے کیسے کیسے نرم نرم اور رسیلے الفاظ استعمال ہوئے ہیں

زہرۂ محفل زندسا یا ہوا
پائے نازک میں پھر موچ کیوں آگئی
آج تو ساز و نغمہ ہم آہنگ تھے
آج اپنے اشارے پہ تھا میکدہ

٭

اس سے پہلے تو یہ سوچ لیتے تھے ہم
ساری محفل میں اک غم کی تصویر ہے
اپنی رقاصۂ زندگی کیا کرے
اس کے نازک سے پاؤں میں زنجیر ہے

٭

آج تو پائے نگیں میں پائل بھی ہے
آج ہاتھوں میں پھولوں کا کنگن بھی ہے
آج تو میکدہ پر جوانی بھی ہے
جام و مینا بھی، نغمہ بھی، ساون بھی ہے

٭

صرف اک رقص مخمور کی تھی کمی
اور تو جوشِ محفل سے گھبرا گئی
میری رقاصۂ زندگی تھیرجا

سلام کی شاعری میں 'نعرے' نہیں ملتے۔ درشت بات بھی لکھتے ہیں تو نرمی اور خوبصورتی سے'۔ بھارت اور چین کے تنازعہ کے دوران بہتیرے قوم پرست شاعروں نے چین کے خلاف غم و غصہ کا اظہار خون گرما دینے والی جوشیلی اور نعروں سے بھرپور نظموں میں کیا۔ سلام نے بھی ایسے موضوع پر ایک نظم لکھی۔

دوست اس طرف ہمالہ کی طرف مت آنا
ورنہ برف آگ کے پھولوں میں بدل جائیگی

کہ تنبیہہ ہے مگر شاعرانہ۔

سلام صاحب کی زندگی بہت خوشی میں گذری۔ بہت ذہین اور حساس آدمی تھے مگر زندگی میں ان کی کلا اور ذہانت کی مناسبت سے کبھی جگہ نہ ملی۔ ان سے کمتر شاعر اپنی ناقص شاعری کے باوجود حکومت کی نظر میں شاعر قرار دیئے گئے اور اونچے رتبوں پر رہے۔ مگر سلام صاحب بیچارے بہت سیدھے آدمی تھے۔ ریڈیو اسٹیشن کی چھوٹی سی نوکری کی اور معمولی تنخواہ میں جیسے تیسے گذارا کیا۔ مجاز کے دوستوں میں سے تھے اور ان کی طرح شراب کمزوری سی بن گئی تھی۔ شراب کی وجہ سے ان کو بہت لوگ طعن و تشنیع کرتے مگر شاید کسی [illegible]

کسی کو یہ توفیق ہوئی ہو کہ ان کے فرار اور مجبوری کا سبب جان سکے۔ خود کہتے ہیں :

منزل وہ آچکی ہے کہ اب تم سلام کو
جس طنز یہ خطاب سے چاہو پکار لو
اے ناقدانِ رندی و آوارگی معاف
جب جانو اس کی طرح سے دو دن گذار لو

ہم ایسے کئی لوگوں کو جانتے ہیں جو انھیں شراب پینے کے لئے صرف اس لئے مدعو کرتے تھے کہ ان کی شگفتہ باتوں اور کلام سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ایسی ہی کچھ بیوفا مگر دولت مند ماہ پاروں کا ذکر ان کے کلام میں آتا ہے۔ خدا جانے کہ وہ ذکر پر مبنی ہے کہ مشاہدے پر۔ ایک نظم میں "ماہ پارہ" کی زبان سے لکھتے ہیں :

میں کچھ اداس تھی تنہا تھی تم سے ملنے لگی
تم اپنے دل میں یہ سمجھے مجھے محبت ہے
تم اپنے شوق کا رنگیں محل سجانے لگے
مجھے بھی ملنے لگے مشغلے مسرت کے

٭

دلِ جواں کو نہ اب اور بھی ملول کرو
جو ہو سکے تو مری معذرت قبول کرو

ایک اور نظم میں کہتے ہیں :

کون کہتا ہے آپ ایک شاعر کے نغمے شبِ ماہ میں گنگنایا نہ کیجئے
مگر جب وہی کیف افروز نغمے
دلِ مضطرب کو سکوں دے نہ پائیں
تو پھر اپنے شاعر سے روٹھا نہ کیجئے
کہ شاعر کے نغمے وہی راز کہتے ہیں
جو دل کے پردے میں پوشیدہ رہتے ہیں
آپ ان پہ یوں تلملایا نہ کیجئے

آخر ہی دنوں میں ایک جگہ سیز فائر (CEASE FIRE) تجویز کیا :

نہیں تم خوبصورت ہو تمہیں یہ حق پہنچتا ہے
ستاروں کو مسل دو چاند کو پامال کر ڈالو
اگر ان نرگسی آنکھوں میں میخانے مچلتے ہوں !
تو ظاہر ہے کہ تم پلکوں پہ آنسو کس لئے لاؤ
اگر ان ناصری ہونٹوں پہ ہر دم گیت ڈھلتے ہوں
تو یہ کس نے کہا ہے بے سبب افسردہ ہو جاؤ
تمہاری کیا خطا کیں اگر فطرت کے ہاتھوں نے
نظامِ سیم و زر میں تم کو ماہ پارا بنایا ہے
مرا بھی کیا قصور لیکن اگر مجھ کو غریبی نے
گلِ مہتاب کی محفل میں انگارہ بنایا ہے
غرض آنسو کا اب تارے سے سمجھوتا ضروری ہے
گل رُوی کا انگارے سے سمجھوتا ضروری ہے

شاعری میں سلام کی محبوب صنف نظم تھی وہ بھی اکثر آزاد، مگر کبھی کبھی بقولِ خود غزل میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے :

سلام آزاد شاعری کی طویل و دشوار راہ میں ہم
کبھی کبھی بر ربط تغزل پہ گنگنا بھی چاہتے ہیں

ہمیں یاد ہے کہ علیگڑھ کے ایک مشاعرے میں نظمیں پڑھنے کے بعد اپنی ایک غزل سنائی یہ کہہ کر کہ : "یہ بھی سنئیے کہ سلام غزل کیسے کہتا ہے"۔ ان کی غزلیں ان کے وقت کی عام راہ سے ہٹ کر ہوتی تھیں۔ غزل کے اشعار بھی زندگی کے تجربات کی عکاسی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو بڑے چونکانے والے شعر کہے ہیں۔ ملاحظہ ہو :

آنسوؤں میں کوئی غنچہ نہ کھلا میرے بعد
زندگی کس نے گزارا درد سہا میرے بعد

غم میں مسکراتے رہنے کی کتنی اچھی تصویر کھینچی ہے۔ دو اور شعروں میں دُکھ کی انتہا کا نقشہ دیکھئے :

یہ سوت ظلم ہے ملک کہ صبح ہوتے ہی
تمام گھر میں اندھیرا دکھائی دینے لگا

وہ برف میں ہوں جو سوچتی ہے سجا کر بھی
اُداس اُداس سا تنہا دکھائی دینے لگا

اس شعر میں دیکھئے کیسا انوکھا استعارہ استعمال کیا ہے۔

جیسا بھی ہو سلام تغیر ہے لازمی
وہ حبس ہے کہ لوگ دعا مانگتے ہیں لوگ

ایک اور شعر سنیے:

گناہ کی راہ میں اک روشنی کا سوز بھی تھا
مرے لئے ابھی اسے نا محمود دعا نہ کرو

سلام کو الفاظ کے استعمال اور ترکیب پر وہ ملکہ تھا خواہ مضمون کیسا ہی ہو، شعر خوش آہنگ اور موسیقی سے پُر لگتا ہے۔ آپ خود ہی دیکھئے:

بات کچھ بھی نہ تھی آنکھ جھپک یوں سرِ شاخِ گُل کیوں حجاب آ گیا
اک کلی پھول بن کر مہکنے لگی، منتقل رنگ و بو میں گلاب آ گیا
بزمِ گیتی میں دورِ خزاں کی قسم، بڑھ گیا تیری رحمت کا شاید بھرم
میں نے رکھا ہی تھا میکدے میں قدم جھک کر آسماں پر سحاب آ گیا

ہماری پسند کے کچھ شعر سنیے جو ہم برسوں سے گنگناتے ہیں اور سر دھنتے ہیں!

چھوڑ کر خلد کو آدم نے فرشتوں سے کہا
خود فسردہ سا نہ ہو جائے خدا میرے بعد

ذرا انہیں کسی مفلسی کے خواب بتلا دو
تڑپ رہے ہیں جو دنیا کے لئے بو کیلئے

تم اپنی بجلیوں کی نزاکت کو دیکھ لو
ہم جانتے ہیں اپنا نشیمن سنبھالنا

چلو یہ ٹھیک ہے میں کشتۂ شراب سہی
نظر تمہاری بھی ہے کچھ جھکی جھکی لیکن

اسی غزل کا ایک اور شعر

میں جانتا ہوں یہ کمبخت ایک ناگن ہے
بہت حسین نظر آتی ہے زندگی لیکن

دُنیا کو آج فرصتِ نغمہ نہیں سلام
بیکار ہو رہے ہو پریشان، چپ رہو

بات یہ ہے تم اتنی سادہ اتنی مخلص ہو کہ تمہیں
اپنے نام کی خاطر تم کو کچھ مغرور بننا ہے

اور آخر میں:

کچھ زندگی بھی چھین رہی ہے مجھے سلام
کچھ میں بھی کم شریر نہیں زندگی کے ساتھ

کچھ ناقدین کا یہ کہنا ہے کہ سلام کے کلام کی وہ چنگاریاں، جو ان کے شروع کے کلام میں نظر آتی تھیں، شعلہ بن کر نہ ابھر سکیں، ہو سکتا ہے یہ درست ہو مگر ان کے شعر پڑھنے سے ایک خوشی ملتی ہے اور بعد میں دل میں ایک کسک سی رہ جاتی ہے، ایک احساس جرم سا، کہ ان کی زندگی میں ہم نے ان سے وہ سلوک نہیں کیا، جو ہم پر واجب تھا۔

پیت نامہ صفحہ ۲۹ سے آگے

سیّد قدرت اللہ، نعمت کا، ہے دریا
دونوں جگ کے نعمت، فی الحال میں بھریا

مرشد کا صورت میں نبی کی، ہے صورت
نبی کی صورت میں مومنوں کی صحبت
نعت جگت کے ناریاں چھیتوں پیو کو پایا
باطن میں نبی کو، ہر شئے میں بجھانا
الف، نوشو ہے جیوں، عارس، میم کا معنا
دونوں کے درمیانے، نبی کا ٹھکانا
یہ جماعت مبارک، اچھوتے، ملن کی
عارس شوگی خوبی، خوشی اور لگن کی
نوشو، عارس دونوں، آپس میں بیگانے

ڈاکٹر صابرہ سعید

ناز صدیقی فن اور شخصیت

انسان کو اگر فطرت نے دو قوتیں نہ دی ہوتیں (یاد رکھنے کی قوت اور بھول جانے کی قوت) تو یقیناً زندہ رہنا ناممکن ہو جاتا۔ ناز کی موت نے یادوں کے موتی کچھ اس طرح بکھیر دیے کہ انھیں سمیٹنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ ناز پر میں نے بہت دیر میں لکھا ہے مگر ایسا نہیں کہ میں نے ناز کو بھلا دیا ہو۔ اُس کے بچھڑ جانے کے باوجود اس کی یاد دل میں زندہ ہے اور مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کونسی یاد کو یاد رکھوں، کونسی یاد کو بھول جاؤں۔ ناز کبھی نہیں مر سکتی، جو روح زندگی سے اتنی محبت کرتی ہو گرمیِ جذبہ میں اتنا ایقان رکھتی ہو کیا وہ کبھی ختم ہو سکتی ہے! نہیں کبھی نہیں!!

اُس سے ملاقاتیں تو بہت کم ہوئیں لیکن احساس ہوتا ہے کہ جتنی بھی ہوئیں وہ زندگی کی خوش گوار یادوں کا انمٹ نقش ہیں۔ میری پہلی ملاقات ناز سے عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ہوئی اس کے بعد کبھی کبھی لائبریری میں ہماری ملاقات ہو جایا کرتی۔ تفصیلی ملاقات ہم دونوں کی اُس وقت ہوئی جب کہ صدر شعبہ اردو ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب نے ہم دونوں کو ایک ہی کالج میں یعنی "سیف آباد سائنس کالج" میں پڑھانے کا موقع دیا۔ دونوں نے آرڈر لیا اور ایک دن مقرر کر کے ساتھ ہی JOINING REPORT. دی اُس کے بعد ہماری ملاقاتیں دوستی میں تبدیل ہوئیں، دوبارہ ہم دونوں ویمنس کالج میں ملے یہاں بھی اتفاق سے دونوں نے ساتھ ہی JOINING REPORT. دی اور دو سال تک ساتھ کام کیا۔ اکثر ہم دونوں مل بیٹھتے اور مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے لیکن وہ اتنی کم گو تھی کہ سنتی بہت اور کہتی کم۔ بہت کم سخن لیکن بڑی ذی فہم تھی بہت لیے دیے رہتی کبھی نزاعی نہیں بنی کالج میں صرف اُسے اپنے کام سے دلچسپی تھی درس و تدریس کی حد تک، اس سے آگے کچھ نہیں جہاں تک میری معلومات ہیں اُس کا زیادہ وقت مطالعہ میں گزرتا تھا چناں چہ اتنی کم عمری میں اس کی تین کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ہند و پاک کے اہم جرائد میں اُس کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

ناز صدیقی کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا جب وہ اسکول کی طالبہ تھیں تب ہی سے

اُس نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ ناز صدیقی ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد کے ایک معزز علمی گھرانے میں پیدا ہوئیں ۱۹۶۱ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے میٹرک کامیاب کیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے ہی ۱۹۶۲ء میں پی۔ یو۔ سی کامیاب کیا۔ ونتیا مہا ودیالہ سے ۱۹۷۲ء میں بی۔ اے کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے ۱۹۷۵ء میں ایم۔ اے اردو امتیازی حیثیت سے کامیاب کیا۔ جب وہ ایم۔ اے کی طالبہ تھیں تب ہی سے اُنہیں تنقید نگاری اور ادبی موضوعات پر لکھنے کا شوق ہوا۔ ایم۔ اے میں ناز نے "ساحر لدھیانوی کی شخصیت اور شاعری" پر مقالہ لکھا جسے بعد میں ترمیم اور اضافہ کے ساتھ کتابی شکل میں دہلی کے ایک ممتاز پبلیشر نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا اس کتاب کی رسم اجرا "اردو ہال حیدرآباد میں" ممتاز شاعر فیض احمد فیضؔ کے ہاتھوں انجام پائی۔ ساحرؔ کی حیات اور شاعری پر یہ پہلی جامع کتاب ہے کسی ترقی پسند شاعر پر اس قدر متوازن اور غیر جانبدارانہ تنقید اس سے پہلے کسی نے نہیں کی اس کتاب کے پڑھنے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ناز نے نہایت عمدگی سے ساحرؔ کی شخصیت اور فن پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ ساحر پر کتاب لکھنے کے بعد ناز کا شمار نوجوان نقادوں میں اہمیت کے ساتھ لیا جانے لگا۔ ناز نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لیے "حلقۂ ارباب ذوق ایک ادبی تحریک" کو انتخاب کیا تھا جس کی نگرانی ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صاحبہ کر رہی تھیں مقالہ تقریباً قریب الختم تھا۔ اس کے مضامین۔ کہانیاں اور تبصرے آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتے رہے ہیں۔

ادبی قابلیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ "اندازِ بیان" جو کہ سات تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں ناز نے کلاسیکی اردو ادب کے چند پہلوؤں کا جائزہ خوب لیا ہے مثلاً ولیؔ کی شاعری کا لسانی مطالعہ اپنے اندر غیر معمولی جاذبیت رکھتا ہے۔ حالیؔ کی تنقید نگاری ایک مربوط مضمون ہے جس کو بڑی کاوش سے لکھا گیا ہے۔ "افاداتِ مہدی صنفی حیثیت اور اسلوب" میں یہ احساس دلایا ہے کہ مہدی اِفادی باضابطہ انشائیہ نگار نہیں ہیں لیکن ان کی شخصیت میں ایک انشائیہ نگار کے سارے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ "جنگ آزادی میں شعراء کا حصّہ" ایک مربوط مضمون ہے جس میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے حالات کا تجزیہ کیا ہے۔ بعض حادثات قوموں کی زندگی میں ایسے بھی پیش آتے ہیں جو ان کی تاریخ کے دھارے کو بدل کر رکھ دیتے ہیں یہ حالات شاعروں اور ادیبوں پر کس طرح اثر انداز ہوئے ہندوستان کی سیاسی جماعتیں جب ایک سمجھوتے پر پہنچ گئیں اور انگریزوں نے اقتدار ہندوستانیوں کے ہاتھوں سونپ دیا اس وقت ہمارے شاعروں نے اس آزادی کا خیر مقدم کس طرح کیا اور اُن کے کیا احساسات تھے اشعار کے ذریعے ناز نے بتانے کی احسن کوشش کی ہے۔ بقولِ مجازؔ

"یہ انتہا نہیں آغازِ کارِ مرداں ہے"

"کمیونسٹ پارٹی کا نقطۂ نظر۔ ہندوستان کے زمینداروں اور سرمایہ داروں کا حال آزادی کے بعد سوشلزم کے قیام کا خواب شرمندۂ تعبیر ہی رہا۔ اس ردِ عمل کا اظہار

تقریباً سبھی ترقی پسند شعرا کی نظموں میں ہوا جو آزادی کے بارے میں لکھی گئی تھیں۔ اُن میں سے بعض اہم اشعار کو منتخب کر کے ناز نے اپنے مضمون میں اس انداز سے سمویا ہے جو اپنی آپ نظیر ہے۔ جیسے فیض کا یہ شعر:

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

ساحر کا تاثر:

یہ جشنِ جشنِ مسرت نہیں تماشا ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس

سردار جعفری نے اس آزادی کو فریب قرار دیتے ہوئے کہا:

خنجر آزاد ہیں سینوں میں اُترنے کے لیے
موت آزاد ہے لاشوں پہ گزرنے کے لیے

جاں نثار اختر نے سوال کیا:

ہند صدیوں کی غلامی سے تو آزاد ہوا
تم بھی آزاد ہوئے؟ اہلِ وطن سے پوچھو

۱۹۴۷ء کے بعد فسادات کا پس منظر اور ان سے پیدا ہونے والے حالات ہمارے شعر و ادب کا موضوع بنے ہوئے ہیں یہ چیز ختم نہیں ہوی ناز نے اپنے اس مضمون میں اُن بکھرے ہوئے حالات کو سمیٹنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ان مضامین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ناز تنقیدی ادب کے بنیادی تقاضوں سے پوری طرح واقف تھی۔ تنقید میں ناز کا اندازِ نگارش سنجیدہ اور دل نشیں ہے

"ساحر لدھیانوی کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ" ساحر کی شاعری پر مختلف ادیبوں اور نقادوں نے یوں تو بے شمار مضامین لکھے لیکن فنی نقطۂ نظر سے ان کی شاعری کا سیر حاصل تجزیہ نہیں کیا گیا تھا یہ کام ناز کے ہاتھوں انجام پایا۔ اس میں شاعر کی شخصیت کی جھلک۔ نظریات۔ نظم نگاری۔ غزل گوئی۔ فلمی شاعری اور اسلوب پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں سب سے بہتر حصّہ نظم نگاری کا ہے جس میں ناز نے ساحر نے کونسی بحریں استعمال کیں، ان کی نظم نگاری کی ابتدا اور ان کی مشہور نظموں کا جائزہ لیا۔

"ساحر نے نظم نگاری کے لیے اگرچہ پرانے سانچے استعمال کیے ہیں لیکن ان سانچوں کو روایتی انداز سے نہیں برتا انھوں نے زیادہ تر نظمیں بند والے سانچوں میں لکھیں" ان کے کلام میں صرف ایک نظم "پرچھائیاں" ملتی ہے جس میں دو مختلف بحروں کے استعمال کا کامیاب تجربہ کیا گیا ہے خود ساحر کے اپنے خیال میں یہ سب سے اچھی نظم ہے اس نظم کا موضوع امن ہے۔ ساحر کی نظم "پرچھائیاں" بقول خواجہ احمد عباس کوئی منشور نہیں ہے یہ شدید طور پر ذاتی اور دلوں پر اثر انداز ہونے والی انسانی داستان ہے جس میں حقیقت اور شاعرانہ تخیل گھل مل گئے ہیں" دوسری مشہور اور کامیاب نظموں میں سے ایک نظم "کبھی کبھی" بھی ہے ناز نے اس نظم کا تجزیہ نہایت خوبی سے کیا ہے لکھا ہے کہ "نظم کے آغاز میں یہ مصرعہ کلمہ کے ایک جز کی حیثیت سے آتا ہے جو اپنی جگہ کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ دوسرے مصرعوں کے ساتھ مربوط ہو کر ایک مفہوم پیدا کرتا ہے:

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گزرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی۔

نظم کے آخر میں یہ مصرعہ اپنے اندر ایک طویل داستان اور احساسات کی دنیا سمیٹے ہوئے سامنے آتا ہے۔

"کسی کو اداس دیکھ کر" "گریز" "تاج محل" جیسی نظموں کا تجزیہ بہت خوب کیا اسی طرح دوسرے مضامین بھی اپنے اندر غیر معمولی جاذبیت رکھتے ہیں۔

"مجلہ تحقیقاتِ اردو" شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے اس شمارے میں بیشتر مضامین اسوسی ایشن کے ماہانہ جلسوں میں پڑھے گئے تھے انہی میں کا ایک مضمون "مولانا صلاح الدین احمد اور ان کی ادبی خدمات" پر ہے۔ جس میں ناز نے صلاح الدین احمد کی شخصیت، سیرت ان کی زندگی کے چند نمایاں پہلوؤں کی جھلک دکھائی ہے جس سے شخصیت کا ایک عمدہ تصور قاری کے ذہن میں نقش ہوجاتا ہے جیسا کہ ناز نے لکھا ہے کہ بعض لوگ بہت خدمت کرتے ہیں لیکن اُن کی خدمات کا کسی کو اندازہ ہی نہیں ہوسکتا ایسی ہی شخصیت صلاح الدین احمد کی بھی تھی ۱۹۴۷ء کے فسادات میں کسی نے ان کے دفتر "ادبی دنیا" پر بم پھینکا جس سے تمام دفتر راکھ کا ڈھیر ہوگیا مکان بھی لوٹا اور جلایا گیا۔ اس عالم میں بھی مولانا نے اپنے حواس برقرار رکھے اور ایک نئے عزم کے ساتھ اردو زبان و ادب کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا۔ ۱۹۵۰ء میں ایک ادارہ قائم کیا جس کا مقصد اردو کے معیاری اور کلاسیکی ادب کے سستے ایڈیشن شائع کرنا تھا تاکہ اردو کی ترویج ہو سستی کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ادبی دنیا کو بھی عوامی مقبولیت کا سستا رسالہ بنادیا تین سو صفحوں کے رسالے کی قیمت صرف ایک روپیہ تھی وہ ایک عرصہ تک خسارہ برداشت کرتے رہے۔ صلاح الدین احمد ترقی پسند نظریۂ ادب سے متفق نہیں تھے لیکن ترقی پسند ادیبوں کی اچھی تخلیقات کو اپنے رسالے میں ضرور جگہ دیتے ان کے ہاں ادب کا بنیادی مقصد مسرت بہم پہنچانا تھا۔ ناز نے اپنے اس مضمون میں یہ احساس دلایا ہے کہ ان کے بے شمار مضامین ادبی دنیا اور دوسرے رسالوں میں منتشر ہیں اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو احساس ہوگا کہ وہ بڑے ادیب اور بلند قامت نقاد تھے"

ناز نے بہت کم وقت میں زبان و ادب کی بے مثال خدمات انجام دیں اس کا اپنا ایک خاص اسلوب تھا۔ اس کی نثر دلنشیں ہوتی تھی سادگی بیان اور سادہ زبان لکھنا آسان نہیں کیونکہ ہمارے ہاں ادب میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ سادہ زبان لکھنے میں تحریر بے مزہ ہوجاتی ہے لیکن ناز کی تحریریں اثر ہے یہ بات اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب کہ زبان پر قدرت ہو اور موضوع تحریر پر بھی غائر نظر ہو۔ یہ دونوں باتیں اس کی تحریر میں ملتی ہیں۔ اس کا اندازِ بیان بہت صاف ستھرا ہے بڑی باتیں بھی چھوٹے جملوں میں کہنے کا سلیقہ ہے اس کے مضامین قابل فہم اور غیر معمولی دلکشی رکھتے ہیں۔ ناز کی تحریروں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا ادبی مستقبل کس قدر روشن تھا۔ لیکن افسوس کہ قضا و قدر نے اس شگفتہ پھول کو پوری رعنائیوں کے ساتھ مہکنے کا موقعہ نہ دیا۔

سیدہ طیبہ بیگم

آہ ناز صدیقی

مُنّی وہ غنچے کا تبسم کہاں گیا ؟
اُن کی وہ ناز اُس کا تکلم کہاں گیا ؟

موت سے کسی کو مفر نہیں لیکن زندگی تو اس پر روتی ہے جو عین عالم شباب میں مُنہ پر کفن اوڑھ لیتا ہے۔ منوں مٹی کے نیچے چھپ جاتا ہے۔ ہمیشہ کی تنہائی، اپنوں سے دوری — نہ ہوا نہ پانی نہ اُجالا نہ روشنی کیسے وقت کٹتا ہوگا؟ کیسے دن ڈھلتا ہوگا؟ کیسے رات گزرتی ہوگی؟؟

ناز کی ہم شبیہہ، نازک سی ایک دن کی شیرخوار بچی! آج جب میں نے تجھے اپنی گود میں لیا۔ تیری پیاری پیاری صورت، سرخ و سفید رخسار، پھول کی پنکھڑی جیسے گلابی گلابی ہونٹ اور نیم وا کبھی سوتی کبھی جاگتی آنکھوں کو دیکھا تجھے کیا بتاؤں منّی کیا کیا میں نے سوچا۔ اور جب سے تیرے پاس سے لوٹی ہوں، یہی سوچتی رہی ہوں کہ ماں کی مسکراہٹ اور محبت کے بغیر کیا تیرا جیون سپھل ہوگا!!

عورت کی زندگی اور اس کی کہانی۔ بہت پرانی ہے۔ مدت سے یوں ہی چلی آرہی ہے، یوں ہی چلتی رہے گی۔ اُمید و ناامیدی کے چاند سورج یوں ہی اُبھرتے، چمکتے اور ڈھلتے رہیں گے۔ رشتے بنتے اور ٹوٹتے رہیں گے۔ نازبرداریاں ہوتی رہیں گی۔ دل آزاریاں ہوتی رہیں گی۔ دنیا والوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے یہ تو چلتی رہی ہیں چلتی رہیں گی — "بے چاری لڑکی ماں کی گود بھی نہ مل سکی۔ پیدا ہوتے ہی ماں چل بسی —" ظالم دنیا والے نہ جانے کیا کیا تجھے کہیں گے۔ کیا تجھ سے سلوک کریں گے اس میں تیرا کیا قصور ہے۔ ننھی ؟ ۹ مئی کی صبح تیرے لیے پیام زندگی لائی اور ماں کے لیے پیام وصال — چاند کی نرم کرنوں کے ساتھ وہ ماں آسمانوں پر پہنچ گئی اور سورج کی شعاعیں تجھے سونپ گئیں۔ کون جانے تیری پیدائش کے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اندر تیری بدنصیب ماں پر کیا کیا گزری ہوگی کس قدر تڑپی ہوگی۔ دفعتاً ارمانوں کے سیلاب تھم گئے۔ سانس اکھڑ گئی اور تیرے خوب صورت پیکر کو آہوں میں سمیٹنے کی آرزو دم توڑ گئی۔

ان سارے مراحل سے بے خبر تو کبھی نانی کی گود میں، کبھی آپو کے، کبھی خالہ کی، کبھی گلشنی کی گود میں ہاتھوں ہاتھ گھومتی رہی۔ ان کے آنسوؤں سے ناآشنا، ان کے درد سے ناواقف، خود اپنے نصیب سے لاعلم کیسی بڑی قربانی تیری ماں نے

تیرے لیے کی ہے۔ تجھے زندگی دے کر اس نے آنکھیں موندلیں۔ چند نااہل ہاتھوں نے تیری ماں کی معصوم خوشیوں کا گلا گھونٹ ڈالا۔ اس کی تمناؤں کا شجر کاٹ ڈالا۔ نہ جانے کیا ہوا، کیسے ہوا۔ جو کچھ بھی ہوا بہت بُرا ہوا۔ نوخیز کلیاں جب نوچ لی جاتی ہیں تو دنوں اس کا زخم ہرا رہتا ہے۔ ننھی! تیری ماں بھی تو ایک نوخیز کلی کی مانند تھی جب سے تو نازکے بدن کا ایک جزو بنی ہوگی۔ کون جانے ناز نے کس کس طرح تیری ناز برداریاں اٹھائی ہوگی کتنی راتیں بےچینی، بےقراری میں گزاری ہوگی تیرے ابّو نے کتنے بار تیرے متعلق تیری ممی سے ہنس، ہنس کر اچھی اچھی باتیں کی ہوں گی کیا کیا خواب دونوں نے مل کر دیکھے ہوں گے۔ تیرے لیے کیا نام سوچا ہوگا۔ صبوحی! نہیں دلکش! یہ بھی نہیں کوئی اور اچھا سا نام سوچا ہوگا۔ اور تو ان سب باتوں سے بےخبر پروان چڑھ رہی تھی زندگی کے ساحل پر پہونچنے کی دیر تھی کہ پتوار ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ ہاتھ بےدم ہوگئے۔ جو تیرے خوبصورت بوجھ کو تھامنے کے لیے ترس رہے تھے۔ تجھے سینے سے لگانے کے لیے منتظر تھے۔ آنکھیں تیری آنکھوں میں ڈال کر تجھے دیکھنے کی منتظر تھیں۔ تیرے آنے کا کس قدر انتظار تھا۔ لیکن تیرے آنے سے بہاریں نہیں آئی، خوشیاں نہیں آئیں، مسکراہٹیں نہیں پھیلیں۔ کرب ناک چیخیں اٹھیں۔ تارِ نفس ٹوٹا اور تیری پیاری ماں ہمیشہ کے لیے سو گئی۔ بچھڑ گئی۔

تیری نانی کا کلیجہ پھٹ پڑا۔ تیرے نانا تڑپ کر تیری :ہلیز پر سر ٹیکنے لگے، تیرے ابّو نے قسمت کی اس مار پر خون کے آنسو بہائے، سب ہی گھر والوں نے دل تھام لیے۔

پیاری بچّی! ادھر دیکھو ناز کی کتابیں اس کی راہ تک رہی ہیں۔ الماری منتظر ہے کہ اب پٹ کھلیں گے اور اب ناز اپنے کپڑے منتخب کرکے کالج کی راہ لے گی۔ شاخِ اردو کو گل بوٹوں سے سجانے والی اچانک چلی گئی۔ بے رحم گل چین کے ہاتھوں اس کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا۔ اور تیرے ابّو کے لیے اندھیرے پھیل گئے ــــ آنسو ہی آنسو، آہیں ہی آہیں ہیں اب۔ موسم گرما کی چنبیلی کی سوگندھ، برسات کی سوندی، سوندی خوشبو اور سرما کی دل گداز راتیں سب ناز اپنے ہی ساتھ لے کر چلی گئیں۔ گھر والوں کو تجھے سونپ گئیں جیتی جاگتی موتیا کی بند کلی۔ تیرے نصیب میں وہ نسیم سحری بھی نہیں جس کا نام "ماں" ہے۔ وہ خوشگوار برکھا نہیں جس کا نام ماں کی ممتا ہے۔

جب جب تو لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بنے گی۔ تیری صورت کے عکس میں تیری ممی ہی ممی نظر آئے گی جو تجھے نظروں سے پیار کرے گی۔ تیرے خوب صورت نازک پیکر میں ممی کا پیکر نظر آئے گا تو آنکھیں بھر آئیں گی سینوں سے آہیں نکلیں گی۔ اپنی ممی کی آخری نشانی بن کر تو اپنے ابّو کے سینے سے لپٹی رہے گی۔ پھر گھنٹوں گھنٹوں چل کر تو ان کی یادوں کے کنول کھلاتے رہے گی اور ناز ــ اپنے حریم ناز سے تجھے دیکھ دیکھ کر تڑپے گی۔ تیرے ساتھ روئے گی۔ تیرے ساتھ ہنسے گی۔ تیرے لیے وہیں بارگاہِ خداوندی میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتی رہے گی۔

پیاری نومولود ننھی! تم کیا سمجھو گی کہ غنچی کا تبسم کیوں پھیکا پڑ گیا۔ ساز کیوں تھم گئے اور نغمہ کیوں خاموش

ہو گیا! یہ سمجھنے کے لیے تو تمھیں برسوں انتظار کرنا ہوگا اور پھر تمھیں محسوس ہوگا۔ ایک دن کہ تم نے کیا کھویا اور تمھاری شگفتہ زندگی میں کس چیز کی کمی ہے گزرتے ہوئے لمحوں سے بے پرواہ جذبات و محسوسات کے عالمِ ہیجان سے ناواقف ننھی نازک سی کلی — ہو سکے تو ممی کے آنسو پونچھ ڈالو۔ ان کے تبسم لٹا سکو تو لوٹا دو — اپنے وجود سے ان کی بکھری شخصیت کو سنوار دو۔ تیرے ابو کی زندگی کا روشن چراغ تو بجھ گیا اب تو ہی ان کی زندگی کا مینا بن جا — ایک روشن مینار کہ ناز کی بے چین روح کو قرار آ جائے۔

(جناب سید علی اکبر صفحہ سے آگے)

پوتیاں، نواسے، نواسیاں، پرنواسے، پرنواسیاں نہایت سعادت مند ہونے کی وجہ سے اُن کو ذہنی سکون حاصل ہے خدا نے انھیں علم، دولت، شہرت سے نوازا ہے اُن کا حافظہ ابھی تک بہت اچھا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو میں جب کوئی ادبی جلسہ منعقد ہوتا ہے۔ سید علی اکبر صاحب ضرور شرکت فرماتے ہیں۔ وضع داری ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ انسانی قدروں کا وہ بہت احترام کرتے ہیں رحم دلی اُن کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ دورانِ ملازمت انھوں نے غریب طالب علموں کی ہر طرح سے مدد کی۔ اساتذہ کے وقار کو بڑھایا۔ خدائے سخن میرؔ نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا تھا ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ہم اہلِ حیدرآباد کو اس بات پر فخر ہے کہ سید علی اکبر جیسی باکمال ہستی اور قدیم تہذیب کی علمبردار شخصیت ہمارے درمیان موجود ہے۔

مظفر النساء ناز

وہ ایک پھول

(ناز صدیقی کے انتقال پر)

○

وہ ایک پھول
تر و تازہ زندگی کی طرح
مہکتا
خوشبوئیں پھیلاتا، صحنِ گلشن میں
عجیب رنگ سے ابھرا تھا تازگی کے لیے

اچانک ایسے میں
محفل دھواں دھواں سی ہوئی
بجھا چراغ
اُجالوں کی تشنگی لے کر
نہ جانے کون سی منزل میں رہ گیا سورج

یہ کیسا غم ہے
گلستاں میں شورِ ماتم ہے
یہ کیسا غم ہے
اُجالوں کی آنکھ پُرنم ہے

۵۵

فضا ابنِ فیضی

منتظر تھے اسی اک لمحے کے پیکر سارے
آنکھیں ابھریں تو سنورنے لگے منظر سارے

ریت اوپر سے ہٹی تھی کہ بدن بھیگ گیا
جذب جیسے مرے اندر تھے سمندر سارے

چھو گئی دھوپ تو یہ لوگ پگھل جائیں گے
اپنی دیواروں سے چپکے ہیں پلٹ کر سارے

بے معانی کی صفوں میں ہے گھمسان کا رن
خون میں لتھڑے ہیں الفاظ کے لشکر سارے

یہ خبر کس کو کہ باہر کا ہے موسم کیسا
بند ہیں اپنی ذات کے اندر سارے

میں جو سمٹا، یہ اُجالا بھی سمٹ جائے گا
ہیں مرا عکس، یہ ہنستے ہوئے منظر سارے

ہیں مرے اہلِ ہنر شاخِ برہنہ کی طرح
کب ہوا لے گئی اوراق اڑا کر سارے

سب کے ہاتھوں میں یہاں ایک صحیفہ ہے نیا
اپنی تنسیخ پہ برہم ہیں پیمبر سارے

دانش و فکر کی حد سے پرے ابلاغ تمام
معنی، الفاظ کی دہلیز سے باہر سارے

اس نئی بھیڑ میں دشوار ہے لہجوں کی شناخت
میں کہ تو، ہیں صفتِ قندِ مکرر سارے

کتنے اظہار کے امکاں ہیں فضا کتنے وسیع
پیرہن تنگ رہے اپنے بدن پر سارے

آفریں، با کمال چہروں پر
لکھ گئے دل کا حال چہروں پر

لے گئی چھین کر ہوا سب کچھ
اب کہاں خط و خال چہروں پر

دوسروں پر نہ لادا اپنا بوجھ
خاک سر کی، نہ ڈال چہروں پر

چشمِ بد ہے کڑی کمان کا تیر
وار اس کے سنبھال چہروں پر

دستِ پیکر تراش ہے کتنا
نقش ہیں ماہ و سال چہروں پر

آئینوں سے جواب ان کا مگر
لکھ دے حرفِ سوال چہروں پر

تو کہیں سب سے جدا ہے کہ نہیں
ڈھونڈ اس کی مثال چہروں پر

ہے یہ تیرے مرے وجود کا گھر
کیسی گردِ ملال چہروں پر

اس نگر میں ہیں شب گزیدہ تمام
نور ہے بس خیال، چہروں پر

عمر کے ہاتھ کچھ نہ آئے گا
آہو آنکھوں میں، جال چہروں پر

عکس محفوظ ہیں نہ آئینے
آ گیا کیا زوال چہروں پر

شبِ فرقت کی چاندنی ہوگی
کچھ نئے رنگ اچھال چہروں پر

کون بولے، کہ اب دہن کی جگہ
زخم ہیں بے مثال چہروں پر

غزلیں

محسن جلگانوی

اذیتوں کے کنویں سے نکال دے مولا
کھلی فضا کے سمندر میں ڈال دے مولا

تری زمین کے منظر تجھے مبارک ہوں
مری گپھا کا اندھیرا اُجال دے مولا

ذرا تو دونوں میں اب ربطِ باہمی ٹھہرے
جواب بس میں نہیں تو سوال دے مولا

ہزار چہرے مری شخصیت میں در آئے
مرے وجود سے مجھ کو نکال دے مولا

میں دستِ جبر کو تسخیر بے اماں ٹھہروں
وہ ایک حوصلۂ لازوال دے مولا

نہیں یہ چاہ کہ پیپل کی چھاؤں بنگلے جیوں
مجھے تو اک نئے سورج میں ڈھال دے مولا

ڈاکٹر اختر نظمی

گھر والوں نے پیار جتا کر، غیروں نے مکاری سے
مجھ کو تو ہِل مِل کر لوٹا، سب نے باری باری سے

پہلے پہلے میں سمجھا تھا، بھول ہے آتش بازی کا
آگ کا دریا بہہ نکلا ہے ہلکی سی چنگاری سے

کھیل نظر بندی کا لیکن کام ہے پیارے جوکھم کا
بند کیا تھا کچا دھاگا، نکلا سانپ پٹاری سے

اپنے اپنے کھیل کا ڈھب ہے جیت ہوئی یا ہار ہوئی
لیکن جو میدان میں اُترا، اُترا ہے تیاری سے

چال فریب کی بات نہیں ہے سب پینے ساکار ہوئے
کچھ لوگوں کی ناسمجھی سے، کچھ میری ہشیاری سے

اس کے پلے کچھ تو ہوگا، نظمی جس کے بدلے میں
اک بنجارن سچا موتی لے گئی ''راجکماری'' سے

رؤف خیر

تعارف ہی تو ناممکن ہے میرا
بدن کافر ہے دل مومن ہے میرا

یہ کیسے کوچۂ سربستہ میں ہوں
پلٹ آنا بھی ناممکن ہے میرا

یہ سچ ہے رونقِ بازار مجھ سے
تماشا بھی یہاں لیکن ہے میرا

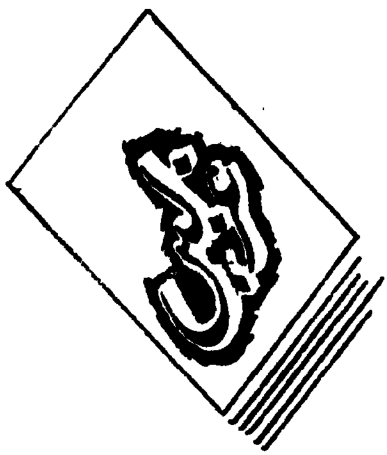
میں اپنے آپ کے ہمراہ تو ہوں
بچھڑ جانا ترا محسن ہے میرا

یہ تیرا درد ہے یا آتشِ نم!
دھواں ہو جانا تجھ بن ہے میرا

اٹھا لو لنگر اپنی کشتیوں کے
ابھی بحرِ سخن ساکن ہے میرا

بظاہر خیر بدحالی پہ مت جا
وہی تو یارِ خوش باطن ہے میرا

نصیر احمد نصیر گلبرگوی



جو کچی ناؤ میں بیٹھا ہوا تھا
وہ ہر لمحے کنارے کانپتا تھا
پرندہ خواہشوں کا اڑ رہا تھا
فلک بھی گرد میں لپٹا ہوا تھا
مرے کمرے میں تنہائی اگانے!
مرے اندر کوئی پیکر چھپا تھا
لگی تھی چوٹ اس کو حادثوں کی
لہو میرے بدن سے بہہ رہا تھا
لب و رخسار کی ٹھنڈی فضائیں
قلم اس دور کا جلنے لگا تھا

ابوالفضل سید محمود قادری

پیت نامہ اور اس کا متن

دکنی زبان اپنے ابتدائی نشو ونما کے دور سے عرصۂ دراز تک صوفیائے کرام کی مرہونِ منت رہی ہے۔ تبلیغ دین مبین کی خاطر ان بزرگان دین نے اردو کو اپنے اور عوام کے درمیان، واسطہ بنائے رکھا۔ دکنی زبان ہی کے ذریعہ انھوں نے اپنے خیالات عوام تک پہنچائے اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رہا۔ ان بزرگوں کے رسائل ہی کے توسط سے مذہب اور متعلقاتِ مذہب، افہام و تفہیم کے انداز میں سادہ، سلیس اور عام بول چال کی زبان میں عوام تک پہنچتے رہے ہیں اور انھوں نے اس کی بڑی قدر و منزلت بھی کی ہے۔ ان رسالوں میں فرائض سنتیں، معتقدات، فقہ، حدیث اور اسلام کے بنیادی اور ضروری مسائل کو پیش کیا جاتا تھا۔ اس طرح کے رسالوں کا سلسلہ حضرت بندہ نواز علیہ الرحمتہ کے دور سے دکنی کے ادبی دور یعنی اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط تک چلتا رہا اور ان سب پر کم و بیش مذہب اور تصوف کی گہری چھاپ رہی ہے۔ ان رسالوں میں بعض ایسے بھی ہیں جن کی مخاطب راست طور پر خواتین تھیں اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان بزرگان دین نے ماں کی گود کو سب سے پہلا مکتب قرار دیا تاکہ ابتدا ہی سے نئی نسل کے کانوں میں مذہب کی باتیں رس گھولتی رہیں۔ لوری نامے ہوں کہ تولد نامے، چکی نامے ہوں کہ خرقہ نامے، محشر نامے ہوں کہ شفاعت نامے، وفات نامے ہوں کہ نجات نامے، ان سب کے پیش نظر موضوعات مذہب اور ان سے متعلقہ تفصیلات تھیں۔ حضرت سید عبدالقادر قادری فی الحال کرنولی کا "پیت نامہ" بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

حضرت فی الحال کرنول کے صاحب طرز شاعر تھے وہ حضرت سید قدرت اللہ قادری المعروف بہ کنگال شاہ کے صاحبزادے، مرید اور جانشین تھے۔ وہ اوائل اٹھارویں صدی کے اکابر صوفیا میں سے تھے۔ ان کے آبا و اجداد بیجاپور کے نواحی موضع کنگال سے اشاعت و تبلیغ کے سلسلے میں کرنول آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ حضرت فی الحال کا انتقال ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۹ء میں کرنول میں ہوا۔ ان کی شخصیت زہد و تقویٰ اور پابندیٔ شریعت و طریقت، اہلِ کرنول کے لیے مشعلِ ہدایت بنی رہی۔

ہمیں ان کے دو مکمل دیوان دستیاب ہوتے ہیں جن میں ایک فارسی ہے اور دوسرا دکنی۔ اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں چکی نامہ یا عروسی نامہ یا شادی نامہ، ارشاد نامہ، مثلث، مخمس، مسدس اور متفرق کلام کے علاوہ پیت نامہ بھی ملتا ہے۔

ان کے دیوان اور دیگر رسائل کے مخطوطات حیدرآباد، میسور اور کرنول کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اب تک "پیت نامہ" کا صرف حوالہ ملتا رہا لیکن اس کا کوئی قلمی نسخہ کہیں نہیں ملتا۔ حضرت فی الحال کی ساری تصانیف ان کے خاندانی کتب خانے میں موجود اور محفوظ ہیں اور اس خاندانی کتب خانے سے پہلی بار یہ "پیت نامہ" تدوینِ متن کے بعد پیش کیا جا رہا ہے یہ مخطوطہ اس خاندان کے ایک ریسرچ اسکالر جناب سید وحید بادشاہ قادری صاحب کوثر کے توسط سے راقم الحروف تک پہنچا ہے یہ "پیت نامہ" نہایت مختصر اور صرف اکیس(۲۱) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا اندازہ او کھلی اور موسل کے دکھنی لوک گیتوں کا ہے اس کی زبان سادہ، عام فہم، اور سلیس ہے۔ اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت، تصورِ شیخ، کلمہ کے صفات مع صفات اور اس کے نفی و اثبات کے ساتھ ساتھ حضور غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت، اور عقیدت کے جذبات کا اظہار ہے اور مقطع میں اپنے والد بزرگوار اور پیرِ طریقت کی توصیف موجود ہے۔ اس "پیت نامہ" کو بعد تدوینِ متن، ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے:

"پیت نامہ"

یہ پیت نامہ سچی صلی اللہ کا
نبی کی انکھیاں سوں دیکھو کُل اللہ کا
نبی نے انکھیاں میں پیا، مرشد کے انکھیاں میں
خبر نیں کسی کو، مگر کوئی لاکھاں میں
نبی کے انکھیاں میں، حق کی انکھ کی صورت
اس صورت کے درمیانے من موہن کی مورت
نکالے گئے چُن کر، فیر خطریاں کے چانول
عرفاں کے موسل سوں چھڑے سہیلیاں اوّل
کلیم خاتو رانی، شمیم تو کی مائی
بغیرہ خانم ہے، خاصی اس کی جائی
علیم صاحب دانے، حیات بانو سوں مل
ارادہ بیگم بھی، قدرت بی سوں، اک دل
سارے سہیلیاں مل کو نوری چاول چھڑیا
کامل ستا صفتاں سوں، ذاتی کلمہ ترِیاں
شاہد اور واحد کی پڑی کرکو کھایاں
نونقطیاں کا صندل اپنے گلے لایاں
جو سٹ گھر کے بھیداں، آپس میں یا بولیاں
کلمہ کے کل سوں، مخفی کا گھر کھولیاں
آپس کو سمجھ کو، حق کے صفتاں سوں مل
مرشد کے کرم سوں پل میں ہوتے واصل
وصل اور فصل میں نقطہ غیر کا سمجھو
سمجھ کو چلے سو گیانی سہیلیاں ہیں او
غوثی پیت نامہ ہے، مثنوتی ناریاں ہو
کلمے کے بھیداں سب، اس میں ہے جو سمجھو
کاگے منڈپ میانے، الا اللہ کا سلطان
محمد رسول سوں، ہوا ہے گل منڈان
کلمہ کے چھپے بھیداں، ہر شئے میانے ظاہر
مرشد کے انکھیاں سوں، دیکھو ہے جے ظاہر
غوث الاعظم کے گھر یہ پیت نامہ ساجے
عرش کے میں اوپر جس کی نوبت باجے

(بقیہ صفحہ ۴۳ پر دیکھیے)

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے ادارہ کا تبصرہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں)

نام کتاب: "رُت سنگھار" شاعر: کالی داس، مترجم: عرفان صدیقی۔

مہاکوی کالی داس کی ایک مشہور سنسکرت نظم "رِتو سمہارم" میں چھے موسموں کا لذت انگیز بیان ہے۔ یہ نظم شرنگار رس کا حسین نمونہ ہے، جو اپنی شوخی و لذت اندوزی کے باعث سنسکرت ادبِ عالیہ میں ایک اہم مقام کی حامل ہے۔ "رِتو سمہارم" کو سنسکرت کے نقادانِ ادب نے نہایت لطیف و پُر تاثیر کارنامہ سے تعبیر کیا ہے۔ ہر چند یہ نظم کالی داس کی ابتدائی تخلیقات میں شمار ہوتی ہے لیکن اپنی ساحری، ندرتِ بیان اور مشاہدے کی گہرائی و گیرائی کے باعث اسے سنسکرت ادب کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔

جناب عرفان صدیقی نے اس لازوال نظم کو "رُت سنگھار" کے زیرِ عنوان اردو کا قالب عطا کیا ہے اور بقولِ شاعر اس نظم کو اردو شعری روپ دیتے ہوئے انھوں نے اصل سنسکرت تخلیق کو پیشِ نظر رکھا اور اس کی شرحوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔

منظوم ترجمے کی تمام تر دشواریوں کے باوصف شاعر نے "رُت سنگھار" میں اصل تخلیق کا حسن برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور یہ صحیح ہے کہ کالی داس کی اصل فکر اور سوچ ترجمے میں ہر آئینہ جھلکتی ہے۔

مختلف موسموں کے پیشِ نظر انسانی احساسات کا یہ دل آویز بیان اردو دنیائے شاعری میں ایک لطیف جمالیاتی تجربہ ہے، جس کی پیش کشی میں عرفان صدیقی کامیاب ہیں۔ تاہم اتنا عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ساری سنسکرت کا اتنی جانکاہی کے ساتھ منظوم ترجمہ کیا گیا، وہاں ذیلی عنوانات کے متعدد ترجمے میں کیا دشواری لاحق ہو سکتی تھی ۔۔۔۔ بہ حالتِ موجودہ سارے ذیلی عنوانات، سنسکرت کی غرابت لیے ہوئے ہیں، جن کا سمجھنا تو در کنار پڑھنا بھی مشکل ہے۔

بعض مقامات پر عرفان صدیقی کا قلم نہایت شوخی کے ساتھ آگے بڑھا ہے، مثلاً ؎

کہ جیسے کوئی مستِ شہوت چھنال
چلے جلدی جلدی برائے وصال

شاید یہ بے تکلفی سنجیدہ طبع پر گراں گزرے

اردو میں پہلی بار "رِتو سمہارم" کا "رُت سنگھار" کے زیرِ عنوان یہ تحفہ عرفان صدیقی کو مبارک باد کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ کتابت طباعت مناسب ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے، لیکن پندرہ روپے قیمت، کتاب کی ضخامت کے پیشِ نظر نامناسب ہے۔ یہ کتاب مکتبۂ دین و ادب، امین الدولہ پارک لکھنؤ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔　(راہی قریشی)

کتاب کا نام: "سورج نما" شاعر: محمد علی تاج بھوپالی۔ قیمت ۱۲/- روپئے، مجلد معہ خوبصورت گرد پوش، وڈیمائی سائز۔ ناشر: مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی بھوپال۔

پھول کیا ہے شبنم کیا، شمع کیا ستارہ کیا
حسن حسن ہے تیرا اس میں استعارہ کیا

یہ موج مئے ڈبو دیتی ہے بے شک
مگر تیری طرح قاتل نہیں ہے

وہ رات جو ان کے ساتھ گئی اس رات کا عالم کیا کہیے
باتیں بھی نہ کیں چپ بھی نہ رہے جاگے بھی نہیں سوئے بھی نہیں

وہ ہاتھ کسی اور کی قسمت میں ہے شاید
آ۔ برگِ حنا تجھ کو ہی آنکھوں سے لگا لیں

میں ہوں گدائے حسن مجھے یوں نہ ٹال دے
اک سکۂ نظر مرے کاسے میں ڈال دے

زروان گھر میں بیٹھ کے ہوتا نہیں کبھی
بدھ کی طرح کوئی مجھے گھر سے نکال دے

تو ہے تو پھر شراب کا مفہوم کچھ نہیں
جو سامنے رکھی ہے وہ شیشے میں ڈال دے

پیچھے بندھے ہیں ہاتھ مگر شرط ہے سفر
کس سے کہیں کہ پاؤں کے کانٹے نکال دے

ان سے میں کیا کہوں مجھے یہ تو بتائے جا
جن دوستوں سے تیرے لیے دشمنی ہوئی

ان اشعار کے پڑھنے کے بعد آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ ان میں سے کئی شعر تو ایسے ہیں جو آپ کہیں پڑھ چکے ہیں یا آپ تک پہنچ چکے ہیں۔۔۔

جی ہاں یہ محمد علی تاج بھوپالی کے اشعار ہیں اور اسی طرح کے بے شمار خوب صورت اشعار کا مجموعہ ہے "سورج نما" جسے مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی نے بڑے ہی اہتمام سے شائع کیا ہے۔ محمد علی تاج یقیناً ایک بہت بڑے شاعر کا نام ہے۔ محض ان کی لاابالی طبیعت نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ وہ جگر کے اس شعر کی تفسیر تھے کہ "سب کو مارا جگر کے شعروں نے اور جگر کو شراب نے مارا" کچھ دن انھوں نے فلمی دنیا میں بھی گزارے اور بعض فلموں کے گیت بھی لکھے۔ اور آخر کار یہ سورج بھی غرقِ شراب ہوا۔

"سورج نما" میں دراصل تاج صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام "خیمۂ گل" بھی شامل ہے۔ اور اس طرح مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی قابلِ مبارکباد ہے کہ اس نے مرحوم کے کلام کو ضائع ہونے سے بچا لیا ورنہ خود تاج مرحوم نے اپنی زندگی میں کبھی اپنے کلام کی ترتیب و تہذیب پر توجہ نہ دی۔ یہ کام ان کے شاگردوں ہی کا حق تھا۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ تاج کی بعض غزلیں اور بعض اشعار شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ ترقی پسندوں میں اگر کوئی شاعر جان نثار اختر کا ہم پلہ ہو سکتا تھا تو وہی تاج تھے۔

تاج بے حد حساس دل کے شاعر کا نام ہے انھوں نے لفظیات میں بھی وہی دلی کیفیات سمودی ہیں، دماغ کو دل پر غالب آنے نہیں دیا۔ نعرہ بازی یا خطیبانہ انداز انھیں چھو نہیں گیا۔ حسرت موہانی کے بعد تاج وہ شاعر ہیں جن کے ہاں سچا اور رقیق

جھلکتا ہے۔ نہ ان کا عشق ہی بازاری ہے اور نہ ہی زبان ـــ اُن کا لہجہ انتہائی باوقار، متوازن اور پُردرد ہے ـــ لینن پر ان کی ایک بے حد خوبصورت نظم بھی اس مجموعے میں شامل ہے ـــ اُردو ادب میں وہ اک بلند مقام کے حامل ہونے کے باوجود انھیں محض اس لیے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے کہ وہ بے سلیقہ زندگی گزارتے رہے ہیں ـــ بہرحال مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی نے تاج کو زندہ رکھنے کا پہلا قدم اٹھایا ہے

(رؤف خیر)

نام کتاب: "گویم مشکل" ۔ (طنز و مزاح) مصنف: ڈاکٹر حبیب ضیاء قیمت: دس روپے، صفحات (۱۷۶) بہ تعاون: ریاستی اُردو اکیڈمی و نظامس اُردو ٹرسٹ حیدرآباد ۔ ملنے کا پتہ: مصنف بتوسط اُردو کالج ۔ اردو ہال، حمایت نگر حیدرآباد ۔

زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر حبیب ضیاء کے پندرہ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ تحریر شخصیت کی عکاسی کرتی ہے۔ نسوانی مزاج عورت ہی کی طرح نازک اور تیکھا ہوتا ہے جو شائستگی کے آداب سے تجاوز نہیں کرتا۔ طنز ـــ ایک پھلجھڑی کہ چھوٹے تو اردگرد ستارے جھلانے لگیں اور بس ـــ مزاح کہ رنگ میں رنگ لے جانے سے تلخیٔ دوراں گوارا ہو جاتی ہے ورنہ زندگی بارِ گراں ہو جائے۔ حبیب ضیا کا تبسم زیرِ لب دل کو گدگدا کر خود بخود پڑھنے والوں کے ہونٹوں پر پھیل جاتا ہے۔ لطیف پیرائے میں انھوں نے "ادب" اور "بے ادبی" کے درمیان کھینچے ہوئے اس "خطِ فاصل" کو سمجھانے کی کوشش کی ہے جو آج ہمارے معاشرے کو تار تار کر رہا ہے۔ "تہذیب" اور "بد تہذیبی" کا درمیانی فاصلہ بڑھتے بڑھتے بے حسی، بے مروتی، بے حیائی، بے اصولی اور غیر انسانی حدوں کو چھو چکا ہے۔ دولت، ہوس، بے ایمانی اور جھوٹی جاہ و حشمت کے دھندلکے میں تہذیب و تمدن کی مشعلیں تھامے خدا جانے ہم کدھر جا رہے ہیں۔ درد کا اظہار کبھی رونے کے علاوہ مسکراہٹ سے بھی کیا جاتا ہے۔ یہی معنی خیز مسکراہٹ مزاح کا لبادہ اوڑھے حبیب ضیا کے مضامین میں جلوہ گر ہے۔ زوال پذیر معاشرے کی تصویر کشی طنز و مزاح کے سہارے ایک کامیاب حربہ ہے۔ کہنے والا مطلب کہہ جاتا ہے اور سننے والے کو "بد مزگی" کا احساس بھی نہیں ہوتا اور ہوتا بھی ہے تو آزردہ نہیں کرتا۔ حبیب ضیا کا قلم سماج کے ناسوروں کو ڈھونڈ کر ان پر تازیانے بھی لگاتا ہے اور دبی زبان سے اسے سنوارنے کے مشورے بھی دیتا ہے۔

المختصر: "گویم مشکل" سمجھنے والوں کے لیے دعوتِ فکر ہے اور نا سمجھوں کے لیے صرف ایک قہقہہ!

(سیّدہ طیبہ بیگم)

اقبال اور نوائے پریشاں صفحہ ۱۵ سے آگے

تیرے نفس سے ہوئی آتشِ گُل تیز تر
مُرغِ چمن! ہے یہی تیری نوا کا صلہ

یہ کہ انھیں اپنی نواؤں کا صلہ ملا اس کا اظہار تعلّی اردو شاعری کی روایتی مقطعے کی شاعرانہ تعلّی ہیں جس سے انھوں نے ہمیشہ گریز کیا، کیے بغیر نہ رہ سکے:

اردو نامہ

وقار خلیل

اردو کی علمی، ادبی، تہذیبی خبریں

یکم اپریل: ڈاکٹر سیتھو راؤ بگڑی سابق سکریٹری مہاراشٹرا گورنمنٹ نے ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ۱۸ ویں صدی کی دکنی تہذیب میں فارسی اور دکنی زبانوں کے کردار پر لکچر دیا۔ ڈاکٹر میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی نے صدارت کی۔

۲ اپریل: رجسٹرار آف نیوز پیپرس حکومت ہند کی رپورٹ کے مطابق ملک بھر میں سب سے زیادہ اردو اخبارات و جرائد حیدرآباد سے شائع ہوتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کی رپورٹ کے بہ موجب آندھرا پردیش سے ۲۴۳ اخبارات اردو میں شائع ہوئے اور شہر حیدرآباد سے ۲۰۵ اخبارات کی اشاعت ہوتی ہے

● لسانی ہم آہنگی کے فروغ کے لیے ایک نئی ادبی تنظیم "ہندی اردو سنگم" کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر مسٹر جلیل پاشاہ اور مسٹر کنول پرشاد کنول سکریٹری منتخب ہوئے۔

۴ اپریل: ادارۂ قومی ادب کے جلسۂ تہنیت سے خطاب کرتے ہوئے مسٹر یدھ ویر ایڈیٹر روزنامہ ملاپ و صدر نشین مجلس عاملہ ریاستی اردو اکیڈیمی نے کہا کہ اردو کو اقلیت کی زبان کے نام پر محدود کر دینا ایک المیہ ہوگا موصوف نے حکومت پر زور دیا کہ وہ تلگو کی ترویج میں جبر سے کام نہ لے۔ مسٹر آصف پاشاہ صدر ریاستی اقلیتی کمیشن، ڈاکٹر اختر احمد اور اعجاز قریشی ایڈیٹر بھارت نیور نے بھی خطاب کیا۔

۵ اپریل: نوجوان اور منتخب طنز شاعر جناب رؤف خیر کا دوسرا شعری مجموعہ "ایلاف" ریاستی اردو اکیڈیمی کی اعانت سے شائع ہوا۔

۶ اپریل: اترپردیش اردو اکیڈیمی کے ادبی انعامات حاصل کرنے والوں میں حیدرآباد کے شاذ تمکنت (ورق انتخاب) ڈاکٹر وحید اختر (زنجیر کا نغمہ) مجتبیٰ حسین (آدمی نامہ) ریاست علی تاج (نجیب اشرف ندوی: شخصیت اور کارنامے) ڈاکٹر طیب ضیا (گوئم مشکل) اور ڈاکٹر افضل الدین اقبال (جنوبی ہند کی اردو صحافت) شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ادبی کتابوں کی مثالی اشاعت پر "حسامی بک ڈپو" کو بھی انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ ادارۂ سب رس مصنفوں اور ناشر کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

● فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنو کی اطلاع کے مطابق حیدرآباد کے تین ادیبوں ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ (حیات عزیز مرزا) ڈاکٹر ریس سجے صادق (اردو ادب میں طنز و مزاح) اور صفیہ اریب (یاد اریب) کو ان کے مسودات کی اشاعت کے لیے جزوی رقمی اعانت منظور کی گئی۔

۹ اپریل: گولڈن جوبلی تقاریب ادارۂ ادبیات اردو کے سلسلے میں بین ریاستی یادگار مشاعرہ ایوان اردو میں بہ صدارت جناب سید رحمت علی رکن پارلیمان منعقد ہوا۔ میر مشاعرہ نے اس موقع پر ادارہ کی گراں قدر ادبی تحقیقی اور علمی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے بانی ادارہ ڈاکٹر زور مرحوم کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا اور کہا کہ آزادی کے بعد سے

دانستہ طور پر ملک گیر اساس پر اردو کو نظر انداز کئے جانے کا مذموم عمل جاری ہے موصوف نے مرکزی حکومت سے اپیل کی کہ وہ گجرال کمیٹی کی سفارشات کو جلد روبہ عمل لاکر جنوب کے اس بڑے ادبی مرکز ادارۂ ادبیاتِ اردو کو ریسرچ سنٹر کی حیثیت میں کارکرد بنائے۔ اس مشاعرہ میں بنگلور کے ڈاکٹر مدنا منظر، گلبرگہ کے محمد عبدالرحیم آرزو اور حیدرآباد کے شعرا شاذ تمکنت، اوج یعقوبی، علی احمد جلیلی، سعید شہیدی، خواجہ شوق، خیرات ندیم، راشد آذر، ڈاکٹر غیاث صدیقی، وقار خلیل (معتمد مشاعرہ) محمد منظور احمد، صلاح الدین نیر، منوہر لال بہار، رئیس اختر، علی الدین نوید، رحمٰن جامی، فیض الحسن خیال، بشیر وارثی، صادق نقوی، بانو طاہرہ سعید، صاحب حیدرآبادی، برقی یوسفی اور راجہ لال راجہ نے کلام سنایا۔

۱۰ راپریل: گولڈن جوبلی تقاریب ادارۂ ادبیات اردو کے سلسلے میں ایک دو روزہ سمینار پروفیسر گیان چند جین صدر اردو سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد ... ۱۰ ... سری رام شرما، ڈاکٹر حبیب ضیا، حسن الدین اور سیدہ طیبہ بیگم نے علی الترتیب دکنی ادب، دکنی قواعد، عہدِ آصفی میں اردو، خواتین دکن کی علمی خدمات پر مبسوط مقالات سنائے مباحثہ میں ڈاکٹر حسینی شاہد، پروفیسر سید سراج الدین، مصطفیٰ شروانی، سرینواس لاہوٹی اور حبیب اللہ صدیقی نے حصہ لیا۔ ابتدا جناب سید ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) معتمد اعزازی ادارہ و گولڈن جوبلی تقاریب کمیٹی نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ جناب محمد منظور احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

● محفل خواتین کا ماہانہ ادبی و شعری اجلاس محترمہ عظمت عبدالقیوم کی صدارت میں آراستہ ہوا۔ محترمہ فاطمہ عالم علی نے اپنے والد ممتاز ادیب اور صحافی قاضی محمد عبدالغفار پر تاثراتی مضمون سنایا۔ مظفر النساء ناز، حفیظ النساء حزیں اور عظمت نے کلام پیش کیا۔

۱۱ راپریل: ایوانِ اردو میں گولڈن جوبلی تقاریب ادارۂ ادبیات اردو کے سمینار کی دوسری نشست پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی سابق ریڈر جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ دکنی ادب میں تحقیق کے مسائل پر ڈاکٹر ثمیرہ جلیلی کا مقالہ میر احمد علی نے سنایا۔ ڈاکٹر رحیم الدین کمال نے اردو تہذیب کے مختلف ادوار پر مبسوط مقالہ پڑھا۔ جناب صادق نقوی لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ نے دکنی ادب اور تہذیبی اقدار پر مضمون سنایا۔ اس موقع پر ڈاکٹر زور کی تصنیف "دکنی ادب کی تاریخ" کی رسم اجراء صدرِ جلسہ کے ہاتھوں انجام پائی۔ ڈاکٹر یوسف سرمست نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور شکریہ ادا کیا۔

۱۴ راپریل: آصفیہ ہائی اسکول کا جلسہ سالانہ مسٹر سرینواس لاہوٹی معتمد تنظیم ریاستی انجمن ترقی اردو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر منوہر راج سکسینہ صدر شہری انجمن نے بحیثیت مہمانِ خصوصی خطاب کیا اور اساتذہ و طلبا کو مشورہ دیا کہ وہ اردو کی بقا اور ترقی کی لڑائی میں اپنا حصہ ادا کریں۔ مسٹر محمد عبدالخالق صدر مدرسہ اور مسٹر شیو نرم اردو مظفر الدین محمود نے بھی مخاطب کیا۔

۱۶ راپریل: جناب ابو محمود فکری سابق انسپکٹر آف اسکولس کا بعارضہ قلب انتقال ہوا۔ موصوف کا شمار حیدرآباد کے صاحبِ طرز اور باشعور نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔

۱۷ راپریل: ادارۂ ادب

(جماعت اسلامی) کے ادبی و شعری ماہانہ اجلاس میں خواجہ معین الدین اور عبدالقیوم عزم نے مضامین سنائے محفلِ شعر میں جس کی صدارت سعید شہیدی نے کی۔ سیف حموی، صادق نقوی، بشیر وارثی، داؤد نصیب، مسعود جاوید ہاشمی، وحید الحسن ہاشمی تائب، دلاور حزیں، غلام جیلانی صادق اور قمر رضا نے کلام سنایا۔

۱۸ اپریل: شعبۂ ادب و ثقافت ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈمی کی طرف سے "فکشن" پر ایک خوشگوار محفل جناب اختر حسن مددگار معتمد ریاستی اردو اکیڈیمی کی صدارت میں منعقد ہوئی، ڈاکٹر یوسف سرمست نے فنِ افسانہ پر مقالہ پڑھا۔ محترمہ جیلانی بانو، جناب نعیم زبیری اور محترمہ سیدہ طیبہ بیگم نے کہانیاں سنائیں جناب محمد منظور احمد معتمد شعبہ نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

● ریاستی انجمن ترقی اردو کی طرف سے اردو ہال میں حضرات جوش و فراق کی یاد میں ادبی جلسہ جناب فضل الرحمن سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر مجاور حسین رضوی اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب نے جوش و فراق کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ حضرت احسان دانش کی رحلت پر انھیں بھی ادبی خراج ادا کیا گیا۔

۱۹ اپریل: ریاستی اردو اکیڈیمی کے صدر مولانا حافظ ابویوسف نے چیف منسٹر مسٹر بھاونم وینکٹ رام کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا کہ وہ اردو زبان سیکھ رہے ہیں، حافظ صاحب نے بتایا کہ ایسے وقت جب کہ ملک کے بعض حصوں میں تنگ نظری، تعصب، لسانی عصبیت اور تشدد کی لہر چل رہی ہے مسٹر وینکٹ رام کا یہ جذبہ لائق تقلید اور قابل ستائش ہے۔

۲۴ اپریل: اقبال اکیڈیمی کا ماہانہ علمی اجلاس پروفیسر عالم خوندمیری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروفیسر سید سراج الدین، ڈاکٹر مجاور حسین رضوی، جناب مضطر مجاز اور جناب محمد ظہیر الدین احمد نے اقبالیات کے مختلف گوشوں پر محیط مقالے سنائے۔ جناب خواجہ ناصر الدین نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۲۵ اپریل: اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر غلام عمر خاں صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں بہ مقام اردو ہال منعقد ہوا۔ جناب راشد آذر نے "مشاعرے۔ ماضی، حال اور مستقبل" کے موضوع پر مضمون اور محترمہ لئیق صلاح لکچرار بی بی رضا ڈگری کالج گلبرگہ نے "محبوب نواز ونت باقی: شاعر اور شخص" کے زیرِ عنوان مقالہ سنایا۔ محفلِ شعر میں ملک الشعرا اوج یعقوبی، علی احمد جلیلی، صلاح الدین نیر، راشد آذر، رحمٰن جامی، محمد منظور احمد، بانو طاہرہ سعید، رؤف خیر، علیم پرواز اور دیگر شاعروں نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد اردو مجلس نے شکریہ ادا کیا۔

● نوتشکیل شدہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی مجلس عاملہ کے صدر مسٹر یدھ ویر ایڈیٹر روزنامہ ملاپ نے اکیڈیمی کے ایک اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اکیڈیمی تعمیری کاموں کو جاری رکھتے ہوئے اپنی خدمات انجام دیگی مولانا حافظ ابویوسف صدر اکیڈیمی نے صدارت کی۔ مسٹر عبد سروا ستو ڈائرکٹر و سکریٹری اکیڈیمی اور اکیڈیمی کے دیگر عہدیداروں ڈاکٹر محمد عبدالرزاق اور جناب اختر حسن کے علاوہ رکن عاملہ

اکیڈیمی جناب اعجاز قریشی (بھارت نیوز) نے مسٹر پیڈرو ویرکی صحافتی خدمات اور اردو دوستی کو خراج تحسین ادا کیا۔

۲۲ اپریل: جامعہ عثمانیہ نے مسٹر پی اے رشید ارشد کو ان کے مقالہ "دبستان دہلی کی شاعری میں قنوطیت" کی تکمیل پر ماسٹر آف فلاسفی (ایم فل) کا مستحق قرار دیا۔ موصوف نے یہ مقالہ ڈاکٹر یوسف سرمست ریڈر شعبۂ اردو کی نگرانی میں قلم بند کیا تھا۔

۲۹ اپریل: نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری کے اسٹڈی سرکل حلقۂ ارباب ذوق کے اجلاس میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت ریڈر شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد نے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی کتاب "چشتی تعلیمات اور عصر حاضر میں ان کی معنویت" پر اپنا تبصرہ پیش کیا۔ جناب اصغر اشرف نے صدارت کی۔ محمد منظور احمد صاحب معتمد سرکل نے خیر مقدم اور جلسہ کی کاروائی چلائی۔

● کرناٹک اردو اکیڈیمی (بنگلور) نے وقار خلیل کے والد حضرت نامی کو وہ سوار نظامی شاہ پوری کے مجموعۂ کلام "سخن نامی" کی اشاعت کے لیے گرانٹ منظور کی یہ مجموعہ توقع ہے ستمبر کے وسط تک منظر عام پر آجائے گا۔

مئی ۱۹۸۲ء

یکم مئی: "دبستان جلیل" کا سالانہ مشاعرہ اور ادبی اجلاس جلیل منزل میں بصدارت جناب حسن الدین احمد ڈائرکٹر ولا اکیڈیمی منعقد ہوا۔ حافظ جلیل حسن مانک پوری (فصاحت جنگ جلیل) کی اطہر شخصیت اور شاعرانہ عظمت کو ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب اور ڈاکٹر یوسف سرمست نے خراج ادا کیا۔ محفل شعر میں مجیب خیرآبادی (پاکستان) سعید شہیدی، علی احمد جلیلی، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، داؤد نصیب، بشیر وارثی، سیف حموی، محمد منظور احمد، امیر احمد خسرو، سعد حسن سعد، راشد آذر، رحمن جامی صادق نقوی، عزیز احمد جلیلی، دلاور حزیں اور علی رفیع نے کلام سنایا۔

۲ مئی: ساہتیہ انڈیا اردو اکیڈیمی کے شعبہ ادب کی جانب سے منعقدہ ادبی محفل میں جناب حسن الدین احمد، ڈاکٹر صفدر علی بیگ، محترمہ آمنہ انصاری، جناب رشید الدین اور یوسف اعظمی صاحبان نے اپنی ادبی تخلیقات پیش کیں۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی اور معتمد شعبہ ادب جناب محمد منظور احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۴ مئی: اردو ریسرچ اسوسی ایشن عثمانیہ یونیورسٹی کی ادبی محفل میں ڈاکٹر رضی الدین احمد صدر شعبہ اردو ایس وی یونیورسٹی تروپتی نے "ابوالکلام آزاد اور ادب میں انانیت" کے زیر عنوان لکچر دیا۔ پروفیسر غلام عمر خاں نے صدارت کی، شعری محفل میں شاذ تمکنت، سعید شہیدی، مجیب خیرآبادی، علی احمد جلیلی، ڈاکٹر صفدر، محمد منظور احمد نے کلام سنایا۔ ڈاکٹر یوسف سرمست نے شکریہ ادا کیا۔

● مغربی بنگال اردو اکیڈیمی نے ۱۹۸۱ء کے ادبی انعامات میں حیدرآباد کے مصنفوں شاذ تمکنت، ریاست علی تاج، مضطر مجاز کی کتابوں کو ادبی ایوارڈ سے نوازا۔

۹ مئی: پروفیسر حبیب الرحمن صدر پاکستانی انجمن ترقی اردو نے پریس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ

ریاستی انجمن سارے ملک کے لیے سہ لسانی فارمولہ کی حامی ہے اور چار لسانی فارمولے کی نفی کرتی ہے موصوف نے اس امر کی وضاحت کی کہ انجمن نے ہمیشہ یہ چاہا کہ ریاست کے اردو بولنے والے عوام کی اوّل زبان اردو ہونی چاہیے اور تلگو دوسری اور تیسری زبان کے طور پر ہندی یا انگریزی اختیار کی جا سکتی ہے جس کا انحصار اس نصاب پر ہے گا جسے طالبِ علم نے اپنے لیے منتخب کیا ہے

۷ر مئی: جناب جلیل پاشاہ صدر نشین کل ہند تعلیمی کمیٹی نے ریاستی چیف منسٹر کو ایک یادداشت پیش کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ اردو اساتذہ کے وظیفہ پر سبکدوشی کے بعد مخلوعہ جائدادوں پر عجلت نئے تقررات کرکے اردو ذریعہ تعلیم کے طلباء کو حصول تعلیم میں سہولت فراہم کریں۔

۸ر مئی: مسٹر جیندر سرنیواستیو ڈائرکٹر و سکریٹری اردو اکیڈیمی نے رویندرا بھارتی میں جناب مسعود جاوید کے ڈراموں کی کتاب "یہ کیسا سلوک ہے" کی رسم اجرا انجام دی۔ آخر میں یہ ڈرامہ اسٹیج ہوا۔

● ادبی ٹرسٹ، ۱۰ویں کل ہند مشاعرہ کا مرکزی وزیر پٹرولیم مسٹر شیو شنکر نے افتتاح کیا۔ سردار شمشیر سنگھ جنرل منیجر ایسٹرن ریلوے نے صدارت کی۔ ابتداً جناب سید مکشر شاہ صدر ریاستی مجلس قانون ساز کونسل اور پھر جناب منوہر راج سکسینہ صدر شہری انجمن ترقی اردو نے خطاب کیا۔ اور ادبی ٹرسٹ کی خدمات اور اردو گھر کے لیے اس مشاعرہ کی آمدنی وقف کیے جانے پر بانی ٹرسٹ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست کو زبردست خراج تحسین ادا کیا۔ مسٹر بھاونم وینکٹ رام چیف منسٹر نے اس مقصدی مشاعرہ کی کامیابی کے لیے پیام روانہ کیا تھا جناب شاہ عالم خاں نے سادنیر ریلیز کرنے کی رسم انجام دی۔ سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، بشیر بدر، عجیب خیرآبادی، بیگم ممتاز مرزا، بیکل اتساہی، نسیم شاہجہاں پوری، یکتا شبنم، ساغر نظامی اور ملک زادہ منظور احمد (معتمد مشاعرہ) کے علاوہ مہمان شعراء نے کلام سنایا۔

● ادبی سنگم کی سالانہ شعری و ادبی محفل ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب کی صدارت میں بہ مقام "مخفی منزل" منعقد ہوئی۔ صدر جلسہ نے انگلستان میں اردو کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی نے ادبی سنگم کی رپورٹ سنائی۔ قدیم و جدید مکاتیب سخن کے شعراء نے کلام سنایا۔ جناب محمد منظور احمد نے شکریہ ادا کیا۔

۹ر مئی: شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی طرف سے جناب مجروح سلطان پوری کا خیر مقدم کیا گیا۔ پروفیسر گیان چند جین نے صدارت کی۔ ڈاکٹر مجاور حسین رضوی نے مجروح کی شخصیت اور شاعری پر اظہار خیال کیا۔ مہمان شاعر نے اردو غزل پر لکچر دیا اور اپنے کلام سے نوازا۔

● جواں سال ادیبہ محترمہ ناز صدیقی بیگم ڈاکٹر مغنی تبسم کچھ عرصہ علالت کے بعد ایک نرسنگ ہوم میں اچانک انتقال کر گئیں حق مغفرت کرے بڑی باصلاحیت فنکار اور کئی کتابوں کی مصنفہ و مترجم تھیں۔

۱۵ر مئی: حلقۂ ارباب ذوق (نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری) کا ادبی اجلاس ڈاکٹر انور معظم صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر عابد حسین کی کتاب "عالم اسلام

میں تجدید کی تحریکیں" پر ڈاکٹر مجاور حسین رضوی نے سیر حاصل تبصرہ سنایا۔

۱۶ رمئی: جناب اکرام جاوید کی کہانیوں کا مجموعہ "خاک گزیدہ" ریاستی اردو اکیڈیمی کی اعانت سے شائع ہوا۔

۱۹ رمئی: مسلم ڈیموکریٹک فرنٹ کے وفد نے چیف منسٹر کو ایک یادداشت پیش کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ اردو زبان کو روزگار سے مربوط کیا جائے۔

۳۰ رمئی: اقلیتی اردو کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے مسٹر بھاؤنم وینکٹ رام چیف منسٹر نے کہا کہ حکومت اردو کے تعلیمی مسائل سے انصاف کرے گی اور اردو بولنے والی ۱۵ فی صد آبادی کے لیے سرکاری احکامات کا اردو ترجمہ فراہم کرے گی اس موقع پر ریاست میں اردو کے مسائل پر مسرز محمود انصاری ایڈیٹر روزنامہ منصف، سہیل اسلم لاہوتی (انجمن)، ایم اے عزیز ریاستی وزیر جنگلات، موہن سنگھ سلوپیہ، غلام یزدانی اور اضلاع کے مندوبین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مسٹر جلیل پاشاہ نے کانفرنس کی صدارت کی۔

۲۵ رمئی: حلقۂ ارباب ذوق کے اجلاس نقد و نظر میں ڈاکٹر یوسف سرمست نے ڈاکٹر شمیم نکہت کی کتاب "مطالعات" پر تبصرہ سنایا۔ جناب حسن الدین احمد نے صدارت کی۔ محفل شعر میں ڈاکٹر غیاث صدیقی، ڈاکٹر رشید الحسن، عزیز احمد جلیلی اور معتمد حلقہ جناب محمد منظور احمد نے کلام سنایا۔

۲۹ رمئی: ممتاز اسکالر، مفکر اسلام اور عالم دین پروفیسر عبدالوہاب بخاری سابق پرنسپل پریسیڈنسی کالج مدراس کا حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ حق مغفرت کرے۔

۳۰ رمئی: اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر غلام عمر خاں کی صدارت میں ہوا۔ جناب عابد صدیقی مددگار انفارمیشن آفیسر اور جناب طیب انصاری نے علی الترتیب "اردو پیروڈی کا فنی ارتقا" اور "نئی نسل کی غزل" پر مقالے سنائے۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد اردو مجلس نے نظامت کی۔

اردو لکھیے، اردو لکھیے اور اردو کے لیے کام کیجیے

JULY / AUGUST 1982. R. N, 10922/57.
Regd. H/HD. 134.

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. P.)



بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

فون نمبر ۳۸۴۲۶۹

ماہنامہ سب رس

مدیرِ اعزازی :	ڈاکٹر مغنی تبسم
معاون مدیر :	وقار خلیل

جلد (۴۳) ستمبر، اکتوبر سنہ ۱۹۸۲ء شمارہ (۹، ۱۰) ....

قیمت فی پرچہ .. ۲ روپے

ادارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵

زرِ سالانہ — بیرونی ملکوں سے

	ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
۲۰ روپے		
کتب خانوں سے ۲۵ روپے	مشرق وسطیٰ ۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
بذریعہ رجسٹری ۲۸ روپے	امریکہ ۱۶ ڈالر	۶ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون	۸ ڈالر	۳½ ڈالر
انگلستان	۷ پونڈ	۳ پونڈ

مطبوعہ : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان، حیدرآباد

ترتیب

OOO

باتیں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بانیٔ ادارۂ ادبیات اردو کی یاد ہم ہر سال مناتے ہیں لیکن ادارے کی گولڈن جوبلی تقاریب کے ساتھ ان کی یاد ہم سے ہماری ذمہ داریوں اور فرائض کا حساب مانگتی ہے۔ ہماری کوتاہیوں اور غفلتوں کو دیکھ کر ہم سے روٹھتی اور خفا ہوتی ہے۔ ہماری مجبوریوں کو محسوس کر کے ہمیں معاف کرتی ہے۔ اور ہم کو نئے عہد و پیمان باندھنے پر مائل کرتی ہے۔

آج ہم گولڈن جوبلی تقاریب ایک رسم کے طور پر منا رہے ہیں۔ ڈاکٹر زور حیات ہوتے تو ان تقاریب کی نوعیت کچھ اور ہوتی۔ ان کا مفہوم جدا ہوتا۔ یہ تقاریب ہمارے لیے ایک نئے سفر کا نقطۂ آغاز بنتیں۔

ڈاکٹر زور ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کی روح ہم کو جھنجھوڑ رہی ہے۔

ہم روح زور سے معذرت خواہ ہیں۔ اپنے محدود وسائل، کوتاہیٔ عمل اور اردو والوں کی عام بے حسی کی وجہ سے کوئی بڑا پیمان تو نہیں باندھ سکتے لیکن یہ وعدہ ضرور کرتے ہیں کہ علم و ادب کی جو شمع انھوں نے روشن کی تھی انشاء اللہ اسے بجھنے نہیں دیں گے۔

مغنی تبسم

عالم خوندمیری

ترقی پسند تحریک کا پس منظر

ترقی پسند تحریک اُردو ادب کی عصری تاریخ کا ایک اہم باب ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ علی گڑھ سے اُبھرنے والی عقلیت کی تحریک کے بعد جس تحریک نے اُردو ادب کے روایتی سانچوں اور مروج مسلمات کے بارے میں ایک طاقتور شک پیدا کیا وہ بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں اُبھرنے والی ترقی پسند تحریک ہی تھی۔ جس طرح سرسید کی علی گڑھ تحریک کے محرکات اور موضوعاتِ ادب سے، جہاں تک ادب کا ایک محدود تصور ہے، غیر متعلق تھے اسی طرح ترقی پسند ادب کے بعض محرکات وسیع تر مفہوم میں سماجی اور سیاسی تھے جن کا تعلق انسانی شعور اور اس کے مظاہر سے تھا۔

. . . .

. . . .

. . . . اگر ہم اس مفروضے کو مان کر چلتے ہیں کہ ادب وسیع تر مفہوم میں انسانی شعور سے اُبھرتا ہے اور پھر انسانی شعور کو متاثر کرتا اور بعض صورتوں میں بدلتا بھی ہے تو ہر وہ تحریک جس کا ربط انسانی شعور سے ہو اپنے وسیع مفہوم میں ادبی نوعیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں انسانی شعور سے مراد صرف اجتماعی یا انفرادی شعور نہیں ہے بلکہ وہ کُلی شعور ہے جو ان دونوں پر محیط ہوتا ہے۔ ذات انسانی روابط سے منقطع ایک مجرد وجود نہیں رکھتی بلکہ ہر لمحہ ذات سے غیر ذات تک اور انفرادی شخصیت سے اجتماعی موجود تک سفر کرتی رہتی ہے۔ اس سفر میں وہ تناؤ پیدا ہوتا ہے جو ادب اور فن کا تخلیقی محرک ہوتا ہے۔ ذات کو ہم مجرد کر لیں تو ذات اس تناؤ سے محروم ہو جاتی ہے، اس سے وابستگی ربط تجرد کے دو طریقے ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ ذات کے وجود اور شعور کے اجتماعی یا باہم موضعی سرچشموں کو نظر انداز کر جائیں یا پھر ان اجتماعی رشتوں پر اتنا زور دیں اور انھیں مرکزی نوعیت عطا کر دیں کہ ذات کا خالص وجودی پہلو نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ اُردو کا ادب عالیہ مجموعی طور پر ذات کی اوّل الذکر تجرید کی طرف مائل تھا اور اس لیے علی گڑھ تحریک سے پہلے کے ادب میں وجودی ذات گہرے مناظر کی تصویر پیش کرتی ہے۔ علی گڑھ تحریک نے اس امر پر اصرار کیا کہ ذات نہ صرف اپنے فرد کی اندرونی سرچشموں سے سروکار رکھے بلکہ اپنے اجتماعی ماضی کا شعور بھی حاصل کرے اور مستقبل کے بارے میں نفسی تعلق خاطر کا انداز بھی پیدا کرے۔ تحریک کے زیر اثر ایک طرف

اردو نظم نے اردو ادب میں اپنا ایک مستقل مقام پیدا کرلیا تو دوسری طرف نثر اور ناول سے نہ صرف روشناس ہوئی بلکہ بیسویں صدی میں ان اصناف نے اردو ادب میں اہم جگہ حاصل کرلی۔ یہاں اس امر کی جانب اشارہ ضروری ہے کہ کسی بھی زبان کی وسعت کا اندازہ اس کی نثر اور نثر کے اصناف سے ہوتا ہے۔ علی گڑھ تحریک کا یہ سب سے اہم کارنامہ تھا۔

۱۹۳۰ء کے اطراف جہاں اردو شاعری پر اقبال کی حکمرانی تھی وہیں اردو افسانے اور ناول پر پریم چند چھائے ہوئے تھے۔ اقبال کی شاعری اور پریم چند کے افسانے اور ناول ترقی پسند تحریک کا ادبی پس منظر ہیں۔ یہ ادعا بہ ظاہر عجیب سا لگتا ہے لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ کسی بھی ادبی تحریک یا وسیع تر مفہوم میں کسی بھی ادبی دور کا اولیں اور معنی خیز پس منظر اس عصر کا اہم ادبی واقعہ ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ادب اور فن کا اولین ماحول خود ادب اور فن کے انقلابی کارنامے ہوتے ہیں۔

اقبال نے اپنی شاعری میں اور پریم چند نے اپنے فکشن میں انسانی ذات کو دو اہم امور سے آگاہ کیا ایک ذات کی تاریخیت اور دوسرے انسانی ذات کا دوسرے انسانوں سے ربط اور ٹکراؤ۔ یہ دو امور انسانی ذات کے وجود کے اہم عناصر ہیں یہی عناصر فرد کے رول کو بھی متعین کرتے ہیں اور بالآخر ایک خاص عصر یا دور میں اس کی تقدیر کا تعین کرتے ہیں۔

اردو میں ترقی پسند تحریک نے اقبال اور پریم چند کی اس روایت کو آگے بڑھایا اور انھیں ادب کے مفہوم میں مرکزی اہمیت عطا کی۔ اقبال نے اپنی شاعری میں جہاں خودی کا تصور پیش کیا وہیں خودی اور غیر خودی کے ٹکراؤ پر بھی زور دیا۔ اس ٹکراؤ میں انسان خود آگاہی حاصل کرتا ہے۔ یہ ٹکراؤ جہاں وجودی ہے وہیں طبقاتی بھی ہے۔ پریم چند کے آخری دور کی کہانیوں اور اُن کے آخری دور کے دو ناول میدانِ عمل اور گئودان میں یہ دونوں ٹکراؤ کرداروں کو گہرائی اور ایک نئی قسم کی واقعیت عطا کرتے ہیں۔ اس ٹکراؤ سے ان کی قسمت یا تقدیر کا رخ متعین ہوتا ہے اور اس سے ان کے عمل میں انفرادیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف اپنی کھلی تاریخ کو اپنی ذات میں موجود پاتے ہیں بلکہ اس تاریخیت کو اپنے عصر سے مربوط بھی کرتے ہیں۔ شاعر اقبال اور فکشن نگار پریم چند دونوں اپنے آخری دور میں طبقاتی ٹکراؤ سے شدید آگاہی حاصل کرتے ہیں اور اس لیے ان میں ایک انقلابیت کا رجحان پیدا ہوجاتا ہے۔ یہی انقلابیت، ترقی پسند تحریک کا سرچشمہ ہے اور اسی لیے یہ کہنا حق بجانب ہے کہ اس تحریک نے ہندوستان کی عصری تاریخ سے نہ صرف فیض حاصل کیا بلکہ اسی تاریخ کے بطن سے پیدا ہوئی یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں سیاسی اور سماجی سطح پر عالم آگاہی کا رجحان بکھر رہا تھا اسی عالم آگاہی کا بنیادی اصول دنیا کے مظلوم اور کچلے ہوئے انسانوں سے یگانگت اور رفاقت کا جذبہ تھا یہ ایک مجرد آگاہی نہیں تھی بلکہ اس کی ایک ٹھوس بنیاد تھی۔ جہاں ایشیا اور افریقہ میں آزادی کی تحریک شباب پر تھی وہیں مغرب کا استحصال معاشی سیاسی

نظام میں بدترین جبر کا روپ اختیار کر رہا تھا جس کو ہم فاشزم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسپین کی خانہ جنگی ابی سینا پر اٹلی کا حملہ اور چین پر جاپان کی دست درازی میں ایک باہمی ربط تھا۔ اقبال اور ٹیگور اس ربط سے آگاہ تھے۔ اسی لیے جہاں اقبال نے کہا تھا: "ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش" وہیں ٹیگور نے دردناک لہجے میں کہا کہ "مجھے ہمالہ کے اس پار انسانی سروں کے ٹوٹنے کی آواز آرہی ہے۔" ترقی پسند تحریک نے اس عالمی شعور سے اپنا رابطہ استوار کیا۔ اسی دور میں سیاسی سطح پر جواہر لال نہرو نے قومی تحریک کو ایک بین الاقوامی رنگ دیا تھا اور ان کے چین اور اسپین کے سفر نے ہندوستان کو مخالف سامراج تحریک کا ایک اہم مرکز بنا دیا تھا۔ ان تاریخ ساز حالات سے دنیا بھر کے ادیب متاثر ہو رہے تھے اور یہ بات اچنبھے کی نہیں کہ یہاں کے دردمند اور باشعور ادیب بھی اس عالم آگاہی کے حصے دار بن گئے۔ اس تحریک کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس نے ادب کا رشتہ انسانوں کی تلاش سے جوڑا۔ انیسویں صدی ہی میں یورپ کے حساس ادیب ان محرکات کے علم دار بن چکے تھے۔ گوئٹے، ہائنے اور نیطشے کے خواب وہی تھے اور ان کی تخلیقات اسی آرزو کا مظہر تھیں۔ ہر انقلابی دور بہتر اور برتر انسان کی تلاش کا دور ہوتا ہے۔ رومی نے بھی بارھویں صدی میں پرجوش انداز سے کہا تھا۔

زیں ہم رہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

اسی طرح ہر انقلابی دور میں انسان اپنی ذات سے باہر دیکھتا ہے اور اپنی ذات کو نوعِ انسانی سے مربوط اور منسلک کرنے کی پیہم کوشش کرتا ہے۔ اس امر میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ بیسویں صدی کا تیسرا دہا عصری تاریخ کا تخلیقی انقلابی دور تھا اسی دہے میں انسانی آزادی کا جذبہ اپنے عروج پر پہنچا اور اسی دور میں "عروجِ آدم خاکی" کا اقبالی استعارہ ایک حقیقت بن رہا تھا۔ انسانی وجود کے نئے اسرار منکشف ہو رہے تھے اور اب انسانی ضمیر کسی قسم کے استحصال کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ آزادیِ نسواں کی تحریک انسانی ضمیر کے اس ردِ عمل کا ایک اظہار تھی۔ اور اس دور کے انقلابی مزاج نے اس تحریک کو ایک فوری انقلابی انداز عطا کر دیا تھا۔ اسی طرح جہاں افلاس اور ناداری کے خلاف پریم چند کے احتجاج میں اصلاحی انداز تھا۔ ترقی پسند تحریک نے اس احتجاج کو ایک فوری انقلابی سمت عطا کی۔ اس لیے اشتراکیت قومی ترقی پسند تحریک میں جذبہ یا (PASSION) کی نوعیت رکھتی تھی۔ ایک سوچے سمجھے نظریے کی نہیں۔ اس کا انداز ایک آرزو کا سا تھا۔ عملی اقدام کا نہیں۔ مارکس کا اثر اس حد تک تھا۔ جہاں تک اشتراکی جذبے کے ایک تاریخ ساز علم بردار کا ہو سکتا ہے۔ مارکس، عصری تاریخ کا ایک اہم جذبہ یا (PASSION) بھی ہے صرف ایک انقلابی مفکر نہیں۔ ترقی پسند تحریک خصوصاً اپنے پہلے دور میں ایک متحرک اور فعال جذبہ تھی جس کی جڑیں اگر ایک طرف ہماری عصری تاریخ میں تھیں تو دوسری طرف سارے جہان محکوم کی آرزوئیں اس کا سرچشمہ تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس تحریک نے اردو فکشن کو خصوصاً ایک عالمی سمت عطا کی اور وہ عالمی ادب کا ایک جزو بن گیا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ یہ تحریک آگے چل کر خود اپنے گھرے اور ابتدائی محرکات سے بیگانہ بن گئی۔

عوض سعید

مصحف اقبال توصیفی

خاکہ

خالد نے جب مجھ سے آکر کہا کہ مجھے مصحف اقبال توصیفی پر خاکہ لکھنا ہوگا تو میں بظاہر خوش ہوتے ہوئے بھی اداس ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ اداسی یوں ہی نہ تھی میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو وہ نہ صرف اداس ہو جاتا بلکہ پریشان بھی۔

ذرا سوچیے تو ایک نرے شریف آدمی پر بھلا کیا خاک اسکیچ لکھا جا سکتا ہے۔ یہی نہ کہ اقبال بے حد شریف اور مخلص انسان ہے۔ اس کے آگے کچھ لکھنا کم از کم میرے بس کی بات نہیں۔ میری نظر میں اقبال پر خاکہ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے آگے میں جو کچھ بھی لکھوں گا یا کہوں گا وہ سراسر مبالغہ ہی ہوگا۔ مگر جب کچھ لکھنا ہی ٹھہرا تو مجھے کچھ نہ کچھ کہنا ہی ہوگا۔

آپ نے خالی مرحوم کی وہ تصویر شاید دیکھی ہو جن کی گود میں ایک [illegible] بچہ بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔ دراصل یہی مصحف اقبال ہے [illegible] سے پوچھیے جنھوں نے خالی پیدا [illegible] ہے۔

اقبال [illegible] ہوا ہے جب کہ مزید [illegible] نہیں ہوتا۔

ایک دفعہ اقبال کو آتے ہوئے دیکھ کر احمد جلیس نے کہا تھا۔ "ایسا لگتا ہے کہ آج ہواؤں کا رخ اس طرف ہے" مطلب یہ کہ وہ خود سے چل نہیں سکتا جب تک کہ ہوا اُسے اڑا نہ لے جائے۔

جلیس کے اس دلچسپ کومنٹ کے بعد اس کا خلوص میری نظر میں مشتبہ ہو جاتا ہے۔ وہ اب تک مجھ سے بیسیوں بار مل چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کا کریڈٹ بھی ان ہواؤں ہی کو جاتا ہے۔ جن کی بدولت وہ مجھ سے آج تک ملتا رہا ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اقبال سے ملاقات کا موقع ہمیں اسی وقت میسر آتا ہے جب ہوائیں تیز چل رہی ہوں۔

وہ ایسے موقعوں پر یہی کہے گا۔ موسم اچھا تھا اس لیے چلا آیا۔ حالاں کہ بات کچھ اور ہوگی۔ بہر حال مصحف اقبال کچھ اتنا مخلص ہے کہ اس کی بات پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ طویل مدت تک اس سے ملاقات نہ ہونے پر ہم نے جو پہلی دعا مانگی اس کا مخاطب شور مچاتی ہوئی ہوائیں تھیں۔

وہ جس محکمہ سے وابستہ ہے وہاں اکثر و بیشتر اُسے کیمپ پر رہنا پڑتا ہے۔ آج آندھرا تو کل کیرالا۔ کبھی اُتر پردیش تو کبھی مدھیہ پردیش۔

پہاڑ کی بڑی بڑی چٹانوں، نہروں کے سینے پر لگائے ہوئے بڑے بڑے پلوں پر سے گزرتے ہوئے اس پر کیا بیتی ہوگی اس کا اندازہ شاید ہم نہ کر سکیں۔ ایک دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ جب وہ جیپ کار میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھنے جنگل سے گزر رہا تھا عین جیپ کے سامنے ایک خونخوار شیر آکر کھڑا ہوگیا۔ ڈرائیور نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے جیپ روک دی۔ شیر نے اقبال کے دُبلے پتلے جسم پر نظر ڈالی اور بڑی مایوسی سے آگے بڑھ گیا۔ شیر کے منہ سے نکل آنا شاید ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے۔

جب آدمی شیر کے منہ سے بچ نکل آتا ہے تو کوئی بھی مہم سر کر سکتا ہے۔ مثلاً اپنا مجموعہ چھپوا سکتا ہے۔ جلسے منعقد کروا سکتا ہے۔ اپنی تعریفیں سُن کر جھینپ بھی سکتا ہے۔ خوش بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن حقیقتِ حال کچھ اور ہے۔ دراصل ہند و پاک کے کونے کونے میں مصحفِ اقبال کے مداح بکھرے ہوئے ہیں جو اس کے شعری مجموعہ کے منتظر ہیں۔ اگر اقبال نے ان کے خاموش مطالبہ کی پابجائی کتابی صورت میں کی ہو تو وہ اس طرح اپنے دیرینہ قرض سے سبکدوش ہو رہا ہے۔

اقبال ایک سیدھا سادا مخلص مگر بے حد ذہین لڑکا ہے۔ میں لڑکا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ چھتیس برس کا ہونے کے باوجود اب بھی ہائی اسکول کا طالب علم دکھائی دیتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنی عمروں سے پندرہ برس کم دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال کو اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دعوتوں میں اُسے آج بھی بچوں کے دسترخوان پر بٹھا دیا جاتا ہے۔

وہ جب نام پلی ہائی اسکول میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اُسے کتابوں کے ساتھ ساتھ اسپورٹس سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ فٹ بال کا اچھا کھلاڑی بھی تھا۔ وہ بچے جن کا قد اندر چھ فیٹ ہوا کرتا تھا ان کے لیے کسی زمانے میں خاص ٹورنمنٹ ہوا کرتے تھے۔ اقبال کی شرکت اس میں ناگزیر تھی۔ وہ بال کے ساتھ ہوا کی طرح اُڑتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ بال سے پہلے ہی گول میں داخل ہو جاتا تھا۔ دروغ بہ گردنِ راوی، ایک دفعہ تو وہ بھاگتے بھاگتے فٹ بال گراؤنڈ سے ہاکی گراؤنڈ میں داخل ہو گیا تھا۔

اقبال شاذ کی طرح موسیقی پر جان چھڑکنے والوں میں سے نہیں ہے۔ مہدی حسن کا نغمہ ہو یا بیگم اختر کی غزل اسے متاثر کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ اس کے باوصف مہدی حسن اور بیگم اختر کی خوب صورت آواز کے زیر و بم سے اس کے کان آشنا ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مہدی حسن کا ذکر کیے بغیر ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ وہ ذکر کیے بغیر بھی شکم سیر رہتا ہے۔

بہت سوں کا خیال ہے کہ اقبال توصیفی کی شخصیت شاعرانہ مزاج سے عاری ہے۔ شاعرانہ مزاج پر ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دن معظم جاہی مارکٹ کے قریب خالد شاعروں سے زیادہ ان کے مزاج اور ذات کی تہہ داری

کا احاطہ کر رہے تھے۔ میرے ساتھ وہ بھی تھا۔

"مزاجاً اقبال شاعر معلوم نہیں ہوتے۔ بلکہ ان سے مل کر ایسا لگتا ہے کہ ہم ایسے آدمی سے مل رہے ہیں جو حساب کتاب کا پکا ہو۔ وقت کا اسیر ہو۔ اتنے بجے گھر پہنچنا ہوگا۔ گھر پہنچ کر ان ڈرائنگس کو دیکھنا ہوگا جو ڈرافٹس مین گھر چھوڑ گیا ہے۔" خالد یہ شوشہ چھوڑنے کے بعد مزے لیتے رہے۔ لیکن وہ شاعری ہی کو شاعر کا مزاج قرار دینے کی سعیٔ لاحاصل میں لگا رہا۔

جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر اُٹھے۔ کے بمصداق میرا خیال ہے کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہماری طرف سے ہی ہو جاتی ہے۔ دلچسپی اور تفریح تو ہماری کسی طرح ہو ہی جاتی ہے لیکن اقبال ایسے موقعوں پر خواہ مخواہ پسپا ہو جاتا ہے۔

مان لیجیے کہ اقبال نے ہم سے یہ بات کی ہو۔ "بھئی خالد صاحب ہم نے اپنی وہ دو نئی غزلیں وزیر آغا صاحب کو بھجوا دی ہیں۔" اچانک خالد کہہ اٹھیں گے۔ "یار حد ہو گئی۔ شاذ اور عوض صاحب کا تو انتظار کیا ہوتا" وہ بھی اوراق کو بھجوانے والے تھے، کیوں عوض صاحب کیا خیال ہے آپ کا۔" میں قدرے ہنستے ہوئے کہوں گا۔ ہاں اقبال آپ نے بڑی جلد بازی سے کام لیا۔ شاذ نے غالباً آپ سے کہا بھی تھا کہ اس سلسلے میں اسے یاد دلائیں یہ بات آپ نے اتنی دیر میں کہی ہے کہ وہ خاص شمارہ نکل بھی چکا ہوگا۔ وہ جھینپ کر کہے گا "واقعی ہم سے بڑی غلطی ہو گئی پتہ نہیں، شاذ صاحب، میرے متعلق کیا سوچیں گے۔"

شاذ کچھ سوچے یا نہ سوچے مگر وہ گہری سوچ میں مبتلا ہو جائے گا۔ اقبال کو سوچ کے گہرے سمندر میں ڈوبتا دیکھ کر ہم لوگ WEBSTER اور SEXTON کے بارے میں گفتگو شروع کر دیں گے۔ اور وہ مخصوص لہجے میں خدا حافظ کہتا ہوا رنجیدہ گھر لوٹ جائے گا۔

شاذ کی شخصیت سے اُسے بڑا لگاؤ ہے۔ وہ اسے کچھ اتنا ٹوٹ کر چاہتا ہے کہ اس کی بچی کچی محبت بھی ہمارے حصّے میں ذرا کم ہی آتی ہے۔

چند برس پہلے شاذ اور اقبال توصیفی نے ایک ہی زمین اور بحر میں کئی ہم طرحی غزلیں کہی تھیں۔ جو پونم اور دوسرے جرائد میں جوڑواں بچے کی شکل میں چھپتی رہیں۔ جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو علی گڑھ سے خلیل الرحمٰن اعظمی نے پوچھا۔ آج کل ادب کے یہ شنکر جے کشن کیسے ہیں۔

اقبال شاذ کی طرح مغنی تبسم کا بھی بڑا پرستار ہے۔ اکثر بڑے احترام سے مغنی کا ذکر بھی کرتا ہے۔

ایک دن وہ لند ابھندا ہمارے گھر آیا۔ وہ بڑا مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ "کیا بات ہے آج آپ بڑے خوش دکھائی دے رہے ہیں"

"مغنی صاحب نے میری کتاب کے لیے بڑے اچھے ڈیزائن بنائے ہیں۔ انتخاب کے لیے آپ کے علاوہ میں فاطمہ بھابی کو بھی زحمت دوں گا۔"

میں نے فاطمہ کو آواز دے کر یہ خوش خبری سنائی۔

"بھابی ٹائیٹل رکھنے کے لیے سفید چادر لائیے"

میری اور فاطمہ کی حیرانی کو بھانپتے ہوئے اس نے کہا۔ مغنی صاحب نے کہا تھا ان چادر پر رکھ کر دیکھیں تو زیادہ بھلے لگے گا۔ اور انتخاب میں بھی سہولت رہے گی۔

غرض کہ سفید چادر بچھا دی گئی۔ جس پر مغنی کے بنائے ہوئے ڈزائن سلیقے سے رکھے گئے۔

فاطمہ نے کہا۔ "بھائی نے کتنے اچھے ٹائٹل بنائے ہیں"۔ میں نے جواباً فاطمہ سے کہا۔ وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ اقبال بے چارے کہاں تک سفید چادر لیے لوگوں کے گھروں پر پھرتے رہیں گے۔"

اقبال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ دراصل میں آج گھر سے سفید چادر لانا ہی بھول گیا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ "فائزہ" کا سرورق مغنی نے بڑی خوب صورتی سے بنایا ہے۔

میری پہلی کتاب "سائے کا سفر" کی اشاعت میں بھی مغنی ہی کا ہاتھ رہا تھا۔ انھوں نے بعض کہانیوں کی کتابت عجیب و غریب انداز میں کروائی تھی۔ کہانی کے مطالعہ کے لیے آدمی کو بیک وقت مشرق مغرب کی طرف رُخ کرکے کہانی پڑھنی ہوتی تھی۔ اس تکلیف دہ مرحلے سے گزرتے ہوئے پتہ نہیں قاری پر کیا گزری ہوگی۔ لیکن ایک فائدہ مجھے یہ ضرور ہوا کہ وہ کہانی ان جھٹکوں کی وجہ سے انھیں یاد رہ گئی۔ لیکن اقبال اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ مغنی نے رحم کھا کر انھیں بخش دیا ورنہ مغنی کا بس چلے تو سرورق پر صرف کتاب کا نام لکھ کر سارے صفحات یوں ہی چھوڑ دیں ——!!

اقبال پر بہت کچھ لکھنے پر بھی مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے اقبال کی شخصیت کا بھرپور جائزہ نہیں لیا ہے۔ مثلاً اس کا حافظہ بے حد کمزور ہے۔ وہ کہیں اور کسی وقت بھی اپنی کوئی چیز بھول سکتا ہے۔ مثلاً وہ اپنا قیمتی بیگ بھول کر کسی دوسرے کا معمولی سا بیگ اٹھا لے جاتا ہے۔ وہ سگریٹ کم پیتا ہے لیکن اپنا سگریٹ کا پیکٹ بھول کر دوسروں کی ماچس کی ڈبیہ بڑے اطمینان سے جیب میں رکھ لیتا ہے۔ ایک دفعہ تو ایسا ہوا کہ اس نے وقفے وقفے سے سگریٹ سلگاتے ہوئے ماچس کی تین ڈبیاں اپنے جیب میں رکھ لیں اور خود ماچس کے لیے تڑپتا رہا اور اس کے تمام ساتھی اس کا منہ تکتے رہ گئے۔

اسے کوئی اس کے اصل نام سے مغنی کہہ کر پکارتا ہے۔ کوئی مصحف کہتا ہے کوئی اقبال اور کوئی توصیفی اس مجموعہ کے خیر مقدمی جلسے کے بعد ان ناموں میں ایک اور نام کا بھی اضافہ ہو جائے تو کوئی بعید نہیں لیکن وہ اس نام کو بھی بھول جائے گا۔

کیوں کہ سچ یہ بھی ہم بھول گئے نام ہمارا کیا تھا کی منزل پر وہ کب کا پہنچ چکا ہے۔

نہ اتنی تیز چلے سر پھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتّا دکھائی دیتا ہے
آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے

ایسے عجیب و غریب شعر کہنے والا شکیب جلالی بھی بدایون ہی کا ایک سپوت تھا جو اسی مٹی سے مصحف اقبال توصیفی کا خمیر اُٹھا ہے۔

میرا خیال ہے فائزہ اقبال کو بہت آگے لے جائے گا۔ اتنا آگے کہ وہ خود تھک ہار کر پیچھے رہ جائے گا لیکن کیا عجب کہ ایک دن وہ ننھے بلّو کا ہاتھ تھامے کسی موڑ پر ہمیں اچانک مل جائے۔!!

(مصحف اقبال توصیفی کے کلام "فائزہ" کی رسمِ اجرائی کے موقعہ پر پڑھا گیا۔)

مصحف اقبال توصیفی

زہر اور آگ

خصوصی مطالعہ

بیروت

دھرتی نے سارے دکھ چپ چاپ سہے
اپنے سینے کی آگ کو گلشن —
تنہائی کو
صحرا میں تجسیم کیا
سیلِ اشک کو قطرہ قطرہ
چشمہ، جھرنا، ندی، دریا
ساگر میں تقسیم کیا

o

آج نہ جانے دھرتی پر کیا بیتی
جیسے سینے کا آہن پگھلا
سرخ اُبلتا لاوا جیسے پلکوں کی سلاخیں
توڑ کے باہر نکلا
آنکھوں کے آنگن میں
ماتم کا شور اٹھا!

▲▲

اُس نے
اک مٹی میں اَٹی ہوئی گڑیا کے ہاتوں میں
آدھی روٹی اور مرچیں رکھ کر
میونسپلٹی کے نل سے
آگ بجھائی

o

ایک ہوٹل کی چوتھی منزل پر
میں اپنے کمرے میں لوٹا
میرے اندر اور آکاش پہ جانے کیسا گھور اندھیرا تھا
نور کی اک کشتی میں لیکن تیر رہے تھے
مندر، مسجد، گھر، دوکانیں —
میں نے یہ کشتی
میونسپلٹی کے نل سے ٹکرا دی
شہر کی ساری روشنیاں گل کر دیں
تھکی ہوئی پلکوں پر تاریکی کے قطرے چھڑکے
نیند کے زہر میں آنکھیں تر کیں

▲▲

مصحف اقبال توصیفی

یہ کیسا شہر ہے

یہ کیسا شہر ہے سڑکوں کے اس سمندر میں
اُبھرتی ڈوبتی یہ پرچھائیوں کا سیلِ رواں
نشانِ ریگ، نہ ساحل، نہ صورتِ انساں
پلک جھپکتی ہوئی آسماں کو تکتی ہوئی
دعا کو ہات اٹھائے نیان روشنیاں
ادھر وہ موڑ یہ اک بھیڑ سی دوکانوں کی
وہ پاٹیوں پہ جھکی کھڑکیاں مکانوں کی
یہ کہہ رہی ہیں یہاں بھی مکیں نہیں کوئی
ہمارے سینوں میں لاوا ہے۔ کھولتا لاوا
ہمارے پاؤں کے نیچے زمین نہیں کوئی

مجھے صدا دے

مجھے صدا دے
کبھی مجھے اتنی دور سے صدا دے
کہ تیری آواز کے تعاقب میں گھر سے نکلوں
تو جنگلوں، وادیوں، پہاڑوں کا کارواں میرے ساتھ نکلے
ہزار سمتوں کے ہات میں ساعتوں کے نیزے
جو مری آنکھوں میں بازوؤں میں گڑے ہوئے ہیں
ٹٹول کر اپنے جسم آنکھوں سے ایک ایک نیزہ نکال دوں میں
دہکتے سورج کی سرخ بھٹی میں ڈال دوں میں

کبھی مجھے اتنی پاس سے صدا دے
کہ تیری آواز مجھ میں پیدا ہو۔ مجھ سے ٹکرائے
مجھ میں ٹوٹے
میں تری آواز کے جزیرے میں قید ہو جاؤں
کبھی میں تجھ کو ہی قید کر لوں
ترے سمندر کو
اپنے پیاسے بدن میں بھر لوں

مصحف اقبال توصیفی

ایک نظم

ہم بیڈروم کی کھڑکی سے آسمان کی سمت تکتے۔
چاند ستاروں سے
اپنے سپنے سجاتے رہے

○

اب کہ ستاروں کے سیاہ پتھر ہر طرف گر رہے ہیں
آسمان کہیں نہیں۔
بس حدِ نگاہ ہے
اور وہ سپنے ـــــ
جو رات کو ننھے بچوں کی طرح ہمارے بستر پہ کھیلتے تھے
صبح ایک سفید کار انھیں لینے آئی
تو تمہارے لبوں پر اپنی ننھی انگلیاں رکھ کر
میری آنکھوں کو بوسہ دے کر
رخصت ہو گئے

○

میں بھی چپ ہوں ـــ
تم بھی اداس ـ
میں سگریٹ پی رہا ہوں
تم ـــ پاؤں کے ناخن سے
مٹی کرید رہی ہو،

○

دروازے تک آئیں
لوگ مجھے سمجھائیں
اُس سے مل کر دیکھیں
اپنا نام بتائیں
میرا ایک ہی محور
میری چار دِشائیں
دھرتی کے لب کانپے
ہم بھی ہات اُٹھائیں
میرے لَوٹ آنے کی
مانگیں سب نے دعائیں
پہلے سجدہ کرلیں
یا جھولی پھیلائیں۔؟
پنچھی لَوٹے ـ ہم بھی
شام ہوئی، گھر جائیں
بچّو! باہر کھیلو
مصحفؔ جاگ۔ نہ جائیں

مصحف اقبال توصیفی

○

ہر آئینے میں خد و خال اُس کے
سیہ آنکھیں سنہرے بال اس کے

کہاں جاتا زمیں پر شہر و صحرا
سمندر میں بچھے تھے جال اُس کے

میں قیدی جسم و جاں، کون و مکاں کا
زمیں، آکاش اور پاتال اُس کے

خمیدہ پشت ہوں بارِ ازل سے
مری زنجیر نوری سال اُس کے

وہاں ہم نے بھی کل مصحف کو دیکھا
اُڑی رنگت، پریشاں بال اُس کے

○

اس میں بھی تری خوشی ہو جیسے
اب ہجر ہی زندگی ہو جیسے

پایا ہے ضرور کچھ گنوا کے
تو خوش ہے اداس بھی ہو جیسے

ہر شئے میں ترا وجود لیکن
ہر شئے میں تری کمی ہو جیسے

جس موڑ پہ ہم جُدا ہوئے تھے
تو اب بھی وہیں کھڑی ہو جیسے

آغا سہیل

عہدِ زوال

جیسے ہی مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب سارے لوگ سو رہے ہیں اور رات بہت گہری ہو چکی ہے تو میں آہستہ سے اٹھا، دروازہ کھولا اور یخ بستہ اندھیری رات میں کمبل کا بُکل مار کر سیدھا اُس جگہ جا پہنچا جہاں وہ عمارت بنی ہوئی ہے اوپر سے اُس وقت اندھیرے میں ڈوبی ہوئی اور اندر سے روشنی میں نہائی ہوئی تھی میں نے شیشے کی اس عمارت پر سے دُھند اور کہر کو صاف کیا اور شیشے کی اس دیوار سے آنکھیں چپکا دیں۔ بستر پر وہ لیٹی ہوئی تھی، اس کے دونوں بازوؤں میں خون اور گلوکوز کی سرنجیں لگی ہوئی تھیں، سارا جسم ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا، دل کی دھڑکنوں کو ریکارڈ کرنے والی مشین چل رہی تھی اور گراف بنا رہی تھی چند نرسیں اور چند ڈاکٹر اس پر جھکے ہوئے تھے۔ آپس میں کچھ بولتے اور بحث کرتے جا رہے تھے مگر آواز نہیں آ سکتی تھی، شیشے کی دیواروں نے آوازوں کا راستہ روک رکھا تھا مریضہ کی آنکھوں کی پتلیاں حرکت کر رہی تھیں اور وہ بار بار اپنے گرد و پیش میں لگے ہوئے تیسری دنیا کے نقشوں اور ننگی بھوکی سیاہ فام مخلوق کے مدقوق جسموں پر مرکوز ہو جاتی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹروں کا کسی بات پر سخت اختلاف رائے ہے۔

یہ اختلاف رائے کتنے ہی دنوں سے جاری ہے۔ مریضہ جاں بلب ہے، کب سے مر رہی ہے لیکن نہ تو مر چکتی ہے کہ سارا پاپ کٹے اور نہ صحت یاب ہوتی ہے اور میرا عذاب یہ ہے کہ نہ تو میں اُن کی آوازیں سُن سکتا ہوں نہ ان تک پہنچ سکتا ہوں، نہ اپنی بات اُن تک پہنچا سکتا ہوں۔

یا اللہ میں کیسے کرب میں مبتلا ہوں اور یہ کیسا عذاب ہے جسے میں جھیل رہا ہوں۔ آخر مریضہ سے میرا تعلق کیا ہے، میں کیوں اُس تک پہنچنا چاہتا ہوں، پہنچ بھی جاؤں تو کیا کر سکتا ہوں، شاید کچھ بھی نہیں، لیکن میں ان طبیبوں کی گفتگو سننا چاہتا ہوں جو اس کا علاج کر رہے ہیں اور میں تو ان کو پہچانتا بھی نہیں، سوائے اس کے کہ ایک خوب لمبا تڑنگا، سُرخ و سپید آدمی ہے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلتا ہے اپنے لمبے چوڑے جبڑے کو خوب فراخ صورت میں بے تحاشا کھولتا ہے ہاتھ خوب زور زور سے ہلاتا ہے۔ دوسرا ہے تو گورا چٹا مگر سُرخ زیادہ ہے

چہرہ گول ہے، جسم بھی فربہ ہے، جبڑے کو بھینچ بھینچ کر اور آنکھوں کو میچ میچ کر فراٹے سے بولتا ہے۔ مریضہ دونوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی اس کو تو کبھی اس کو، لیکن کوئی اس کی سچائی نہیں کرتا۔

ذرا سی بھی آہٹ ہوتی ہے تو میں الٹے پاؤں واپس جاکر اپنے کمرے میں لیٹ جاتا ہوں، نیند نہیں آتی، اٹھتا ہوں .... لیمپ کا بٹن آن کر کے اپنی پسندیدہ کتاب کھول لیتا ہوں اور ہزار بار کی پڑھی ہوئی عبارت کو پھر پڑھتا ہوں:

چناں چہ پائلٹ نے ٹیک آف کیا، کیپٹن نے روایتی اعلان کیا کہ ہم اتنے اتنے ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے اپنی منزل پر اتنے گھنٹے اور اتنے اتنے منٹوں میں پہنچ جائیں گے اور پائلٹ نے جیسے ہی آسمان کی بلندیوں پر پہنچ کر نشیب پر نگاہ ڈالی اور سوادِ ارض نگاہ سے چھپا، وہ زمان و مکاں کی طنابوں کو توڑ کر پھر وہیں پہنچ گیا، جیسے ایک بلند پہاڑی کی چوٹی پر ایک کٹیا میں سفید براق سی داڑھی اور سفید براق سی لمبی لمبی زلفیں بھنویں اور پلکیں تک برف کی طرح سفید ہاتھ میں بڑی سی تسبیح لیے ہوئے وہ بولا کہ بیٹا تو کہیں بھی جائے کاہر گز سکھ نہ پائے گا کہ کرب کا زہر تیرے رگ و پئے میں دوڑ رہا ہے اور تو اس شکنجے کو نہیں توڑ سکتا۔

میں نے کئی بار غصے میں کتاب بند کی، پاؤں پٹخے اور چاہا کہ اس تصویر کو ذہن سے جھٹک دوں اس نورانی شبیہہ کو ذہن سے مٹا دوں مگر مجھے ہر طرف وہی شکل نظر آتی ہے اور بہ تکرار عہدِ زوال عہدِ زوال کی تسبیح خوانی سنائی دیتی ہے۔

مسجدوں اور خانقاہوں میں دل کا سکون تلاش کیا مرشدوں اور پیرانِ حق جو کی صحبتوں میں بیٹھا، حتیٰ کہ بعض دوسرے ادیان کے ماننے والوں کی مجلسوں اور محفلوں میں بھی گیا لیکن ہر جگہ مجھے عہدِ زوال کی تسبیح خوانی کے الفاظ کے سوا اور کچھ سنائی نہ دیا۔

ایک روز تو میں ایک دوست کے کہنے سے ایک مسیحی گرجا گھر بھی پہنچ گیا، لوگ جوق در جوق چلے آرہے تھے اور آآ کر اپنی اپنی جگہ پر جا بیٹھتے تھے میں بھی جا بیٹھا، سفید براق گاؤن پہنے پادری نے بائبل کھول کر بآوازِ بلند پڑھنا شروع کیا:

"تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا جو یوسف کو نہیں جانتا تھا۝ اور اس نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا دیکھو اسرائیلی ہم سے زیادہ اور قوی ہو گئے ہیں ۝ سو آؤ ہم ان کے ساتھ حکمت سے پیش آئیں تا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہو جائیں اور اس وقت جنگ چھڑ جائے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں ۝ اس لیے انھوں نے ان پر بیگار والے مقرر کیے جو ان سے سخت کام لے کر ان کو ستائیں سو انھوں نے فرعون کے لیے ذخیرہ کے شہر پتوم اور رعمسیس بنائے ۝ پر انھوں نے جتنا ان کو ستایا وہ اتنا ہی زیادہ بڑھتے اور پھیلتے گئے اس لیے وہ لوگ بنی اسرائیل کی طرف سے فکر مند ہو گئے ۝ اور مصریوں نے بنی اسرائیل پر تشدد کر کر کے ان سے کام کرایا ۝ اور انھوں نے ان سے سخت محنت سے گارا اور اینٹ بنوا کر اور کھیت میں ہر قسم کی خدمت لے لے کر ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی سب خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے تشدد کی تھیں ۝"

پھر پادری نے بائبل کے تمام متعلقہ حوالہ جات کا اعلان کیا اور کتاب کو بند کر کے چوما اور آہستہ سے کتاب کو ڈیک پر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں: اس کے بعد پورے ہال میں خاموشی چھا گئی لوگ آہستہ آہستہ سرکنے لگے، میں بھی اٹھا اور سینے میں دل کو ٹٹولا تو پتہ چلا کہ جیسے کوئی چور دل کے اندر ہی چھپا بیٹھا کہہ رہا ہے کہ اور جب یہ اپنی سفید بادبانی کشتیوں سے اپنے سفید براق گاؤن پہنے اپنی بغلوں میں بائبل دبائے ہوئے ہمارے ساحلوں پر اترے تو ہم نے جانا کہ اللہ نے آسمان سے زمین پر فرشتوں کو ہماری ہدایت کے لیے اتارا ہے۔ لیکن جب رات دن ان کی سپید بادبانی کشتیاں ہمارے پیارے وطن کی سرزمین پر پھیلا ہوا سونا سمیٹ کر اپنے وطنوں کو جانے لگیں تو ہم چونکے اور اب جب کہ سارا سونا ان کے ملکوں کو پہنچ چکا ہے اور یہ فرشتہ نما مخلوق جو سفید براق سے گاؤن پہنے اپنی سفید بادبانی کشتیوں میں بیٹھ کر ہمارے ساحلوں سے واپس جا رہی ہے تو ان کی بغلیں خالی ہیں اور بائبل ہماری بغلوں میں دبی ہوئی رہ گئی ہے۔ کچھ حاصل نہیں، قرار کہیں نہیں ہے، سکون اور طمانیت عنقا ہے یہ سچ مچ عہد زوال ہے، میں عبارت سے نگاہ ہٹاتا ہوں، کتاب بند کرتا ہوں کمرے میں بار بار ٹہلتا ہوں اور پھر کمبل کا بکل مار کر نکلتا ہوں اور شیشے کی دیوار سے جا کر نگاہیں چپکا دیتا ہوں، وہی منظر وہی مریضہ، وہی جانکنی اور نزاع کا عالم، وہی نرسوں اور ڈاکٹروں کا جم غفیر وہی خون اور گلوکوز کی سرنجیں اور وہی مجسم تھا کہ جس کی آواز ہم تک نہیں آتی شیشے کی دیواریں آوازوں کا راستہ روکے کھڑی ہیں میں کچھ سن نہیں سکتا مگر دیکھتا، دیکھتا ہی رہتا ہوں، میں دیکھنے کے عجیب وغریب کرب میں مبتلا ہوں، لوٹتا ہوں کمرے میں آتا ہوں، لیمپ جلا کر پھر کتاب کھولتا ہوں وہی ہزار بار کی پڑھی ہوئی عبارت، پائلٹ نے ٹیک آف کیا ..... اور ..... اور پھر جیسے ہی پائلٹ نے نشیب پر نگاہ ڈالی اور سبزہ زار نگاہ سے چھپا وہ زمان ومکاں کی فضا میں تڑاکر پھر وہیں پہنچ گیا ـــــ مگر یہ کیا، وہ پہاڑی اور اس پر بنی ہوئی کٹیا کہاں گئی اور وہ نورانی چہرے والا بزرگ کہاں ہے یہ انسانی کھوپڑیوں کا مینار کیسا بنا ہے ہاتھ میں تلوار لیے خونخوار نگاہوں سے تکنے والا مہیب شکل کا یہ کون شخص کھڑا ہنس رہا ہے۔ شاید میری نگاہ کا دھوکا ہے میں اٹھ کر آنکھوں پر پانی کا چھینٹا مارتا ہوں کہ مبادا میری آنکھ لگ گئی ہو اور یہ شخص اصلیت میں وہ نہ ہو جو مجھے نظر آ رہا ہے، فریب نظر ہو، یا نیند کے غلبے میں مجھے میرا ہی خیال تجسیم بن کر ڈرا رہا ہو مگر یہ کیا یہ تو سچ مچ وہی ہے جو میں پڑھ رہا ہوں، وہ عبارت کہاں غائب ہو گئی کہ جس میں ایک نورانی صورت بزرگ بلند پہاڑ کی چوٹی پر آسن جمائے کٹیا میں بیٹھے تھے اور ان کی سفید براق سی داڑھی تھی اور سفید براق سی لمبی لمبی زلفیں تھیں حتی کہ ان کی بھنویں اور پلکیں تک برف کی طرح سفید تھیں ہاتھ میں بڑی سی تسبیح لیے ہوئے تھے اور عہد زوال عہد زوال کی تسبیح خوانی کر رہے تھے ان کی جگہ یہ خونخوار گھوڑے سوار ہاتھ میں برہنہ شمشیر لیے آموجود ہوا ہے اور اس کی پشت پر انسانی کھوپڑیوں کا مینار چنا ہوا ہے، یہ سب کیا چکر ہے اور کیسا معمہ ہے۔

یا اللہ یہ کیسا عذاب ہے اور میں کس کرب میں مبتلا ہو چکا ہوں، کیا اس سے قبل بھی انسانی بستیاں عہدِ زوال کے مصائب میں اسی طرح جا پھنسی تھیں کیا اسی قسم کے عذاب میں مبتلا ہو ہو کر وہ صفحۂ ہستی سے ناپید ہوتی رہیں کہ اب جن کے صرف آثار باقی رہ گئے ہیں۔

میں پھر کتاب بند کرتا ہوں، آنکھوں کو دیر تک ملتا رہتا ہوں سر کو دیر تک ہتھیلیوں کے تکیوں پر ٹکا کر سوچتا رہتا ہوں کہ مبادا یہ سب خواب ہو، شاید میں خواب میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں اور حقیقت میں یہ سب کچھ نہ ہو جو مجھے نظر آرہا ہے، صورتِ حال شاید مختلف ہو مگر وہ مریضہ ــــ مریضہ کا خیال آتے ہی میں پھر کمبل کو الگ مار کر باہر نکلتا ہوں شیشے کی دیوار سے آنکھیں لگا کر اندر کا احوال مشاہدہ کرتا ہوں وہی مریضہ، وہی جانکنی وہی نرسوں اور ڈاکٹروں کا جمِ غفیر اور مریضہ کا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اطراف و جوانب میں بہ حسرت و یاس ایک ایک کا چہرہ تکنا اور ہر ہر چہرے پر اپنے لیے ہمدردی اور پیار کے آثار تلاش کرنا، نہیں نہیں بس اتنا بہت ہے اب اور زیادہ دیر تک میں اسے نہیں دیکھ سکتا، میں لوٹتا ہوں اور کمرے میں آکر لیمپ جلاتا ہوں بے خیالی میں کتاب کھولتا ہوں اور بے خیالی میں ورق الٹ کر پھر اسی جگہ کی عبارت پڑھتا ہوں، پائلٹ نے ٹیک آف کیا اور پھر پائلٹ نے پہلے ہی نشیب پر نگاہ ڈالی اور سوادِ ارض نگاہ سے مٹا وہ زمان و مکاں کی خلا میں تیر کر پھر وہیں پہنچ گیا مگر کیا وہ عبارت جو یہاں تھی کہاں گئی نہ وہ کیا نہ وہ بزرگ نہ وہ سوار اور اس کی خونخوار تلوار اور انسانی کھوپڑیوں کا مینار ان کی جگہ یہ ایک وادی ہے جس میں انسانی بستیوں سے آگ کے شعلے بلند ہیں اور دھواں آسمان تک پہنچ رہا ہے ایک زبردست دھماکہ ہوا تھا کہ سارا آسمان روشن ہو گیا تھا کہ رات پر دن کا گمان گزرتا تھا اب تو انسانی چیخوں اور فریادوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا خاک اور خون کا لاوا بہہ رہا ہے اور آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور دھواں آسمان تک جا رہا ہے اور پس منظر سے چپکے چپکے عہدِ زوال کی تسبیح خوانی جو کر رہا ہے وہ اسی نورانی چہرے والے بزرگ کی آواز ہے جس کا چہرہ غائب ہو چکا ہے۔

کیسی بستی ہے یہ کیسی آگ ہے اور یہ کیسا انسانی کرب ہے میں گھبرا کر کتاب بند کر دیتا ہوں، کمرے میں ٹہلتا ہوں، کتاب کی ادلتی بدلتی عمارتوں کے بارے میں سوچتا ہوں کہ یہ کیا طلسم ہے آگے تو کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ عمارتیں بدل جاتی ہوں آخر پہلے والی عبارت کہاں غائب ہو جاتی ہے نئی عبارت کہاں سے آجاتی ہے اور یہ پائلٹ جو سفری میں رہتا ہے اور ہمیشہ ٹیک آف کرکے جہاز اڑاتا نظر آتا ہے، نیچے کیوں نہیں اترتا، زمین پر کیوں نہیں آتا، کیا وہ بھی میری ہی طرح شیشے کی دیوار کے پیچھے جاں بلب مریضہ سے نگاہیں چراتا ہے کیا اس طرح حقائق سے فرار کرکے وہ حقائق کے تلخ زہر کو اپنے رگ و پے میں اتارنے سے محفوظ رہ سکے گا۔

میں ٹہلتا جاتا ہوں اور سوچتا جاتا ہوں اور فیصلہ کرتا ہوں کہ اگر اس مریضہ کو ہر حال مرنا ہے اور میں اسے نہیں بچا سکتا اور نہ اسے نرسوں اور ڈاکٹروں کے نرغے سے نکال سکتا ہوں تو میں اسے بغور دیکھتے

(باقی ص ۱۳۱ پر دیکھیے)

عزیز تمنائی

اسمِ اعظم

(سانیٹ)

بہت تھک گیا ہوں، وہ پتھریلی راہیں
جنھیں روند کر پھاند کر آ رہا ہوں
وہ ساتھی جنھیں کھو کے پچھتا رہا ہوں
ملیں جن سے سنگ و سخن کی پناہیں
میں سب سے بچھڑ کر چلا سوئے منزل
کئی مرحلوں معرکوں سے گذر کر
تمازت میں جن کی میں بن کر سنور کر
صفر ہی صفر ہے ریاضت کا حاصل
مرے ذہنِ خفتہ پہ یادوں کا چابک
لگاتے رہو گے تو ممکن ہے لوگو
حرارت سی مل جائے ذوقِ سفر کو
طلسمِ وجودِ مسلسل ہے نازک
یہ سچ ہے مگر مجھ میں باقی نہیں دم
پڑھوں زیرِ لب ہی سہی اسمِ اعظم

حمید الماس

اُن کے آستانے تک

بصیرت تھک گئی
حسنِ بصارت بھی ہے پژمردہ
کفِ پائے رواں کی نامکمل سی
حکایت میں
تقاضوں کے بگولے
یاسیت کے سنگ ملتے ہیں
کہیں حرفِ شکستہ سے
یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ
ہمارے راستے جاتے ہیں
اُن کے آستانے تک

غضنفر

○

اس سے پہلے تو نہ تھا رنگ تمہارا ایسا
کیا ہوئی بات کہ سنولا گیا چہرہ ایسا

آگے جانا بھی کٹھن اور پلٹنا بھی محال
منتخب میں نے کیا جان کے رستہ ایسا

مجھ کو ہر حال میں کہنا ہی پڑا جھوٹ کو سچ
دے رہا تھا وہ صفائی میں حوالہ ایسا

آگیا وہ بھی نظر تھا جو نگاہوں سے نہاں
میری آنکھوں میں گھلا اب کے اندھیرا ایسا

اس کو پہچان کے کرنا پڑا انکار مجھے
تھا نگاہوں میں کسی شئے کا تقاضا ایسا

خواب کے ساتھ حقیقت سے بھی محروم ہوئے
دن کے سورج نے کیا رات پہ حملہ ایسا

▲▲

○

منہدم ہوتا ہے خوابوں کا مکاں اچھا ہے
ختم ہو جائے سرابوں کا سماں اچھا ہے

گر سلگتا ہے مرا دل تو سلگنے دو اسے
بن کے اُڑ جائے ہر اک زخم دھواں اچھا ہے

کچھ نہ کچھ چاہیے آخر ہمیں جینے کا جواز
سر پہ رہتا ہے اگر بار گراں اچھا ہے

پاؤں بھٹکیں گے تو رستے بھی بنائیں گے نئے
مٹ رہے ہیں جو منازل کے نشاں اچھا ہے

لاکھ دھوکا ہی سہی پھر بھی یونہی رہنے دیں
ریت کے ذروں پہ پانی کا گماں اچھا ہے

▲▲

غضنفر

○

مانا ہم نے آنکھ ہماری بالکل بچوں جیسی تھی
لیکن اس سے دنیا ہم کو کتنی اچھی لگتی تھی

جانے کیا افتاد پڑی کہ پتھر میں تبدیل ہوئی
کل کی بات ہے اس کے اندر غنچوں جیسی نرمی تھی

تشنہ لبی کے مٹ جانے کی کم سے کم امید تو تھی
مانا ریت کو آب سمجھنا صرف مری خوش فہمی تھی

جانے کیسی آندھی آئی جو کچھ تھا برباد ہوا
پھولوں جیسے لوگ تھے سارے گلشن جیسی بستی تھی

▲▲

غضنفر

○

سامانِ عیش سارا ہمیں یوں تو دے گیا
لیکن ہمارے منہ سے زباں کاٹ لے گیا

دفتر میں ذہن، گھر میں نگہ، راستے میں پاؤں
جینے کی کاوشوں میں بدن ہاتھ سے گیا

سینے سے آگ، آنکھ سے پانی، رگوں سے خون
اک شخص ہم سے چھین کے کیا کیا نہ لے گیا

لب پر سکوت، دل میں اداسی، نظر میں خوف
دورِ عروج ہم کو یہ سوغات دے گیا

خوابوں کا اک طلسم بچا تھا دماغ میں
اب کے برس اسے بھی کوئی توڑ لے گیا

پھنکارتا ہوا مجھے اک اژدھا ملا
جب بھی کسی خزانے کا در کھولنے گیا

▲▲

نظام ہاتف

حقیقتوں کی خشک منظری
(ڈاکٹر زور کی نذر)

تا بحدِ نظر
ایک دشتِ قفچاق
اس میں بھی جگہ جگہ کوہ قاف !
لرزتے کانپتے سایوں کی روایت میں
دور تک بید سے تھرتھراتے
جھلملاتے سناٹوں کی بود و باش
پرت پرت ادھڑتا ہوا دروپدی کا چیر
اور
عیاشی کی اندھی نگاہوں کے غول کے غول !
اسی اثنا میں
میرے بے اعتنا قدموں کے نیچے کی زمین غائب ہوگئی
میں ہوا میں معلق ہوگیا
میرے گرد و پیش جانے پہچانے تھے
مگر
منظروں کی سیاہ پوشی سے
پسینہ پسینہ میرا اپنا احساس ——
دریا کی سطح پر پھوٹ پھوٹ کر رونے والے حباب کا ہمسر و برابر تھا
ساکت و جامد فضا کی یخ بستگی نے
میری گھگھیاتی آواز تک کو
ٹھٹھرا اور خشک کر دیا
مگر میں نے
آنکھیں بند نہ کیں
اور خوابوں کے سلسلے
قطار اندر قطار
میری پلک جھپکنے کا انتظار کرتے رہے

▲▲

خالد شریف

○

نارسائی ہے کہ تو ہے کیا ہے
یاد کر کے جسے جی ڈوبا ہے
اے غمِ جاں ترے غم خواروں کا
صبر اب حد سے سوا پہنچا ہے
آئینہ تھا کہ مرا پیکر تھا
کونسی بات پہ دل ٹوٹا ہے
میری ہاتھوں کی لکیروں میں کوئی
زندگی بن کے چھپا بیٹھا ہے
اب سے پہلے کئی صدیاں پہلے
جیسے خود کو بھی کہیں دیکھا ہے
آسماں جھانک رہا ہے خالد
چاند کمرے میں مرے اترا ہے

▲▲

بی۔ڈی کالیہ ہمدم

○

اُگنا اُگانا خاک سے اپنا اصول ہے
پتھر بھی میرے دل کی نگاہوں میں پھول ہے
مجھ کو خیالِ شوق نے برباد کر دیا
جو زندگی سزا ہے تو وہ بھی قبول ہے
پوچھے صبا خزاں میں تیرا اب مزاج کون
سویا فضا کی گود میں اک ایک پھول ہے
ہر موڑ پر ہے زندگی میری تلاش میں
دل کا حسیں بھرم کہ نگاہوں کی بھول ہے
حسنِ چمن کا راز تو حسنِ خلوص ہے
نفرت کے خارزار میں اُگتا ببول ہے
مہکا ہوا ہے جس سے تصور کا گلستاں
وہ تو خیالِ دوست کے پاؤں کی دھول ہے
منزل کی جستجو میں سفینے کو لے چلو
ساحل پہ ڈر کے بیٹھنا ہمدم فضول ہے

عشرت ڈھول پوری

○

زباں کو لفظ، قلم کو جو کچھ ادائی نہ دوں
تو میں بھی بھیڑ میں کھو جاؤں اور دکھائی نہ دوں
قدم قدم پہ یہاں خوفِ تازیانہ ہے
میں تھک کے بھی جاؤں تو عذرِ شکستہ پائی نہ دوں
وہ مجھ کو دیکھ کے آنکھوں کو بند کر لے گا
کہ اس کو ڈر ہے، زمانے کو میں دکھائی نہ دوں
میں وہ صدا ہوں جو ہونٹوں کے لمس کو ترسے
فضا میں گونج رہا ہوں مگر سنائی نہ دوں
بھلا لگے ہے یہ الزام اس کے ہونٹوں سے
میں بے گناہ ہوں لیکن کوئی صفائی نہ دوں
مجھے خبر ہے کہ ساغر میں زہر ہے کہ شراب
یہ اور بات ابھی عذرِ پارسائی نہ دوں
فراتِ شامِ غزل تو میں تشنہ لب ہی سہی
کٹا دوں ہاتھ مگر ہاتھ سے ترائی نہ دوں

سعادت سعید

شبِ رفتہ کا

فکری و جذباتی کینوس

شاعری انسانی ذات کی دریافت کا عمل ہے اور بقول سلطان باہو "دل دریا سمندروں ڈونگھے تے کون دلاں دیاں جانے ہو" شاعر دلوں کو جاننے کا مدعی ہے۔ دوسروں کے باطن تک پہنچنا تو شاید اس کے لئے بہت زیادہ دشوار ہوتا ہے لیکن اپنے باطن کا ادراک اسے بخوبی ہوتا ہے اس کا باطن سماج ہی سے تشکیل پاتا ہے اس لئے جتنی وہ اپنے باطن کی شناخت رکھتا ہے اتنی ہی اسے دنیا کی بھی پہچان ہوتی ہے۔ وہ متخیلہ کے وسیلے سے اپنے وجود کے تمام تر تعلقات کو یکجا اور مربوط کرنے میں منہمک رہتا ہے۔ ڈی جی جیمز نے خیال ظاہر کیا ہے "تخیل کی حیات پرور قوتیں ہماری مرضی کی تابع نہیں ہیں، وہ چشمے ہیں پانی نہیں۔" اس جدید معروضہ پرست نقاد نے جبریت کا وہی پرانا راگ الاپا ہے جس کے وسیلے سے انسانی شعور کی خود مختاری سلب کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ افلاطون شاید پسندی پہلے ہی کئی نسلوں کی ادراکی صلاحیتوں [illegible] بار کر چکی ہے دورِ جدید میں ڈی جی جیمز کا یہ بیان ایسے شا[illegible] کے تخیل کے ضمن میں تو درست ہو سکتا ہے جو حقائق [illegible] سے گریزاں ہوں،

تخلیق کے پرستار ہوں یا پھر ذہنی امراض میں مبتلا ہوں باشعور شاعروں کو اپنے تخیل پر پورا پورا اختیار ہوتا ہے۔ ان کا تخیل وہ مطیع دریا ہے جس سے کئی نہریں نکالی جاتی ہیں اور صحرا سیراب ہوتے ہیں۔ مجید امجد کی متخیلہ ان کے اختیار میں تھی۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے وجود کی منتشر صورتوں کو یکجا کرنے کی بھی سعی کی ہے اور اپنے سماج کے تناظر میں انسانی ذات کے جوہر کا کھوج لگانے کا جتن بھی کیا ہے۔ ان کی نظمیں ان کے ایقان کی نقیب بھی ہیں اور انہیں ان کی تکمیل کا حوصلہ بھی عطا کرتی ہیں۔ مجید امجد کا شعور ہر نوع کی غلامی کی زنجیریں کاٹنے پر آمادہ کرتا ہے۔ انسان کے باطن میں موجود باطل خواہشات کا قاتل ہے۔ وہ گناہ اور جرم کو خارج میں دیکھنے کی بجائے ان کی ذمہ داری شاعر کی ذات پر ڈالتے ہیں۔ گناہ اور جرم کے احوال سے پیدا شدہ کرب مجید امجد کو نیکی اور انصاف کا تو شیدائی بناتا ہے۔ نیکی اور انصاف اپنے لئے بھی اور اپنے جیسے تمام انسانوں کے لئے بھی ہے۔ یہ رویہ بہت کم شاعروں کے حصے میں آیا۔ یہ امر بھی اپنی جگہ درست ہے کہ مجید امجد نظم کی مانند کوئی واضح وابستگی نہیں رکھتے لیکن ان کا شعری منطق،

متخیلہ کی جہت، تمثالوں کے نقوش اور علامتوں اور استعاروں کے رنگوں سے ان کی شخصیت میں رچے آرٹ تک کا سراغ دستیاب ہو سکتا ہے۔

سانس کی مہلت ——— عمر گریزاں ———
جس کی لرزتی روشنیوں میں
جھلمل جھلمل
جھلکے اک مسحور مسافت
حدِ نظر تک وسعتِ دوراں
جس کی خونیں سطح پہ تڑپے
طوق و سلاسل میں جکڑی، انساں کی قسمت

یہ اشکوں آہوں کی دنیا
اس منڈلی میں پیہم دھڑکے
سازِ غمِ دل
پیہم باجے، درد کی نوبت
یہ جلتے لمحوں کا الاؤ
اس جیون میں غم، دم خنجر
دکھ ——— سمِ قاتل
میں نے پیا ہر زہر سے امرت
کیسے کیسے عجب زمانے
یگ یگ شعلے۔ تٹ تٹ طوفاں
اور مرا دل
بجھتے جگنوں کی راکھ میں لت پت (حرف اول)

مجید امجد کی شاعری تیسری دنیا کے مجبور اور مظلوم فرد کے غم کی دستاویز بھی ہے اور اس کے خوشحال مستقبل کی تائید بھی۔ شبِ رفتہ ان کی زندگی میں چھپنے والا پہلا اور آخری مجموعہ ہے۔ شبِ رفتہ کے بعد "مرے خدا مرے دل" اور "گنت سورج" ان کی موت کے بعد شائع ہوئے۔ میرا یہ مضمون خوفِ طوالت کی وجہ سے شبِ رفتہ کی نظموں ہی کے جائزے پر مشتمل ہے۔

شبِ رفتہ کی کچھ نظموں کے کرداروں کا تعلق متحدہ ہندوستان کے عہد سے ہے اور کچھ کا پاکستان سے۔ شبِ رفتہ جہاں آزادی سے قبل کی فضا کا عکاس ہے وہاں اس میں ایسی نظموں کی بھی خاصی تعداد ہے جو پاکستانی فرد کے جذبات کی داستان سناتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے یہ شاعری ایسے پاکستانی فرد کی شاعری ہے جو محبِ وطن بھی ہے اور وطن کی صورتِ حال سے آگاہ بھی جو بین الاقوامیت پسند بھی ہے اور جارح غیر ملکی طاقتوں کے داؤں سے ہشیار بھی، صنعتی اور زرعی نظام کی بے پناہ مجبوریوں اور جرائم سے بھی باخبر ہے اور پسماندہ ممالک کے تہذیبی بحران سے بھی۔ یہ سب معروضات اس لئے ناقابلِ اختلاف ہیں کہ مجید امجد نے شبِ رفتہ میں اپنی متخیلہ کو اپنے ارادوں کا محکوم بنا لیا ہے۔ وہ بادلیر، میلارمے، راں بو یا بعد کے سرریلسٹ شاعروں کی طرح متخیلہ کے گھوڑے کو بے لگام کرنے کو اپنا تخلیقی مطمعِ نظر نہیں جانتے تھے اور نہ ہی ان کے شعوری آئین میں طے شدہ موضوعات کو منظوم کرنے کی شق تھی۔ ان کی شاعری کا مطالعہ قارئین کو مایوسی اور خودکشی کی جانب راغب نہیں کرتا۔ ان کی موجود مایوسیوں، محرومیوں اور بےسر و سامانیوں کی فکر کا چارہ جوئی کرتا ہے۔ نفی کے بطن سے پیدا ہوتا اثبات، مایوسیوں کی دلدلوں سے سر ابھارتی امید اور بزدلی کے جوہڑوں سے طلوع ہوتے حوصلے کے سورج ان کے شعوری کرب کے خاص الخاص لوازمات ہیں۔ مجید امجد کبھی حسّی تصویروں کے کھیلنے سے فکر میں منہمک ہوتے تھے اور کبھی ان کی سوچ حسّی تصویروں کی تخلیق کا موجب بنتی تھی۔ یہ عمل صرف ایسے ہی شعرا کا ورثہ ہے جنہیں اپنی متخیلہ کی رمح پرور قوتوں پر پوری پوری گرفت ہو ——

میں شاعر ہوں، میری جمالیں نگہ میں
ذرا بھی نہیں فرق ذرّے میں مہ میں
جہاں ایک تنکا سا ہے میری رہ میں
ہر اک چیز میرے لئے ہے فسانہ
ہر اک ذوب سے سن رہا ہوں ترانہ
مرے فکر کے دام میں ہے زمانہ (شاعر)

مجید امجد ایک مربوط نظریۂ حیات کے حامل شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا تانا بانا سپاٹ، کھوکھلی اور خشک منطق سے تیار نہیں ہوا۔ ان کی تخلیقات میں خیال ہے تو شعری اس کا ثبوت ہے تو شعری یعنی شعری منطق کے استعمال پر ان کی دسترس تھی۔ وہ تحریک، موقع اور جذبہ کی ضرورت کے تحت اپنے مواد اور ہیئت کو ترتیب دیتے ہیں۔ انھوں نے مقصد یا نظریۂ حیات سے معمور کسی سیاسی یا معاشرتی کتاب کو منظوم نہیں کیا نہ ہی وہ فلسفۂ اخلاق کی داستان لکھتے ہیں۔ تہذیب اور افادیت کے لیے تخلیق شعر بھی ان کا مقصد نہیں وہ تو صرف تیسری دنیا کے گنجلک معاشروں، الجھنوں سے بھرے ماحول اور پیچ در پیچ انسانی اور گروہی خیالوں کے درمیان اپنے وجود کا مقام اور اپنی ذات کا مرکز تلاش کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ ان کی نظموں کی تشریح و تجزیہ کے دوران میں ہی یہ بات ہمارے علم میں آتی ہے کہ ان کے وجود کا مرکز کیا ہے! اس مرکز کے تقاضے اور امکانات کس نوع کے ہیں؟ وہ کونسی الجھنیں ہیں جنھیں شاعر سلجھا رہا ہے یا وہ کون سے سوالات ہیں جن کا وہ جواب دے رہا ہے؟ اسی تناظر میں ہم انھیں مربوط نظریۂ حیات کا حامل شاعر قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی روح کے پُراسرار پوشیدہ پاتالوں میں جھانکنے کی جرأت کی اور اپنی انفرادیت کی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لاکر اپنی شاعری کے کینوس کی تزئین کی، یا دوسرے لفظوں میں انھوں نے اپنا جوہر تلاش کر لیا تھا۔ حصول جوہر کا عمل اپنے جذبوں، خواہشوں اور تمناؤں کے درست علم، تجزیے اور اپنے ضمیر کی آزمائش ہی سے ممکن ہوتا ہے۔

مجید امجد کی شاعری جھوٹ اور سچ کے درمیان کشاکش اور سچ کے اثبات کی شاعری ہے۔ وہ جرم، سزا، گناہ اور کذب کی دلدلوں سے صحیح و سالم باہر آئے۔ یہی ان کے شعری وژن کے طاقتور، مہذب اور باشعور ہونے کا ثبوت ہے۔ ہمارے اکثر و بیشتر شاعر مذکورہ بالا دلدلوں میں اتر کر ابھرنے سے قاصر رہے۔ مجید امجد کی نظم "بس اسٹینڈ" کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو ۔۔

مگر تو یہ مری توبہ یہ انساں بھی تو آخر اک تماشا ہے
یہ جس نے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا بڑے جتنوں سے سیکھا ہے
ابھی کل تک جب اس کے ابروؤں پر مونہے پیچاں تھے
ابھی کل تک جب اس کے ہونٹ محروم زنخداں تھے
ردائے صد زماں اوڑھے، لرزتا، کانپتا، بیٹھا
ضمیر سنگ سے بس ایک چنگاری کا طالب تھا
مگر اب تو یہ اونچی ممٹیوں والے جلو خانوں میں بستا ہے
ہمارے ہی لبوں سے مسکراہٹ چھین کر اب ہم پہ ہنستا ہے
خدا اس کا، خدائی اس کی، ہر شئے اس کی۔ ہم کیا ہیں
چمکتی موٹروں سے اڑنے والی دھول کا ناچیز ذرہ ہیں

تیسری دنیا کے سماجوں میں ہر وہ قدر باطل ہے جو خصوصی سیاسی مفاد اور روایاتی سماجی دباؤ کے حوالے سے فرد پر مسلط کی گئی ہو۔ افلاس، بے انصافی، محرومی اور لب بستگی ان معاشروں کو عذاب آشنا کرتے ہیں۔ اجتماعیت زوال پذیر ہو چکی ہے اور فرد انانیت، وقار اور عزت کے جھوٹے معیارات کا اسیر ہے۔ غیر حقیقی اور منجمد فکر کو فروغ ملا ہے۔ دانشور اور شاعر بھی اسی پس منظر میں معاشرے کے بطور کل مشاہدے سے گریزاں ہوتے ہیں۔ ٹکڑوں میں بٹا اور اک تیسری

دنیا کے ادب میں دیدنی ہے دانشور اہم سے اہم مسئلے کو چٹکیوں میں اُڑانے کے عادی ہیں۔ مذاق، جگت بازی، حسی، جذباتی اور فکری لذتیت ان کا شیوۂ زیست ہیں۔ شہرت عام اور بقائے دوام کے لیے اشتہار بازی، انوکھی تکنیکیوں، محیر العقول خیالات کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ تاریخی جبر اور دباؤ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے گئے ہیں۔ شکست مسلمہ معیار ہے اور سماجی، قومی اور بین الاقوامی مسائل سے لاتعلقی عمومی ہے۔ مجید امجد نے ان رویوں اور قدروں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ ان کی نظموں میں خواہشوں، جذبوں، تمناؤں اور شعور کی تخلیقی کشمکش کا سراغ ملتا ہے اور بعض تاریخ پر ان کی گرفت مضبوط ہے وہ تاریخ کے امراض کی تشخیص بھی کرتے ہیں۔

گلستاں میں کہیں بھونرے نے چوسا
گلوں کا رس شرابوں سا نشیلا
کہیں پر گھونٹ اک کڑوا کسیلا
کسی سڑتے ہوئے جوہڑ کے اندر
پیا اک رینگتے کیڑے کو
مگر مقصد وہی دو سانس جینا
وہ نکلا پھوٹ کر نور سحر سے

نظام زیست کا دریائے خون' ب
پسینوں آنسوؤں کا ایک سیلاب
کہ جس کی رو میں بہتا جا رہا ہے
گدا گر کا کدو بھی جام جم بھی
کلہاڑی بھی درانتی بھی قلم بھی

سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں

رواں ہوں ہمرہِ صد کارواں ہوں (طلوع فرض)

جدید اردو شاعری کے ابتدائی دور میں "ماورا" اور "میراجی کی نظمیں" قدیم اردو شاعری کی مابعد الطبیعاتی اور فکری روایات کی نفی کرنے والے شعری مجموعے ہیں میراجی کا بقیہ شعری سرمایہ بھی اسی رجحان کی چھاپ لیے ہوئے ہے لیکن ن۔ م۔ راشد نے قدیم شعری روایات اور اخلاقی معیارات کی نفی سے پیدا شدہ خلا کو جدید یورپی علم الافلاق اور فلسفۂ انسان سے پُر کرنے کا بیڑا اٹھایا "لا=انسان" اور "گمان کا ممکن" کی فکری بنت میں یورپی دھاگے استعمال ہوئے ہیں۔ یہ مجموعے نئی روایات اور نئی اخلاقیات کا اثبات کرتے ہیں۔ ان دو شاعروں کے شانہ بشانہ ایسے شعرا بھی سرگرم عمل رہے ہیں جو قدیم روایات اور قبائلی اقدار پر نیا تکنیکی اور ہیئتی خول چڑھا کر انھیں ہمارے جذبوں اور افکار کی دنیا میں از سر نو شامل کرنا چاہتے ہیں۔ مجید امجد نے جدید یورپی فلسفوں اور قدروں میں موجود انسان دشمن رجحانات کی نفی بھی کی ہے اور قدیم مابعد الطبیعاتی اور قبائلی معیارات کو بھی پسندیدہ نہیں جانا۔ وہ صنعتی معاشرے میں پیدا ہونے والے نئے میکانکی، نو آبادیاتی فرد کی مظلومیت اور مجبوریوں کے شارح ہیں اور قدیم قبائلی ادوار کے بنائے ہوئے فکری اور جذباتی بتوں کو پاش پاش کرنے میں میراجی اور منٹو کے ہمنوا ہیں:

کھائے جاتی ہیں یہ دیواریں مجھے
ان فصیلوں میں گھرا ہے چار سو
اک مرا اجڑا سا شہر آرزو
کوئی اس دنیا کا بھی بدلے نظام

سینکڑوں خفتہ زمانوں کا خروش
کلبلا اٹھا ہے ہنگامہ دوش
دوڑتی ہیں زلزلوں کی ساز پر
ایک دورِ نو کی خونی انگلیاں
پھر بھی میرے اور تیرے درمیاں
کہنہ دیواریں ابھی موجود ہیں
کیوں مری چھوٹی سی دنیا حزیں
اپنی قسمت کو پلٹ سکتی نہیں ؟ (دورِ نو)

یہ زخمی روحیں، یہ دکھتے دل، یہ جلتے سینے
کوئی انھیں بتلائے جا کر کوئی انھیں سمجھائے
تم اچھے ہو ان ہونٹوں سے جن کی خونی سرخی
محلوں کے سینوں کے اندر آگ لگاتی جائے
تم اچھے ہو ان زلفوں سے جن کی ظالم خوشبو
پھولوں کی وادی میں ناگن بن کر ڈسنے آئے
تم خوش قسمت ہو ان آنکھوں سے جن کی تنویریں
سونے چاندی کے ایوانوں میں مرگھٹ کے سائے
وہ چھپر اچھے جن میں ہوں دل سے دل کی باتیں
ان محلوں سے جن میں بسیں گونگے بدن بھی آتیں
("کلبۂ و ایوان")

شبِ رفتہ کی نظمیں تین حصوں پر مشتمل ہیں "دمِ شہود"، "مسطورِ تباں" اور "ظروفِ نو" ۔۔۔ دمِ شہود کے حصے کی نظموں کو بعض نقادوں نے خالص رومانی نظمیں قرار دیا ہے اور یہ ثابت کرنے کا جتن کیا ہے کہ ان نظموں کا تعلق ان کی ذاتی وارداتِ عشق سے ہے ان کے طرزِ اظہار کو اختر شیرانی کے طرزِ اظہار کے مماثل کیا گیا ہے۔ یہ بات راشد، فیض، مجاز اور ساحر کی ابتدائی نظموں کے سلسلے میں تو کچھ زیادہ غلط نہیں ہے البتہ مجید امجد کی وارداتِ عشق اور رومانیت میں سماجی اور معاشی ناہمواری کی عکاسی بھی ہوئی ہے اور جذبات و احساسات پر سپر سٹرکچر کے جبر کا بھی شدید احساس ملتا ہے۔ اختر شیرانی کی رومانیت میں طبقاتی حوالہ تو کجا سماجی اشارے بھی نایاب ہیں اس حصے کی ایک نظم شاعر کا اقتباس دیکھیے ؎

یہ محلوں، یہ تختوں یہ تاجوں کی دنیا
گناہوں میں لتھڑے رواجوں کی دنیا
محبت کے دشمن سماجوں کی دنیا
یہاں پر کلی دل کی کھلتی نہیں
کوئی چق دریچوں کی ہلتی نہیں
میرے عشق کو بھیک ملتی نہیں
(شاعر)

یاد رہے کہ ساحر یا اس نوع کے دیگر شعرا کو یہ طرزِ احساس اس وقت میسر آیا جب وہ اختر شیرانی کے سایۂ عاطفت سے نکل گئے تھے۔ مجید امجد نے شبِ رفتہ کے اولین حصے میں اپنی جذباتی اور معاشرتی زندگی کے حوالے سے داخلی کرب، روحانی درد اور سماجی آشوب کی صورتِ حال کو شدت سے محسوس کیا ہے۔

"مسطورِ تباں" شبِ رفتہ کا دوسرا حصہ ہے اس حصے میں مجید امجد درجہ بندیوں پر مشتمل سماج کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ لگاتے ہیں اور زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کی عظیم تمناؤں کا اظہار

کرتے ہیں خدا، دنیا، پژمردہ پتیاں، خودکشی، سوکھا تنہا پتا، کنواں، واماندہ، گاڑی میں، طلوع فرض، یا دل دریا سمندروں ڈونگے، دور کے پیڑ، پنواڑی، ایک نظم، بارش کے بعد اور بہت سی دوسری نظمیں پاکستانی سماج میں موجود معاشی مدارج اور ان کے پس منظر میں ابھرنے والے نفسیاتی، جذباتی اور ثقافتی مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔

شبِ رفتہ کی یادوں کو بھلانے
دکاں پر پان کھانے آ گئی ہے ۔۔۔ جہاں کا منہ چڑانے آ گئی ہے
ہے اس میں مجھ میں کتنا فرق لیکن
وہی اک فکر اس کو بھی مجھے بھی ۔۔۔ کہ آنے والی شب کیسے کٹے گی
(طلوعِ فرض)

بارہا جب ان کے محلوں کے کلس
جگمگا اٹھے فروغ شام سے
میں نے دیکھی دور سے اٹھتی ہوئی
تودۂ خاکستر ایام سے
زندگی کے بے نشاں تلخابوں کی دھند
منزلیں ۔ جن تک کوئی رستہ نہیں
آرزؤں کی سنہری بستیاں
بستیاں جن میں کوئی بستا نہیں
(دور کے پیڑ)

"ظروفِ نو" کا حصہ "شبِ رفتہ" کا جوہر ہے اس میں مجید امجد کا ذہن ہر مصرعہ سے نمایاں ہوتا ہے ۔ مجید امجد نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کو اپنے لیے اس وجہ سے ناپسند کیا تھا کہ یہ تحریک دانشوروں اور شاعروں کو ایسی گائیڈ لائن میں الجھا رہی تھی جس کا مقصد محض سطحی پراپگنڈہ تھا۔ ہر وہ شاعر جو اپنے وجود کے تضادات کا تجزیہ سماجی پس منظر میں کرتا ہے اور اپنی صورتِ حال کے حوالے سے انسان کش سیٹ اپ کو بدلنے کا ارادہ باندھتا ہے وہ ترقی پسندی ہی کا راستہ اپناتا ہے لیکن اس کے لیے ترقی پسند تحریک کا رکن ہونا کوئی حرف آخر نہیں ہے۔ مجید امجد کی ترقی پسندی کا تعلق سجاد ظہیر کے آقاؤں کے مرتب کردہ منشور سے نہیں تھا ان کے وجود کے تجربات سے تھا ۔ انھوں نے دیگر ترقی پسندوں کی طرح اپنی شاعری یا ادب کو شہرت یا منصب کی حصولی کا زینہ نہیں بنایا اور گمنام رہ کر دھیرے دھیرے انسانی شعور میں تبدیلی لانے کی بھرپور خدمت سرانجام دی۔ "ظروفِ نو" کے حصے میں ایک نظم منٹو پر بھی ہے ۔ اس کے مطالعے سے مجید امجد کے سماجی رویے کا اندازہ ہوتا ہے ۔ وہ شاعری کے وسیلے سے اپنے سماج کا اسی طرح آپریشن کرتے ہیں جیسے منٹو نے اپنے افسانوں میں کیا ہے۔ ترقی پسندوں کے لیے میراجی اور منٹو تو رجعت پسند تھے ہی مجید امجد سے ان کے دوستانہ مراسم کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن کیا کیجیے مردہ پرستی بھی تو ان کا وطیرہ ہے ۔ میراجی، منٹو اور مجید امجد کی مجاوری میں آجکل ان کا بھی حصہ ہے۔ یہ شاعر اور دانشور جب زندہ تھے تو ان کا پرسانِ حال کوئی نہ تھا ۔ نہ ترقی پسند اور نہ ہی ماضی پرست نقاد بالقول مجید امجد ان [redacted] جو سلوک روا رکھا گیا وہ کچھ یوں تھا ۔

میں نے اس کو دیکھا ہے
اُجلی اُجلی سڑکوں پر اک گرد بھری حیرانی میں

پھیلتی بھیڑ کے اندھے اودھمے گھوڑوں کی طغیانی میں
جب وہ خالی بوتل پھینک کے کہتا ہے
دنیا تیرا حسن یہی بدصورتی ہے
دنیا اس کو گھورتی ہے
شورِ سلاسل بن کر گونجنے لگتا ہے
انگاروں بھری آنکھوں میں یہ تند سوال
کون ہے یہ جس نے اپنی بہکی بہکی سانسوں کا جال
بامِ زماں پر پھینکا ہے
کون ہے جو بل کھاتے ضمیروں کے پُرپیچ دھندلکوں میں
روحوں کے عفریت کدوں کے زہر اندوز محلکوں میں
لے آیا ہے یوں بن پوچھے، اپنے آپ
عینک کے برفیلے شیشوں سے چھنتی نظروں کی چاپ؟
کون ہے یہ گستاخ
تاخ! تڑاخ!! —— (منٹو)

مجید امجد ہر شئے ہر واقعے اور ہر ماحول میں عینک کے برفیلے شیشوں سے چھنتی نظروں کی چاپ سُن لیتے ہیں یوں ظاہر اور باطن، موضوع اور معروض، وجود اور جوہر اور معانی اور ہیئت کی متحد اور منضبط صورتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ حضوری سے مہجوری تک اور مہجوری سے حضوری تک جذبے اور فکر کی ان گنت تمثالیں ظہور پاتی ہیں۔ شب رفتہ میں "ظروفِ نو" کا حصہ ظاہر و باطن، موضوع و معروض، وجود و جوہر اور معانی و ہیئت کی دوئی معدوم کرتا نظر آتا ہے۔ جبر و اختیار، جہانِ قیصر و جم میں، روداد زمانہ، "نشر دانو نو"، کانٹے کلیاں، اے یقینِ حیات، موجِ ایام، ہری بھری فصلو، بہ فرشِ خاک، زندگی اے زندگی، پہلا آٹو گراف، مقبرۂ جہانگیر، بس اسٹینڈ پر، وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں فرد کی جڑیں سماج میں اور سماج کی جڑیں فرد میں پیوستہ دکھائی دیتی ہیں۔ ان نظموں میں ڈرامائی اسالیب بیاں سے ممکنہ حد تک استفادہ کیا گیا ہے۔ پال کلودیل (Paul Claudel) نے اپنے مقدمے میں ڈرامائی نظم کے بارے میں لکھا ہے کہ ڈرامائی نظم میں عمل کرداروں کے سپرد ہوتا ہے ڈراما زندگی کے ان معانی آفریں مباحث میں سے جن میں ہم شامل ہوتے ہیں کسی ایک کو لے کر واقعی مثالوں کے ذریعے نتیجہ خیز طریقے سے مجسم کرتا ہے اسے ثابت کرتا ہے اور اعلیٰ اور ارفع شکل عطا کرتا ہے۔ ڈرامائی نظم جذبے کی گہرائی اور توانائی سے جنم پذیر ہوتی ہے۔ ڈرامے میں خواب جو انسانی دماغ کا تاریک ترین خطہ ہے اس کا سفر ہوتا ہے۔ خواب روح پر انفعالی اور نیم انفعالی کیفیت مسلط کرتا ہے۔ یہ کیفیت اپنے جلو میں ایسے واہمے رکھتی ہے جو روح پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان شکلوں کا ماخذ کیا ہے یہ معلوم نہیں یہ محض حافظے کا کرشمہ بھی نہیں ہیں یہ ہیں ور غلاتی ہیں اور واقعات کے ساتھ تعاون پر آمادہ بھی کرتی ہیں۔ پال کلودیل کا کہنا ہے کہ یہاں یہ اعتراض بھی ہو سکتا ہے کہ ڈراما نویسی میں شعوری عنصر کا ہونا بھی لازمی ہے اس کا جواب وہ یہ دیتا ہے کہ ہم ڈرامے کو ایسا خواب کہہ سکتے ہیں جس کی رہبری کی جاتی ہے اور جسے قابو میں لا کر استعمال کیا جاتا ہے۔ "مجید امجد کی نظم "جہانِ قیصر و جم میں" اس ارادی خواب کی بڑی عمدہ مثال ہے

اس میں انھوں نے کردار، واقعے اور بیان کی مدد سے ہمارے عہد کی معاشی اور سماجی ناہمواریوں کا ان تاریک ترین یعنی خالص صورتوں میں مشاہدہ کیا ہے اور ان معنی خیز مباحث کو جو ہمارے مظلوم اجتماع کے ہونٹوں پر یا سینوں کی دہلیزوں پر موجود ہیں تجسمی شکل بخشی ہے۔ مجید امجد انسانی رزمیے کے پلاٹ پر مضبوط گرفت رکھتے ہیں۔ جذبے اور فکر کی ڈرامائی شکلوں سے شب رفتہ کے تقریباً تمام حصے مانوس ہیں۔ ان کی نظم "جہانِ قیصر وجم میں" ان کے ارادی خوابوں کی تفصیل مہیا کرتی ہے اور ان کے تخیل کے خود مختار ہونے کی گواہی دیتی ہے۔

"ہے کس طرف، مرے بیٹے، تمہاری عمر دراز
ہمارے دیس کے فرمان روا کی درگہ ناز؟"
شعاعِ اولِ خورشید کی نگاہِ خموش
فضائے صبح کی دھندلاہٹوں میں ڈوب گئی!
مجھے وہ لمحۂ ظلمت فشاں نہیں بھولا —
— جب ایک پل کے لیے دو جہاں کی تاریکی
میرے ضمیر کی گہرائیوں سے اچھلی اور
ابھر کے راستوں اور منزلوں میں پھیل گئی!
"معاف رکھنا بڑی بی! مجھے نہیں معلوم"
"کوئی بھی میرا جہاں میں نہیں ہے؟"
"تیرے معصوم!"

جہانِ قیصر وجم کی شگفتہ راہوں پر
ضعیف قدموں کے چلتے نشاں بکھرتے گئے!
غبارِ راہ کی پیشانیوں سے مٹتے ہوئے
میرے شعور کی الواح پر ابھرتے گئے!
ہزار لٹتے ہوئے خرمنوں کے نظارے
نظر کے سامنے آتے گئے، گزرتے گئے

"یہاں کہیں بھی مداوائے اضطراب نہیں
کہاں ہو لوٹ بھی آؤ"
کوئی جواب نہیں

کسی کے ہانپتے ارماں جنھیں جگہ نہ ملی
نظامِ زر کے چمکتے ہوئے قرینوں میں....
اب ایک دوزخِ احساس بن کے کھولتے ہیں
مرے تڑپتے ارادوں کے آبگینوں میں!

پڑا رہے گا یوں ہی کب تک اے خسِ پامال
بلند محلوں کے رفعت نورد زینوں میں
عطا ہوا ہے تجھے بھی یہ حق مشیت سے
خراج مانگ بہاروں کی بادشاہت سے

مندرجہ بالا مثالوں سے وضاحت ہو جاتی ہے کہ مجید امجد ایک وابستہ شاعر تھے۔ انھوں نے نہ تو کسی سیاسی منشور کے تابع ہو کر شاعری کی ہے اور نہ ہی کسی نظریاتی ادبی گروہ سے خود کو وابستہ رکھا ہے۔ ان کے اس مجموعے میں مربوط نظریۂ حیات کی موجودگی سے یہ حقیقت روزِ روشن کی مانند عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ تاریخ کی ان قوتوں کی مکمل شناخت رکھتے تھے جنھیں مظلومیت، محرومیت، بے چارگی اور مجبوری کی علامت بھی کہا جاتا ہے اور ان مسائل سے عہدہ برآ

ہونے کے لیے حوصلے، عزم، جد و جہد اور ہمت کا استعارہ بھی ! ؎

سیلِ زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر ہے
یہ ہاتھ جھریوں بھرے، مرجھائے ہاتھ جو
سینوں میں اُٹھتے تیروں سے رِستے لہو کا جام
بھر بھر کے دے رہے ہیں تمہارے غرور کو
یہ ہاتھ گلبنِ غمِ ہستی کی ٹہنیاں
۔۔۔ اے کاش انھیں بہار کا جھونکا نصیب ہو
ممکن نہیں کہ ان کی گرفتِ تپاں سے تم
تا دیر اپنی ساعدِ نازک بچا سکو
تم نے فصیلِ قصر کے رخنوں میں بھر تو لیں
ہم بے کسوں کی ہڈیاں لیکن یہ جان لو
اے وارثانِ طرّۂ طرفِ کلاہ کے
سیلِ زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر ہے
(دسِ ایام)

مجید امجد دیدۂ بینا کے حامل ایسے شاعر ہیں جنہیں تاریخ اور سماج کی رفتار کا اندازہ ہے اور جو ہر نوع کی فسطائیت کے خلاف صف آرا ہونا اپنے ضمیر کا اولین فریضہ جانتے ہیں۔ محکوموں اور مظلوموں کے جھریوں بھرے ہاتھوں میں زور اور توانائی کی استحصالی کیفیت ان کی بے بنیاد بشارت نہیں ہے حقیقی مادی تجزیہ ہے اور دنیا کے بہت سے محکوم، مجبور اور پسماندہ انسان اپنے جھریوں بھرے بازوؤں کی صلاحیتیں آزما چکے ہیں!

(بقیہ «عہدِ زوال» ص سے آگے)

ہوئے دیکھوں گا اور اب بہر حال اسے مر ہی جانا چاہیے کیوں کہ ڈاکٹروں کے اختلافات کے اشتداد کا منطقی نتیجہ یہی ہے میں فیصلہ کن انداز میں کمرے سے نکلتا ہوں اور باہر جا کر شیشے کی دیوار سے نگاہیں چپکا دیتا ہوں وہی منظر ہے بعینہٖ وہی ہے کوئی فرق نہیں وہی کرب ہے اور وہی مریضہ کی جانکنی کا عالم ہے۔

تو گویا صرف یہ منظر ہے کہ نہیں بدلتا، اور کتاب کی عبارتیں ہیں کہ بدلتی جا رہی ہیں اور بدلتی ہوئی عبارت کا مفہوم بدل جاتا ہے مگر مفہوم کے سیاق و سباق میں عہدِ زوال کی تسبیح خوانی کے سوا اور کچھ سنائی نہیں دیتا، میں تھک جاتا ہوں، مریضہ نہیں مرتی اور نہ اس کی جانکنی ختم ہوتی ہے میں پلٹ کر کمرے میں آتا ہوں، کتاب اپنی جگہ موجود نہیں ہے میری کرسی پر کوئی شخص بیٹھا ہوا ہے مگر اس کا چہرہ غائب ہے اس کی وردی پاٹلٹوں جیسی ہے میں اس کے چہرے پر رکھی ہوئی ٹوپی ہٹاتا ہوں، چہرہ پھر بھی غائب ہے تو یہ بول نہیں سکتا، پھر یہ آیا کہاں سے ہے اور ہے کون، اور یہ کب آیا مجھے کچھ خبر نہیں یا اللہ یہ کس عذاب میں مجھے مبتلا کر دیا گیا عہدِ زوال میں شکلیں مسخ ہو جائیں گی اور ۔۔۔ شیس لیں پیوپلس سے سابقہ پڑے گا۔ تو پھر میں، میں کب تک اپنا چہرہ سنبھال رکھوں گا، ممکن ہے کہ میرا چہرہ بھی غائب ہو چکا ہو ۔۔۔ میرا چہرہ ۔۔۔ ہاں ہاں کیا تعجب، میں آئینے کی طرف جاتا ہوں اور یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں، کہ میرا چہرہ بھی غائب ہے۔

محمد علی کوثر

غواصی کی نودریافت غزلیں

(سلسلہ سب رس جنوری، فروری ۱۹۸۲ء سے آگے۔)

۱۱

تج کان پر جھمکتا جیوتی دو گوشش پارا — وستا ہے منج ثریا کا عین جیوں ستارا
چوٹی تری ترحاری، چھب سوں تہیا نہاری — لبدا لے گئی ہماری شد چھین ایکبارا
توں جلیلی بٹیا ہے تو جگ میں غل اٹھیا ہے — دو زلف جو چھٹیا ہے جھکار (اٹھیا ہے سارا)
چو ند کھلے ہیں چمپنا، گمنا تو تج سوں گمنا — یہ آرزو ہے ہمنا، دن رات اے نگارا
. . . . — اس جیو کوں کیا تپیا نا اے جیو ہے باوریا
. . . . حالی . . . . چتر وصالی — عاشق ترا ہے بالی، ہم جیو کا ہے پیارا

سندر سکیاں ہو دیکھو اس لال کا جمالا — جس لال کے بھنواں کا ہے عکس چاند بالا
[illegible] نین کھلانے پردو ہوس کیا ہے — آوو مل رس پلاویں ہر کوئی یکیک پیالا
قصے تو عاشقی کے لئی جگ میں ہوں گے اما — قصا ہمن پرت کا سب تھے ہوا رسالا
پکھی ہمن دلاں کے سارے رہے اُلج کر — جیوں لال کا اجالا پایا ہمن پہ جالا
گنبھیر اس سجن کے پرت کے سمندراں کی — دستا ہے تعب دریا منج آج مرد بالا
تشبیہہ اس کے مکہ سوں کیوں دیوں چاند کوں میں — کال بے بہا پتو کا گاں کم بہا چوا لالا
تحقیق کر سہیم کرامت ستے اے غواصی — فاضل ہزار جاگا پیو کا آدھر ہے آلا

۱۳

مطلع: خوبی سوں تیرا گال ہے اپنے ماہتاب — مطلع: میں خوبی سوں بولیا ہوں جو نئیں اسکوں جواب

جگمگاتا سور چو تجھے آسماں ایراں[14] کا
عین تیرے نور کے سمندر کا ہے جیوں حباب

آرزو دھرتا ہوں آج ایکبات کر منج سات توں
منج لکھیں الحق تری یکبات ہے جیوں مصحفِ کتاب

پھول تو نازوک ہے ساریاں[15] تجھے لطافت میں ولے
پھول بی رکھنا عجب ہے تج لطافت کا رکاب

میں ازل کے دیس تھے آیا ہوں عاشق ہوے کر
سو سنے خاطر کوں تیرا لطف ہور تیرا عتاب

زلف تیرا جیوں ترے رخسار سوں گھٹتا ہے تیوں
رات ساری تج سوں مل گھٹتا مبادا لک بے حجاب

مدعا بر لیا مرا اے رنگ راتی سے دعا
ہر گھڑی غواصی عاشق کا ہے تج لئی ثواب

۱۴

عشق تیرا شور اچایا آج منج من میں عجب
یعنی عاشق کوں رجھانے کے اہے فن میں عجب

کس گھڑی پی ہے کی مئے اجنوں خماری کا لہار
ناز سوں کھلتا ہے تیری مست لوچن میں عجب

..... تپلیاں مریاں حیراں آپمیں ہور صیاں
دیک خدا کا نور تیرے مکھ کے درپن میں عجب

..... دیکھیا جا پھول باڑیاں میں ولے
پھول نیں دیکھیا تج ایسا بھی کسی بن میں عجب

رات ہور دن ہو بندے تج زلف ہور رخسار کے
چاند ہور سورج کے حلقے بالی کن میں عجب

ایک دل یکجیت سوں غواصی لگایا دل تسوں
مہر ہور یاری محبت دیکھ تج دل میں عجب

۱۵

..... ں اے محبوب آئے ہیں جیباں سب
دیکھا درسن جو ہو وے راک جل رنگوں قیباں سب

جدھاں تے دردکا پانے لذت تج عشق کی دولت
تدھاں تھے دھو ستے جل میں طبال اپنے (طبیباں سب)

کھڑے ہیں تجھ نظر تل آ نصیباں عشق بازاں کے
نظر کر جو کھلیں ٹک عشق بازاں کے نصیباں سب

ستم تج پھول کا باس آج بارا لے گیا بن میں
اسی تھے مست ہوبے سد پڑے ہیں عندلیباں سب

غواصی کے نمن تج کوں سراہنے نوا نبر میسا نے
فرشتے شاعراں ہو کر کئے ہیں تیز جیباں سب

۱۶

عجائب یو تجلی دیکھ تیرے مکھ عجب کا سب
ہوا ہے لوگ دیوانا عجم کا ہور عرب کا سب

جدھاں تھے جگ منے پرگٹ ہوا ہے ناز عجب تیرا
تدھاں تھے چھپ گیا رونق پریاں حوراں کی چھب کا سب

ترے فتنے بھرے چالیاں کی بے تابی تھے (اے) چنچل
گیا ہے جیو تن میں کا اڑیا ہے ... سب کا

..... عشق بازاں تج چرن لگ آئے سو اس کوں
ہوا مقصود حاصل عشق بازاں کی طلب کا سب

ترے لب کے مٹھے گرہ کا لقال ہو آپ غواصی
لیا بھر من کی دو گانیں میٹھا گڑ تیرے لب کا سب

۱۷

رنگ بھریا منج گھر میں آج آیا بسنت — غیب تھے تازا طرب لیایا بسنت
جیوں اجالا یک دھر تھے چھا آفاق پر — رنگ کا برسات برسایا بسنت
تازگی سوں پھول نمنے کھل تمام — ہر طرف تھے آج مہکایا بسنت
بگ بھریاں کی بزم کوں بہو رنگ سوں — کر بہارستان دکھلایا بسنت
لا صراحی کوں پیالے سوں لگے — سرخوشی کا کام فرمایا بسنت
عاشقاں کوں سر تھے معشوقاں کے آج — عشق کے جالے میں الجھایا بسنت
لک دعا کر آج منج لک ذوق سوں — تخت پر عشرت کے بٹلایا بسنت
کھول شبیر جیوں ہما اقبال کا — چھا تو میرے سیس پر چھایا بسنت

۱۸

آج زہے بخت جو آتی سعادت کی رات — چاند سوں میرے ملا، غم تھے منجے دے نجات
گھر سب اجالے سوں بھر سیج کے پھولاں تمام — مری نظر میں دسیں آج ستاریاں کے دعات؟
جب تھے مرے کان میں بات پیا کی پڑی — تب تے مٹھا ہو رہیا ذات مرا جیوں نبات
خط سوں ادھر کیا ہے کر میں جو کہی تو کہیا — خط سو ہے ظلمات جیوں ہے ادھر آب حیات
روپ مرے لال کا آسے نہ تحریر میں — چاند عطارد اگر ہوویں قلم ہور دوات
اس کے قد آگے ستم کرنے سرو کوں خجل — باو اڑاتا پھرے چمنے چمن پاتے پات
پھول ہو کیوں نا کھلوں پیو کے کرم تھے غواص — ہاٹ چڑی ہے مرے آج خوشی کی برات

۱۹

دھرنا کر ہر وصا توں میرا اے نگار ہات — کرتا ہوں تج دعا میں اُچا بار بار ہات
عالم کے شبیریاں میں تجے انتخاب کر — پکڑیا ہے آج تج کوں خداوند گار ہات
نیرے جمال سات نہ پنچا ملا سکے — دھرتا ہے آفتاب اگرچہ ہزار ہات
روشن چراغ دیک تیرے خاص گال کا — ہر رات چاند نیوے مگر اوپر آثار ہات
پانی ہیے چھپ رہیا نہ نکل لاج تھے کمل — نازوک نرم دیکھ ترے دو منوار ہات
نکلے تو سیر کرنے چمن میں تو خم ہو سرو — دوڑا اے تیرے پاوں پہ بے اختیار ہات
مہندی توں لائی ہے سو منج محض یوں دسے — جیوں عاشقاں کے لہو سوں کئے ہیں نگار ہات

۲۰

سوں دو طرف تھے نین پلیلے ترے جیوں لشکریاں کھڑے ہیں لے ننگی کٹار ہات
ل شگفتہ ہوئے مرا جیوں بہار آج تیرے دو جوبناں کے چڑیں گرا تار ہات
د پڑیا ہے مرا جیو فراق تھے دے آج ہر سند سوں اس اے گلعذار ہات
میں ہزار شب قدر ہے کہ جان تج زلف تھے لگے نج اگر یکہ و تار ہات
شقاں میں کرے کیوں نہ ناز آج تج سار کا چڑیا ہے دربشا ہوار ہات

نقاق دل میں ہوس پیدا کئے کھانے شکر تب قدسیاں دکھلا دیئے تج لب کے درمیانے شکر
ں کی لذّت کے بدل پیدا کئے دیکھ شیرنیاں شیرا ہوا اپنی ذات سوں تب آئی دریا نے شکر
ں کی آج توں ستاج ہے کر ہر گھڑی ابلوج ہور نابات کوں جاتی ہے سمجھانے شکر
ل توں ہنتے براں دورس بھیجے ترے آگر تقصیر نیں کرتے ہیں تج عالم پہ برسانے شکر
توں نچی لگر جگ میں خوشیاں سوں بانٹنے اسماں کی گاڑی میں بھر قدسی لگے لیانے شکر
عرامیت کے چشمے کوں دیکھ سجدے بغر قدرت نہیں جو کر سکے کڑوا ہو تج بھانے شکر
ہری مدح میں بولیا ہے دیکھت یو غزل ہر بیت کے تیں جیو کا تعویذ کر بانے شکر

۲۱

نہ منج انکھیاں تھے ترا اے نگار نقش بس ہے تمام عمر میں اے یادگار نقش
یں دیکھتا ہوں تو خوش روپ سوں ترے پکڑیا ہے دل تمام انگوٹھی کے سار نقش
جمال ترا دیکھ ہر گھڑی چنتے ہیں آج چاند یہ تارے ہزار نقش
ی نظر میں نہ آوے جو عرش تھے قدسی ہزار چھند سوں لیا میں چتار نقش
آج منج کوں تیسرے حسن کا خیال بے شدھ کرے شنے کی پٹی پر سنوار نقش
رات دیس ترے غم سوں شاد ہے باندے نہ اس کے دل پہ غم روزگار نقش
جو کھیا ہے ترے نقش کا غزل نسن عشقباز رکھ لیئے سینے پہ مار نقش

ل: منور ۔ زیب دینے والی ۔ زلف ۔ گرتی ۔ چاروں طرف ۔ چمن ۔ زیادہ ۔ بہت ۔ عجیب ۔ بنایا ۔ نیم کا کپڑا ۔ ایک گھٹی ۔ کپڑا ۔ اعلیٰ ۔ پربت ۔ سمندر ۔ سب ۔ تمام ۔ جھیلنا ۔ چمک ۔ ابھی ۔ آنکھ ۔ میری ۔ کان کا بالا ۔ چت ۔ دھیان ۔ خیال ۔ آئینہ ۔ ناخن ۔ بادل ۔ فورا ۔ اچانک ۔ مایا ۔ تجھ ساتھ ۔ لب ۔ پیدا ہوئی ۔ تیر ۔

اردو نامہ

وقار خلیل

اردو کی علمی، ادبی، تہذیبی خبریں

۴ر جون: ممتاز غزل گو جناب سعید شہیدی کا نیا مجموعہ "آفتابِ غزل" ریاستی اردو اکیڈیمی کی اعانت سے شائع ہوا۔ جناب سعید کا پہلا مجموعہ "برق و آشیاں" ادارۂ ادبیاتِ اردو سے چھپ چکا اور دستیاب ہے۔

۵ر جون: ریاستی وزیر تعلیم مسٹر کے کیشور راؤ نے ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی دو مطبوعات "سنسکرت کتابوں کے فارسی تراجم" مصنفہ پروفیسر سری رام شرما (ہندی) اور "اقبال بحیثیت مفکر" از ڈاکٹر ماجدہ اسد خانم کی رسمِ اجرا انجام دی۔ ڈاکٹر میر اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ نے تقریب کی صدارت کی۔

۷ر جون: انسٹی ٹیوٹ آف کمانیٹراس اینڈ اسپیکرس آف انڈیا نے اپنے خصوصی جلسہ تعزیت میں انسٹی ٹیوٹ کی نائب صدر محترمہ ناز صدیقی کی رحلت پر قرار دادِ تعزیت منظور کرتے ہوئے ان کی علمی، ادبی اور تدریسی خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔ جناب محمود انصاری ایڈیٹر روزنامہ منصف نے صدارت کی۔ مسٹر احمد جلیس پروگرام اگزیکیٹیو آل انڈیا ریڈیو گلبرگہ، مسٹر جیلانی پیراک اور مس قمر سلطانہ نے مخاطب کیا۔

۹ر جون: تلگو کے معروف ادیب مسٹر نارلہ وینکٹیشور راؤ نے ڈرامائی ادب پر ساہتیہ اکیڈیمی کے ایوارڈ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

○ ڈاکٹر ضیاء الدین نے مدینہ ٹکنیکل کالج میں جناب خلیل اکمل کی کتاب "گلستانِ سائنس" کی رسمِ اجرا انجام دیتے ہوئے اردو میں سائنس اور ٹکنالوجی پر کتابوں کی ترتیب و اشاعت کی اہمیت کو واضح کیا اور مصنف کو مبارک باد دی۔ جناب اسد اللہ سعید (IAS) نے صدارت کی۔ ڈاکٹر عبد الرزاق ڈپٹی ڈائرکٹر ریاستی اردو اکیڈیمی اور جناب نظام الدین مغربی لکچرار اردو کالج نے بھی خطاب کیا۔

۱۰ر جون: حلقہ اربابِ ذوق (نظامس اردو لائبریری) کا ماہانہ ادبی اجلاس پروفیسر سید سراج الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب عابد صدیقی مددگار انفارمیشن آفیسر پی، آئی، بی نے مسٹر کے کے شعلہ کی کتاب "اردو کا آخری نقاد" پر سیر حاصل تبصرہ سنایا۔ جناب محمد منظور احمد سکریٹری حلقہ نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۱۲ر جون: محفلِ خواتین میں محترمہ ناز صدیقی لکچرار اردو جامعہ عثمانیہ کا تعزیتی اجلاس محترمہ عائشہ ارشاد کی صدارت میں ہوا۔ قرار دادِ تعزیت منظور کی گئی اور ڈاکٹر صابرہ سعید، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، مسٹر لطیف الدین، مس قمر سلطانہ اور مسز مظہر النساء ناز نے خراجِ عقیدت ادا کیا۔ محترمہ فاطمہ عالم علی معتمد محفلِ خواتین نے نظامت کی۔

۱۳ر جون: "رفقائے ادارہ کے ساتھ ایک شام" کے زیر عنوان "ایوانِ اردو" میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کی گولڈن جوبلی تقاریب کے سلسلے میں ایک علمی تقریب جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے کی صدارت میں آراستہ ہوئی۔ جسٹس شرف الدین احمد خصوصی مہمان تھے۔ ڈاکٹر سری رام شرما،

ڈاکٹر حسینی شاہد، مسٹر من راج سکسینہ، ڈاکٹر رحیم الدین کمال، مسٹر سری نواس لاہوٹی، مسز لکشمی دیوی راج، ڈاکٹر یوسف سرمست اور محترمہ بانو طاہرہ سعید نے ادارہ کی علمی و ادبی سرگرمیوں اور ڈاکٹر زورؔ کو زبردست خراج ادا کیا۔ ابتداً سید ہاشم علی اختر معتمد اعزازی ادارہ و گولڈن جوبلی تقاریب کمیٹی نے خیر مقدمی تقریر کی۔ جناب محمد منظور احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اسی رات شام غزل کا اہتمام ہوا۔ ڈاکٹر و بیگم رضی الدین نے دل نواز اور سحر انگیز آوازمیں سازوں پر دکن کے نامور شعراء کا کلام پیش کیا۔

۱۴ رجون: انڈین فلم اینڈ آرٹس اکیڈیمی کی طرف سے قومی یکجہتی ڈراما فیسٹول کے انعامات اوّل و دوم علی الترتیب مسز جاوید لطیفی اور نعیم جاوید کو دیے گئے اس تقریب کی صدارت مسٹر تجمل حسین نے کی۔ جناب غوث احمد صاحب ایڈیٹر فلمی تصویر نے ایوارڈ تقسیم کیے طلبائے انوار العلوم کالج نے اس موقع پر کرشن چندر کا ڈرامہ "دروازے کھول دو" پیش کیا۔ مسٹر ہادی جمیل نے معتمدی کے فرائض انجام دیے۔

۱۶ رجون: مرکزی محکمہ اطلاعات کے شعبہ فیلڈ پبلسٹی کی طرف سے قومی یکجہتی کے موضوع پر مشاعرہ "سب ساتھ" پروفیسر غلام عمر خاں صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونی ورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس مشاعرہ میں شاذ تمکنت، سعید شہیدی، امیر احمد خسرو، خواجہ شوق، خیرات ندیم، وقار خلیل، بانو طاہرہ سعید، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، محمد منظور احمد، نظیر علی عدیل، عزیز النساء صبا، نانک سنگھ نشتر اور انور ہاشمی نے کلام سنایا۔ مسٹر عابد صدیقی نے نظامت کے فرائض انجام دے۔ بہ حیثیت مہمانِ خصوصی ڈاکٹر میر اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ نے خطاب کیا۔ ٹیلی ویژن اور آل انڈیا ریڈیو سے اقتباسات پیش کیے گئے۔

۲۰ رجون: گولڈن جوبلی تقاریب ادارۂ ادبیات اردو کے سلسلے میں ایک یادگار نمائش خطاطی و خوش نویسی ایوان اردو میں آراستہ کی گئی۔ ریاستی وزیر اوقاف و اردو اکیڈیمی جناب بیگ نے عزیز نے افتتاح کیا اور نواب میر اکبر علی خاں صدر گولڈن جوبلی تقاریب کمیٹی نے صدارت کی۔ ابتداً جناب سید ہاشم علی اختر معتمد ادارہ نے خیر مقدم کیا۔ کنوینر نمائش جناب میر سراج الدین علی خاں نے نمائش پر اظہار خیال کیا۔ طلبائے مرکز خوش نویسی ادارہ کو انعامات تقسیم کیے گئے۔ اس نمائش میں حیدرآباد کے ممتاز ماہرین فن کے نمونے، فرامین، سکے اور نادر خطاطی کے مخطوطے اور طغرے یکجا کیے گیے تھے۔

۲۱ رجون: اردو تعلیمی ٹرسٹ کی جانب سے "اردو گھر" میں مرکز تعلیم بالغان کا اردو گھر کے بزرگ ٹرسٹی مولانا خیر الدین صابری نے افتتاح کیا۔ جناب عبدالمحمود سکریٹری نظامس اردو ٹرسٹ نے صدارت کی۔ جناب عابد علی خاں بانی اردو گھر، مسٹر منوہر راج سکسینہ صدر انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد اور جناب علی احمد جلیلی مہتمم اردو گھر نے تعلیم بالغان کی افادیت پر اظہار خیال کیا۔ جناب اقبال علاؤالدین مہمان خصوصی تھے۔

○ حیدرآباد لٹریری فورم کے ادبی و شعری اجلاس میں جناب علی ظہیر نے اردو نظم کا ارتقا پر مقالہ سنایا۔ غیاث متین، علی ظہیر، یوسف اعظمی، مظہر مہدی، بشارت علی بشارت نے کلام سنایا۔

۲۲ جون: ادارۂ قومی ادب کی طرف سے بزرگ شاعر جناب منوہر لال بہار کا جشن منایا گیا اور ان کی شعری خدمات کے اعتراف میں افضل الشعرا کا خطاب اور پانچ ہزار روپے کا کیسۂ زر نذر کیا گیا۔ مسز یدہ ویر صدر نشین مجلس انتظامی ریاستی اردو اکیڈیمی نے اس تقریب کی صدارت کی۔ ڈاکٹر حسینی شاہد، جناب چندر سری واستو، جناب منوہر راج سکسینہ، جناب شیو لال رکن اسمبلی نے بہار کی شاعری اور ان کی شخصیت کو خراج تحسین ادا کیا۔ حبیب سلوی اور اطہر نے ساز دل پر کلام بہار پیش کیا۔ جناب کلیم قریشی معتمد قومی ادب نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۲۳ جون: ریاستی وزیر تعلیم مسٹر کے کیشو راؤ نے "اردو گھر" (مغلپورہ) میں اردو ماڈل اسکول کی رسم افتتاح انجام دیتے ہوئے کہا کہ ریاست میں اردو تعلیم کے مسائل کا حل حکومت کی اولین ذمہ داری ہے، موصوف نے بتایا کہ اردو میڈیم کے مدارس میں اردو داں اساتذہ کا ہی تقرر کیا جائے گا۔ نواب میر احمد علی خاں سابق ریاستی وزیر نے اس تقریب کی صدارت کی۔ جناب عابد علی خاں مینیجنگ ٹرسٹی اردو تعلیمی ٹرسٹ نے اردو میں اعلیٰ تعلیم کے منصوبوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے تعلیمی ٹرسٹ کی طرف سے شہر اور اضلاع میں اردو ماڈل اسکولوں کے قیام کی افادیت کو واضح کیا۔ محترمہ نجمہ عبدالخالق پرنسپل ماڈل اسکول نے رپورٹ سنائی۔ مسٹر منوہر راج سکسینہ صدر انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد نے شکریہ ادا کیا۔

۲۷ جون: مخدوم سوسائٹی کی طرف سے رویندر ابھارتی میں مخدوم کی نظموں اور ان کی سیاسی و ادبی نظریات کی روشنی میں ایک بیلے "انتظار" اسٹیج کیا گیا۔ ابتدا ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے خطاب کیا اور مخدوم کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔

جولائی ۱۹۸۲ء

۲ جولائی: ڈاکٹر سی نارائن ریڈی صدر ریاستی سرکاری زبان کمیشن نے ایک وضاحتی بیان میں بتایا کہ ریاستی قانون سرکاری زبان کمیشن کی دفعہ (۷) میں حکومت نے لسانی اقلیتوں کو تعلیمی امور میں تحفظات دینے کے علاوہ اردو اور دوسری اقلیتی زبانوں کو مخصوص علاقوں اور مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی گنجائش فراہم کی ہے اور اہم اعلانات بھی اردو میں شائع کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ریڈی نے اردو زبان کی مالامال صلاحیتوں کا اپنے بیان میں بھرپور اعتراف کیا ہے۔

۴ جولائی: رفیق ادارہ ممتاز شاعرہ بشیر النساء بیگم بشیر مرحومہ کے شوہر جناب ضامن علی تمازی طویل علالت کے بعد رحلت کر گئے۔ تمازی مرحوم نے ایوانِ اردو کی تعمیر اور ادارہ کے ادبی کاموں میں ڈاکٹر زورؔ کو بھرپور تعاون دیا تھا۔

۱۸ جولائی: پرنس مفخم جاہ بہادر نے مکہ مسجد کے احاطہ میں کتب خانہ اسلامیات کا افتتاح کیا۔ نواب بسالت جاہ بہادر نے تقریب کی صدارت کی۔ جناب اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ نے خیر مقدمی خطاب کیا۔

۱۹ جولائی: اردو رائٹرس اینڈ جرنلسٹس ویلفیر فنڈ (زیر انتظام ریاستی اردو اکیڈیمی) کی مجلس انتظامی نے (۱۹) ادبی وظائف کی اجرائی کا فیصلہ کیا۔ یہ وظائف جولائی تا جون

(دو سال) کے لیے ماہانہ فی کس (۵۰) روپے ہیں جن اصحاب اور مرحوم شعراء کے پسماندوں کو جاری کیے گیے ہیں ان میں منوہر لال بہار، بیگم شاہد صدیقی، بیگم تاج قریشی، فخر الدین صابر، وقار خلیل، ساجد رضوی، قمر ہیلی بھیتی، عارف بیابانی، احمد علی ادیب، بیگم ابوالخیر صہبا، بیگم رنگی ملگنڈوی، رشید نصاری شامل ہیں۔

اگست ۱۹۸۲ء

۴ / اگست : حضرت عیسیٰ مسیح پر حیدرآباد کے شعراء کی نظموں کے مجموعہ "نغماتِ روح" کی ہنری مارٹن اسلامک اسٹڈیز سنٹر میں رسم اجراعمل میں آئی۔ سنٹر کے ڈائرکٹر ڈاکٹر طالب شاہ آبادی اور کتاب کے مرتب جناب حباب آفریدی نے مخاطب کیا۔

۵ / اگست : ریاستی محکمہ تعلیمات نے ادارہ ادبیاتِ اردو کے امتحان اردو فاضل کامیاب طلبا کو ایک سرکلر کے ذریعہ انڈو سٹڈنٹ ٹریننگ کورس گریڈ سکنڈ میں شرکت کا اہل قرار دیا۔

○ مسز کرسی ابرام گورنر آندھرا پردیش نے سالار جنگ میوزم میں بانی کے لوم پیدائش پر نواب یوسف علی خاں سالار جنگ سوم کی ثقافتی خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔ اس موقع پر موصوف نے کتب خانہ سالار جنگ میوزیم کی طرف سے مطبوعہ عربی مخطوطات کے کیٹیلاگ کی رسم اجرا بھی انجام دی۔ ڈاکٹر ایم یل نگم ڈائرکٹر میوزیم نے خیر مقدمی خطاب کیا۔

○ جناب سید بادشاہ حسین (ادیب وصحافی پاکستان) کا نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری اور حلقۂ ارباب ذوق کی طرف سے پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور لائبریری کی مطبوعات نذر کی گئیں۔ جناب عبدالمحمود سکریٹری وڈائرکٹر لائبریری نے کتب خانہ کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے واقف کرایا۔

۸ / اگست : پاکستانی دانش ور و صحافی جناب بادشاہ حسین نے ادارۂ ادبیاتِ اردو کے کتب خانہ، میوزیم اور مرکز خوش نویسی کا معائنہ کیا۔ موصوف حیدرآبادی اہلِ قلم ہیں اور (۲۰) سال بعد چند روزہ قیام کے لیے حیدرآباد پہنچے، ادارہ کی اردو انسائیکلوپیڈیا اسکیم میں ڈاکٹر زور کے ساتھ خدمت انجام دے چکے ہیں، عرصہ بعد ادارہ کی سرگرمیوں کا معائنہ کرکے اظہارِ خوشنودی کیا اور ڈاکٹر زور کی خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔ جناب سید ہاشم علی اختر معتمد ادارہ، جناب محمد اکبر الدین صدیقی معتمد کتب خانہ، جناب سراج الدین علی خاں انچارج اردو میوزیم، جناب محمد منظور احمد مددگار معتمد گولڈن جوبلی تقاریب کمیٹی، جناب صادق نقوی لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ اور وقار خلیل اس موقع پر ایوانِ اردو میں جناب بادشاہ حسین کے خیر مقدم کے لیے موجود تھے۔

۸ / اگست : حیدرآباد کرناٹک ادبی کلب کے طرف سے کرناٹک کے مشہور شاعر اور رکن اسمبلی جناب محسن کمال ایڈیٹر روزنامہ "گاواں" کے خیر مقدم میں ایک محفلِ مشاعرہ مسٹر یم باگاریڈی ریاستی وزیر کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس مشاعرہ میں سعید شہیدی، کنول پرشاد کنول، امیر احمد خسرو، رشید احمد رشید، علی احمد جلیلی، خیرات ندیم، راشد آذر، وقار خلیل، امان راشد، صلاح الدین نیر، بانو طاہرہ سعید، صادق نقوی، محسن کمال، فیض الحسن خیال، رحمٰن جامی، عزیز النسا وصبا، ظہیر عظمت اور معتمد کلب جناب رئیس اختر نے کلام سنایا۔

۱۰ اگست: اردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے سٹی سیول کورٹ کے وکلاء نے "بزم اردو" کے قیام کا اعلان کیا ہے جس کے صدر مسٹر منوہر راج سکسینہ صدر انجمن ترقی اردو شہر حیدرآباد منتخب ہوئے۔

۱۴ اگست: محفل خواتین کے ماہانہ ادبی و شعری اجلاس میں محترمہ بانو طاہرہ سعید کو اٹلی یونیورسٹی کی طرف سے ان کی اردو شعری و ادبی خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے ڈپلوما آف میرٹ عطا کیے جانے پر تہنیت پیش کی گئی، ڈاکٹر فرحت لطیف نے صدارت کی، سعیدہ پروین نے کہانی سنائی اور شاعرات نے کلام پیش کیا۔

۲۱ اگست: مسٹر سی جگناتھ راؤ ڈپٹی چیف منسٹر نے محفل مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے اردو زبان اور شاعری کو ہندوستانی ثقافت کا عظیم سرچشمہ قرار دیا۔ جناب آصف پاشاہ صدر ریاستی اقلیتی کمیشن نے صدارت کی، ریاستی وزیر مسٹر یم، مانک راؤ مہمان خصوصی تھے، ڈاکٹر رحیم الدین کمال، کنول پرشاد کنول، علی احمد جلیلی، صلاح الدین نیر، امیر احمد خسرو، خیرات ندیم، صادق نقوی، رحمن جامی اور فیض الحسن خیال نے کلام سنایا۔

۲۲ اگست: ریاستی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری پروفیسر حبیب الرحمن نے اردو ہال میں "اردو ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ" کے سالانہ جلسہ کو بہ حیثیت صدر مخاطب کرتے ہوئے اس اندیشہ کا اظہار کیا کہ ریاستی حکومت اردو مدارس کو آہستہ آہستہ منصوبہ بند طریقہ پر ختم کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ مسٹر محمود انصاری ایڈیٹر منصف، ڈاکٹر عبدالرزاق ڈپٹی ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی اور ڈاکٹر حسینی شاہد نے بھی مخاطب کیا اور اردو کے ٹرینڈ اساتذہ کو اردو تعلیم کے فروغ میں مثبت کردار ادا کر کے اردو دوستی کو روشن کرنے کی اپیل کی۔

۲۳ اگست: ریاستی وزیر تعلیم مسٹر کے کیشو راؤ نے اسمبلی میں بتایا کہ پبلک سروس کمیشن کے امتحانات گروپ "B" اور "D" میں اردو کو بھی شامل کیا گیا ہے اور بہ حیثیت دوسری سرکاری زبان ضلع اور ریاست کے سطحوں پر ۶۰ اور ۴۰ فی صد آبادی کے تناسب کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ موصوف نے بتایا کہ بلدیہ اور تحصیل میں ۱۵ تا ۲۰ فی صد اردو دانوں کی آبادی پر سرکاری اعلانات کی اردو میں اشاعت کا انتظام کیا جا رہا ہے

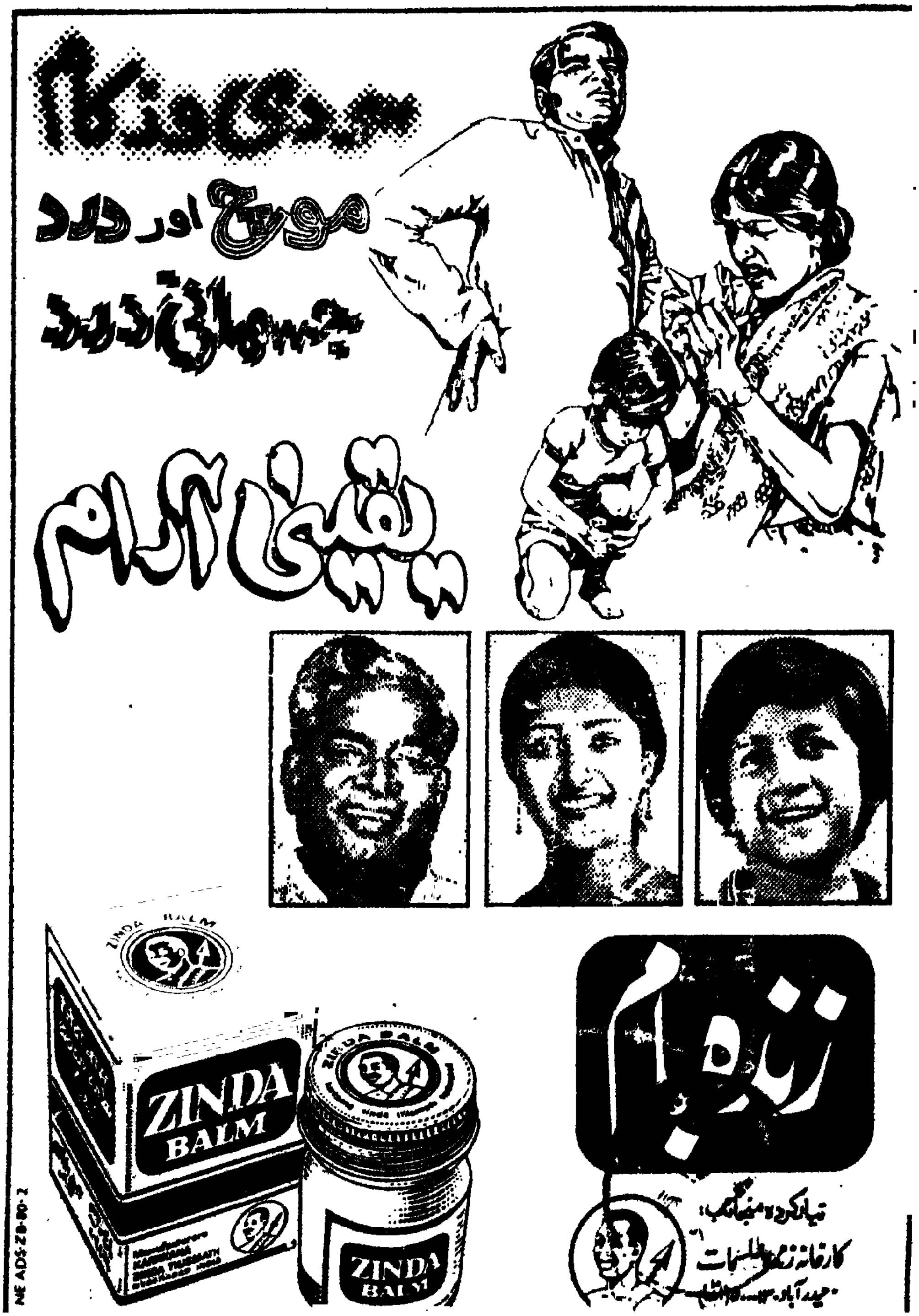
۲۶ اگست: صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے اپنے مختصر قیام حیدرآباد میں پہلی بار ایک محفل مشاعرہ میں شرکت کی اور اردو زبان و ادب اور شعر و سخن کی محفلوں کو قومی یکجہتی کے لیے ناگزیر قرار دیا۔ چیف منسٹر بھاؤنم وینکٹ رام نے بھی اس مشاعرہ کو مخاطب کیا۔ ابتداءً مشاعرہ جناب جلیل پاشاہ صدر کل ہند تعلیمی کمیٹی نے خیر مقدم کیا۔ ملک الشعراء اوج یعقوبی، کنول پرشاد کنول، بانو طاہرہ سعید، خیرات ندیم، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، منوہر لال بہار اور عزیز النساء صبا نے کلام سنایا۔ جناب محمود انصاری ایڈیٹر روزنامہ منصف نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

۲۹ اگست: اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب نریندر لوتھر (آئی اے ایس) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر رحیم الدین کمال نے "اردو تہذیب" کے موضوع پر مقالہ اور جناب اظہر افسر نے طنز و مزاح سے عبارت مضمون سنا کر داد پائی۔ آخر میں شعراء نے کلام سنایا۔

Regd. ...

The "SABRAS"-Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad 500 004. (A. P





سنِ اجرا ۱۹۳۸ء
فون نمبر ۴۴۳۶۹

یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

مدیر اعزازی : ڈاکٹر مغنی تبسم
معاون مدیر : وقار خلیل
جلد (۴۴) نومبر، ڈسمبر ۱۹۸۲ء شمارہ (۱۱ و ۱۲)

ادارۂ ادبیاتِ اردو - پنجہ گٹہ روڈ - حیدرآباد - ۴ - ۵۰۰

زرِ سالانہ بیرونی ملکوں سے

۲۰ روپیے ہوائی ڈاک سے بحری ڈاک سے
کتب خانوں سے، ۲۵ روپیے مشرق وسطی ۱۰ ڈالر ۴ ڈالر
بذریعہ رجسٹری ۴۵ روپیے امریکہ ۱۶ ڈالر ۶ ڈالر
فی پرچہ ۲ روپیے پاکستان، برما، سیلون ۸ ڈالر ۲½ ڈالر
انگلستان ۷ پونڈ ۳ پونڈ

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس - چار کمان - حیدرآباد - ۲

ترتیب

اپنی بات

ماہِ دسمبر میں اہلِ اورنگ آباد اپنے ہم وطن اور اردو کے ممتاز شاعر سکندر علی وجد کا جشن منا رہے ہیں۔ وجد مادرِ علمی جامعہ عثمانیہ کے سپوت ہیں۔ ان کی شاعری مخدوم محی الدین کی شاعری کے ساتھ پروان چڑھی۔ خیالات و نظریات میں مماثلت کے باوجود وجد کی شاعری کا آہنگ اور لہجہ مختلف ہے۔ وجد ایک جمال پرست شاعر ہیں۔ تمام اخلاقی اور سماجی قدریں ان کے ہاں جمالیاتی قدریں بن گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں جذباتی تناؤ شدید نہیں ہے بلکہ جذبہ کی شدت جمالیاتی کیف میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ وجد کا تصورِ حسن معروضی بھی ہے اور موضوعی بھی لیکن وہ معروضِ حسن سے زیادہ ذوقِ نظر کو اہمیت دیتے ہیں۔ وجد نے جہاں ایلورا، اجنتا، تاج محل جیسے مظاہرِ حسن پر خوبصورت نظمیں لکھی ہیں وہاں اپنی غزلوں میں داخلی احساس اور ماورائی کیفیات کو ٹھوس پیکروں میں ڈھال دیا ہے۔

وجد کا تحسینِ حسن کا انداز والہانہ ہے اس میں خود سپردگی ہے اور نہ حد سے بڑھی ہوئی انانیت۔ ایک مہذب نرگسیت کا احساس ضرور ہوتا ہے یہی خصوصیت وجد کے اسلوب کو انفرادیت بخشتی ہے۔

سکندر علی وجد جامعہ عثمانیہ کے سپوت ہیں۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو سے بھی ان کا دیرینہ تعلق رہا ہے۔ جشنِ وجد کے خوش گوار موقع پر ہم اہلِ حیدرآباد اور ادارۂ ادبیاتِ اردو کی جانب سے اس شاعرِ جمال کی خدمت میں نذرانۂ محبت پیش کرتے ہیں۔

م۔ت

ساقی فاروقی

○

حجابِ اشک اٹھا صبح نے صدا دی ہے
متاعِ شام عبث رات میں گنوادی ہے
مرے لہو میں جدائی کی لہر اٹھتی تھی
وہ منتقم ہوں کہ یہ بات اُسے بتادی ہے
بجھا بجھا دیا اس کی سیاہ چشمی نے
دیے نے جرم کیا رات نے سزا دی ہے
تمام عمر کٹی نیند کے تعاقب میں
کہ اُس نے خواب کی میعاد ہی گھٹادی ہے
اب اس کی یاد سے دشمن کی طرح ملتا ہوں
وہی طلب ہے مگر شعلگی بڑھادی ہے

۵۵

○

مگر خدا کی تمنا حباب جیسی ہے
یہ خواب گاہ کسی قصرِ آب جیسی ہے
وہ رقصِ خوں ہے کہ آنکھوں میں پھول کھلتے ہیں
ترے خیال میں رحمت شراب جیسی ہے
محال ہے کہ تجھے چھوڑ کے ملال نہ ہو
مگر ضمیر کی آواز خواب جیسی ہے
ہوا کے ظلم سے جس کی مہک نڈھال ہوئی
مرے بدن میں تھکن اس گلاب جیسی ہے
وہی تلاش ہے دنیا طلسم خانہ وہی۔۔۔!
برہنگی کی سیاست حجاب جیسی ہے

۵۵

سعادت سعید

نئی تنقید کا نیا شارح ــــ انیس ناگی

انیس ناگی اردو ادب کے ایک منفرد نقاد ہیں۔ انھوں نے مقامی اور بین الاقوامی ادب کے جدید ترین دبستانوں اور رویوں کا نہ صرف مطالعہ کیا ہے بلکہ وقتاً فوقتاً ان پر خامہ فرسائی بھی کی ہے ان کی تنقیدی کتب [نذیر احمد کی ناول نگاری، تنقیدِ شعر، نیا شعری افق، شعری لسانیات اور تصورات] اور مضامین کا جائزہ اس حقیقت کی شناخت میں مدد دیتا ہے کہ انھوں نے تشریحی اردو تنقید کے ویرانوں میں نظری تنقید کی بستیاں بسائی ہیں۔ نظری تنقید تخلیقی رہنمائی کا فریضہ ادا کرتی ہے۔ تشریحی تنقید نصابی مقاصد کے لیے مفید ہے۔ انیس ناگی کی تنقید کے سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے پبلک ریلشنگ کے موجودہ دور میں اپنے قلم کو تقریظ نویسی سے آلودہ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدی کتب میں کوئی مضمون بھی بھرتی کا نہیں ہے انھوں نے اپنی تنقید کے مختلف ادوار میں جو کچھ سوچا جو کچھ محسوس کیا اُسے واشگاف انداز سے سپردِ قلم کیا۔

ان کی تنقید کے دائرے میں کلاسیکی اردو ادب سے لے کر نئی شاعری تک اور نئی شاعری سے لے کر بین الاقوامی ادبی جائزوں تک بہت کچھ شامل ہے۔ انیس ناگی کی تنقید جہاں ایک سطح پر اپنے معاصر عہد کی فکری اور نظری روداد ہے وہاں ایک اور سطح پر کلاسیکی ادبی روایتوں کی پارکھ بھی ہے۔ ان کی تنقیدی بصیرتوں میں مفروضوں اور یکسانیتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ وہ ادبی تخلیقات کا ٹھوس علمی حوالوں سے تجزیہ کرتے ہیں اور ہر تحریر کی داخلی خاصیتوں کو گرفت میں لیتے ہیں۔ مابعد الطبیعاتی، تخیلاتی اور ماورائی افکار و خیالات انھیں متاثر نہیں کرتے بنے بنائے تنقیدی ضابطے اور ڈھلے ڈھلائے پارکھ قوانین ان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں۔ انیس ناگی نے اردو ادب کو نئے تنقیدی زاویوں کا اثاثہ عطا کیا ہے۔ ایسے نئے تنقیدی زاویے جو قارئین اور تخلیق کاروں کے شعور پر نئے فکری اور فلسفیانہ منطقوں کے در وا کرتے ہیں۔ اردو تنقید کے عہدِ قدیم سے لے کر

دورِ جدید تک ناقدوں کا عمومی انداز مکتبی اور نصابی رہا ہے۔ تحسین و تنقیص کے مخصوص سانچے تنقید کی بنیاد رہے ہیں۔ انیس ناگی اور ان کے معاصر چند دیگر نقادوں نے مکتبی اور نصابی انداز تنقید پر کاری ضرب لگائی ہیں اور ساتھ ہی اردو تنقید کو نئے تخلیقی ادوار کے مزاجوں سے ہمکنار کیا ہے۔ سیاسی سماجی، معاشی، تہذیبی اور علمی اقلیموں سے تحصیلِ مواد نئی تنقید کے لیے شجر ممنوعہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انیس ناگی اور ان کے معاصر نئے نقادوں کی تنقیدی تخلیقات ہمہ جہتی اور پہلوداری کے خصائص سے مزین ہیں۔

تنقیدِ شعر میں انیس ناگی نے ارسطو کے دور کے بوطیقاتی قواعد اور خلیل عروضی اور اس قبیل کے دیگر افراد کے ساختہ شعری ضابطوں کو رد کیا ہے اور وسائلِ اظہار کے نئے امکانات کی نشان دہی کی ہے۔ یہ کتاب نئی شعریات کے بنیادی حوالوں سے معمور اصولی تنقید کی اہم دستاویز ہے۔ اس میں شاعرانہ اظہار کے تقاضوں کا باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ جذبہ، خیال، تلازمہ، اشارہ، تشبیہہ، تمثیل، استعارہ، علامت، امیجری اور قوتِ متخیلہ کے بارے میں متنوع نظریات کے تجزیے سے انیس ناگی نے ان اصولوں اور ضابطوں کو مدون کیا ہے جن کی مدد سے عہد جدید کی شاعری فکری وسعتوں اور احساساتی تاثیروں سے آشنا ہو سکتی ہے

نذیر احمد کی ناول نگاری بظاہر نصابی مقاصد کے لیے لکھی گئی کتاب ہے لیکن اس کے مطالعے سے عملی اور نظری تنقید کا فرق مٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انیس ناگی نے نذیر احمد کو ان کے نظریاتی اور زمانی جوہر سمیت قلم کی گرفت میں لیا ہے۔ یہ کتاب ان حوالوں اور زاویوں سے مالا مال ہے۔ جن کی اعانت سے ہم نہ صرف نذیر احمد کے ذہنی اور جذباتی ارتقا کی شناخت کر پاتے ہیں بلکہ ان کے عہد کی ایسی تصاویر بھی حاصل کرتے ہیں جن کی بدولت ہم اس عہد کے دیگر مصنفین اور شعرا کے تخلیقی تناظر کا بھرپور جائزہ لے سکتے ہیں۔ "نذیر احمد کی ناول نگاری" میں انیس ناگی نے ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد برصغیر کی مخصوص صورتِ حال کا ترقی پسندانہ حوالوں سے تجزیہ کیا ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں خصوصاً توبۃ النصوح اور ابن الوقت کے سیاق و سباق میں ان کے فنی مقام اور آؤٹ لک کی حقیقت پسندانہ وضاحت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ نذیر احمد کے ناپسندیدہ کردار زندگی سماج اور اس عبوری دور کے حقائق کی زیادہ سچی اور حقیقی تصاویر پیش کرتے ہیں۔

نیا شعری افق، نئی نظم کی صورتِ حال پر اصولی اور عملی تنقید کی اہم ترین دستاویز ہے۔ یہ نئی شاعری اور اس کے مسائل پر لکھی گئی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے۔ اس میں نئی شعری ہیئت کی حقیقت، نئی شاعری کے حدود، نئے طرزِ احساس کی اہمیت، نئے لسانی پیرائے کی تفاصیل اور نئی نظم کی ہیئتوں پر مختصر اظہارِ خیال کے ساتھ ساتھ محمد صفدر، عباس اطہر، افتخار جالب اور زاہد ڈار کی شاعری پر بڑے معرکے کے مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انیس ناگی کی یہ کتاب نئی شاعری کے کئی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ نئی شاعری

جدید شاعری اور غزل کے مابین فرق بیان کرتے ہوئے ناگی کا کہنا ہے کہ [یہ فرق صرف لسانی اسلوب کا ہی نہیں نقطۂ نظر اور رویئے کا بھی ہے۔ ماضی، عورت اور جنس اور نظامِ زیست کے حوالے سے نئے شاعروں کے استفسارات قدیم شاعروں، ترقی پسندوں اور جدید شاعروں سے بالکل مختلف ہیں، نئی شاعری رجعت، زوال اور فرار کی شاعری نہیں ہے۔ [نئی شاعری کا گمشدہ لنک اسلوب مظاہرِ حیات کی نامیاتی کلیت کی تشکیل سے پیدا ہوتا ہے] نئی شاعری کی صورتِ حال میں آدرش اور مفروضے کی جگہ انسان نے لے لی ہے۔ نئی شاعری میں ادراک اور اظہار کا اسلوب استعاراتی اور محاکاتی ہے۔ نئی شاعری میں لفظ و معانی کی ثنویت نہیں ہے۔ [نئی شاعری نے زبان کے عمل کو وسیع کر کے ساری عصری زندگی پر محیط کیا ہے] [نئی شاعری میں جذباتی ہیئتیں بے ہیئتی کا تجزیہ ہیں] نیا شعری افق میں نئے عہد کے رومانوی کرب، انسانی بے بسی خوف و مرگ، تنہائی، ویرانی، اذیت پسندی، اکتاہٹ محرومی۔ میکانکی ماحول کی بوقلمونی، تشدد، روایت شکنی، سماجی ناہمواری، تنسیخ آدمیت، منافقت، ریاکاری، ہزیمت، کنفیوژن، بحران، انتشار، طمع، جبر، تشکیک، مایوسی، دہشت پسندی، جرائم زدگی، فلسفیانہ تحقیقات، جد و جہد، عدم ابلاغ، سیاسی انارجزم، تہذیبی تصادم، جذباتی اور روحانی ادبار، اُداسی، ناساعد ماحول، لاحاصلی، جنون، خواہشِ انقلاب، اور اس قسم کے دیگر مسائل کی نفسیاتی اور فکری تحقیق بھی کی گئی ہے اور مخصوص شاعروں کے پس منظر میں ان کے معانی کا حدودِ اربعہ بھی دریافت ہوا ہے۔

'شعری لسانیات' انیس ناگی کی معرکتہ الآرا تنقیدی کتاب ہے۔ اس میں شعری زبان کی عملیاتی اور تخلیقی ایکسپلوریشن کی گئی ہے۔ عہدِ جدید میں لسانی امکانات کے جو جو نئے منطقے منظرِ عام پر آئے ہیں انیس ناگی نے ان پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے شاعری اور لسانیات کے باہمی رشتوں کی موثر ترین صورتوں کی آئینہ بندی کی ہے۔ فلسفہ اور نفسیات کے نئے دبستانوں کی لسانی تحقیقات، علم المعانی کی نئی وضاحتیں، تجربیت پسندوں اور منطقی اِثباتیت پسندوں کی لسانیاتی موشگافیاں، الفاظ کا اینتھروپولوجیکل تناظر اور شاعرانہ وسائل اظہار کا کلاسیکی ٹریٹمنٹ انیس ناگی کی اس کتاب میں ان سب حوالوں سے زبان کی تفتیش ہوئی ہے۔ عمومی لسانی ادراک اور شاعرانہ لسانی ادراک کی تفریق، اشارہ، استعارہ اور علامت میں فرق، لغاتی معانی اور استعاراتی معانی کے خصائص، مشابہتی رشتوں اور منطقی استدلالوں کا بُعد، معانی کی تسخیر اور معانی کی محکومی کا تنازعہ، شاعری میں محاکاتی معانی اور ریاضیاتی معانی کی توجیہات۔ تشکیل معانی اور مہمل نویسی میں امتیاز، شاعری اور سیاق و سباق کا معاملہ، ابہام، افہام اور ابلاغ کی حقیقتیں، لسانی آہنگ کا جوہر اور اس قسم کے دیگر اَن گنت اہم مسائل اس کتاب کا موضوع ہیں۔ ان مسائل پر قلم آرائی کرتے ہوئے انیس ناگی نے ارسطو، کالرج، برگساں، کیسرر، سوسن کے لنگر، آئی اے رچرڈز، نارتھ روپ فرائی، ہربرٹ ریڈ،

ازرا پاؤنڈ، برٹرنڈ رسل، اوگڈن، پال والیری، وٹگنسٹین اور رابرٹ سکیلٹن وغیرہ کے نظریات کی جانچ پرکھ بھی کی ہے اور اپنے تھیسس کو ثابت کرنے کے لیے ولی، درد، انیس، اقبال، ن۔م۔ راشد، فیض، محمد صفدر، منیر نیازی، عباس اطہر، زاہد ڈار اور سلیم شاہد کی شعری تخلیقات کے تجزیاتی مطالعے سے بھی استفادہ کیا ہے۔ انیس ناگی کا کہنا ہے (عمومی لسانی ادراک اشاروں کی بدولت کیا جاتا ہے اور تخلیقی لسانی ادراک انھیں اشاروں کو استعاروں میں منتقل کرنے سے جنم لیتا ہے) (استعارہ معانی کی مرکب شکل ہے جو اشارہ کی تحویلی یکتائی SIN-GULOR REFERENCE) کو مسترد کرتی ہے) لغاتی معانی اشیا کا معنوی تعارف، مفرد، برائے ترسیل، سیاق و سباق کے تابع، الفاظ کے اساسی تصور، زبان کی بنیادی تشکیل، براہِ راست افہام کا صیغہ، تراشیدہ دہقان کی مانند اور رویّے سے عاری ہوتے ہیں۔ استعاراتی معانی زندگی کے پیچ و خم سے معمور، مرکب، معنوی ہیئتوں کے خالق، تخیلی اظہار کی بنیاد، بذاتِ خود سیاق و سباق، الفاظ کے غیر اساسی تصور پر مشتمل، تصوراتی اور فنی تشکیل میں معاون، بالواسطہ افہام کا پروسس، متمدن شہری کی مانند اور رویوں سے لبریز ہوتے ہیں۔ (استعارہ ناقابلِ حصول معانی کا حصول ہے۔ مجاز نہیں حقیقت ہے۔ وسیلہ نہیں مقصود بالذات ہے۔ حقیقت کی تشکیل حقیقت کی تجسیم ہے۔ زندہ حقیقت انسانی استعارہ ہے۔ زندہ استعارہ زندگی کی معرفت ہے۔ استعارہ معرفت اور آگاہی کی لسانی تشکیل ہے) انیس ناگی کی یہ کتاب جہاں علمی اور فنی بصیرتوں کا سراغ ہے وہاں اس کی مدد سے نئی شاعری اور نئے ادب کی اَن گنت مخفی صلاحیتوں کی شناخت بھی کی جا سکتی ہے۔ اس بے مثال کاوش نے ہمیں انیس ناگی کے شعور کی وسعتوں سے متعارف کروایا ہے۔

'تصورات' انیس ناگی کی تنقیدی بصیرتوں کا ایک اور اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں نظریاتی اور عملی تنقید کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ ۲۰ مضامین پر مشتمل یہ کتاب انیس ناگی کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہے اس میں اصولی مضامین بھی ہیں اور انفرادی مطالعے بھی نئی ادبی تحریکوں کا جائزہ بھی ہے اور بین الاقوامی ادبی تناظر کی تفصیل بھی،۔ اصولی مضامین میں نثری نظم یا شاعری۔ نثری نظم اور بے ہیئتی، شاعر اور آوارہ گردی، ادب اور تہذیبی جمود، نیا افسانہ ایک دعوت نامہ، دانشور کون ؟ اور ترجمے کی ضرورت جیسے بلند پایہ مضامین شامل ہیں۔ اقبال، مجید امجد، فیض احمد فیض، انور سجاد، ظفر اقبال، ایریکا جونگ، ایذرا پاؤنڈ، اور پابلو نرودا، کی تخلیقات کے جائزے پر مشتمل عملی تنقید کا حصہ قارئین پر غور و فکر کے روشن باب کھولتا ہے۔ انیس ناگی کی اس کتاب میں پیکاسو کی مصوری پر بھی ایک مضمون دستیاب ہے اور نئے افریقی لحن کی تلاش بھی کی گئی ہے۔ تصورات میں انیس ناگی کے تشکیل کردہ خیالات کا اجمالی خاکہ کچھ یوں ہے۔ نثری نظم عروضی پیرایے سے منحرف، مروجہ قوافی اور ردیفوں سے علاحدہ، رسمی شعری ہیئت سے آزاد، مصرعوں کی نئی تشکیل سے مزین، غیر منطقی، غیر تجزیاتی

اور غیر تجریاتی نثر کی حامل، غیر افادی نثر کی قائل، استعاراتی پیرایے کی دلدادہ، زبان کے بہاؤ کی ایک شکل ہے (نثری نظم ایک بے مہار لفظی انتشار ہے۔ ذہنی بے بصری ہے یہ شاعری کے محاذ پر سپر لینگویج کی تخلیق کا امکان مہیا کرتی ہے اور اپنے نتیجے کے طور پر صوت و معانی کی عمارتوں کو منہدم کرتی ہے) انیس ناگی کے نزدیک نئی تنقید کو سماج میں نئے خیالات کی تولید کرنا ہے۔ تخلیقی رجحانات سے نئی تبدیلیوں کو جنم دینا ہے۔ تہذیبی انتشار میں ترتیب کی نشان دہی کرنی ہے۔ پسماندہ معاشرے میں استحصالی قوتوں کے سدِ باب کا سوچنا ہے اپنے کلچر کے مسائل پر غور کرتے ہوئے انیس ناگی کا موقف ہے (ہمیں اپنے کلچر کے تشخص کے لیے اپنے ماضی کا انتخاب کرنا ہے۔ اپنے حال کی ضرورتوں کو متعین کرنا ہے اور اپنے مستقبل کے معاشرے کے لیے ہر سطح پر اپنی کارکردگی کا جائزہ لینا ہے۔ اپنے رسوم و رواج اور مذہبی اقدار کو ایک نئی معاشرتی معنویت سے ہمکنار کرنا ہے) انیس ناگی نے 'دانش ور کون ہے' کے عنوان کے تحت جو مضمون لکھا ہے اس میں ایک کو مسٹڈ دانش وری کو دانش وری کے زمرے میں شامل کیا ہے۔ دانشوران کے نزدیک تصورات کا خالق ہے۔ موجود سماجی تصورات کی تشریح سے نئے تصورات کو جنم دیتا ہے۔ نئے سوال اٹھاتا ہے اور عصری صورتِ حال سے آگاہ ہوتا ہے۔ نئے دانش ور کو نئے مخصوص انسان اور اس کے مسائل سے متعارف ہونا ہے۔ 'تصورات' میں انیس ناگی نے اردو افسانے کی تازہ ترین صورتِ حال کو بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ ان کے خیال میں نئے افسانہ نگار رومانوی اسلوب کے نرغے میں ہیں اور سعادت حسن منٹو کے تخلیقی افسانوں کے بعد اردو افسانے کو جو سفر طے کرنا تھا اس میں کوتاہی ہوئی ہے۔ نیا افسانہ نگار قصہ نویسی کے فن کو فراموش کر چکا ہے۔ اس کی تخیلہ محدود ہے اور وہ قاری میں تحیر اور اشتیاق کا ردِ عمل پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ ناگی نے اپنے اس مضمون میں انتظار حسین، انور سجاد اور خالدہ حسین کے فنِ افسانہ نگاری کی تحسین کی ہے۔ جدید اردو افسانہ اگر علامتی افسانہ ہے تو ناگی کی تجویز یہ ہے کہ اس کے ڈھانچے اور لسانی پیرایے کو یکسر تبدیل کرنا چاہیے۔ اسے تمدنی اور عصری ضروریات کے تحت منظم ہونا چاہیے۔ 'تصورات' میں 'ترجمے کی ضرورت' کے عنوان سے جو مضمون درج ہے اس میں کہا گیا ہے کہ سماج میں جب سوچ کے دھارے سست ہو جائیں اور نئے نظریات اور جذباتی پیرایوں کی تشکیل کا عمل رک جائے تو ترجمے کے وسیلے سے اس قسم کا جمود ختم کیا جا سکتا ہے تراجم انسانی کلچر، مزاج اور تاریخ کی دریافت اور شناخت کا موثر ذریعہ ہیں ترجمے یک طرفہ نہیں ہونے چاہئیں ہر زبان کے ادب کے تراجم لازمی ہیں۔ 'شاعری اور آوارہ گردی' اس مضمون میں انیس ناگی کا موقف ہے کہ آوارہ گردی اور جہاں گردی شاعروں کے لیے ضروری ہے تا کہ وہ فطرت کے بوقلموں تماشوں سے استفادہ کر سکے۔ اپنے خطے سے باہر کے ملکوں کو جان سکے دوسرے علاقوں کے عوام سے جغرافیائی اور لسانی رابطہ قائم کر سکے محض تخیلاتی اور تصوراتی تجربوں سے دامن چھڑا سکے۔ انفرادی مطالعوں کے حصے میں مجید امجد کے بارے میں ناگی کا

خیال ہے (مجید امجد کی تیرگی مقدر کی جبریت، نارسائی اور عدمِ گویائی سے عبارت ہے کہ وہ ایسے ناہموار عہد کا باشندہ ہے جو انسانی رشتوں کی بنیاد طبقاتی تفرقات پر اٹھاتا ہے) اقبال کے سلسلے میں ان کی رائے ہے اقبال کی شاعری اردو شاعری کے مجموعی اسلوب سے انحراف کی شاعری ہے، مربوط نظری شاعری ہے مروجہ علامتوں کا مزاج بدلتی ہے نئی علامتوں کی خالق ہے اردو شاعری کو ہر نوع کے اظہار کے لیے ممکن بناتی ہے۔ شعر اور عدم شعر کی حدِ فاصل ختم کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیتی ہے۔ جستجو اور اضطراب اقبال کی سرشت میں تھا۔ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ اور موجود موقعیت پر اظہارِ خیال ان کا مطمحِ نظر تھا۔ نئے نظامِ اخلاق کی ترتیب دیتے ہیں۔ سامراج دشمن ہیں۔ اقبال کے ضمن میں سلیم احمد کی مفروضاتی تنقید کو انیس ناگی نے رد کیا ہے اور سلیم احمد کے طریقِ تنقید کو پیش پا افتادہ کہا ہے اور لکھا ہے (سلیم احمد نے اقبال کے ان تمام تصورات اور منظومات کو نظرانداز کر دیا ہے جس کا تعلق سرمایہ محنت اور زندگی کے جدلیاتی عمل سے ہے)

انور سجاد کے افسانوں پر انیس ناگی نے ایک تجزیاتی مضمون سپردِ قلم کیا ہے جو ادا ہے کے افسانوں کو وجودی صورتِ حال کے افسانے قرار دے کر انھیں عہدِ حاضر کے تضادات کے نقیب افسانے کہا ہے، اس مجموعے میں آفاقی سیاق و سباق، تکنیکی تنوع، سوریلی طریق کار، تجرید کا غلبہ، جذباتی شدت سے پیدا شدہ امیجز، نے انیس ناگی کو متاثر کیا ہے۔ لیکن استعارے کے افسانے ان کے نزدیک ساختہ، کلفت زدہ، غیر حقیقی اسلوب کی پیداوار ہیں۔ ناگی کا یہ بھی خیال ہے (انور سجاد کی دیکھا دیکھی ہندوستان میں بلراج مینرا اور پاکستان میں رشید امجد نے بھی اس اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی ہے) بوڑھے شاعر کا المیہ فیض احمد فیض کی شاعری پر متشددانہ تنقید کا حامل مضمون ہے فیض کی نئی کتاب "شام شہر یاراں" میں انیس ناگی کو فیض تساہل پسند اور نئے موضوعات سے عاری شاعر نظر آئے ہیں۔ فیض ان کے نزدیک محدود شاعری کے کامیاب شاعر ہیں" شام شہر یاراں کی نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیض کے ہاں (مطالعے کی کمی ہے نئے تجربات کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور ہر دو کے نتیجہ کے طور پر ان کا لسانی اسلوب اپنے عہد کے لسانی رویوں سے ہم آہنگ نہیں ہے) ظفر اقبال کی کتاب "رطب و یابس" ناگی کے بقول ردِ عمل پیدا کرنے والی کتاب ہے ظفر اقبال انھیں مروجہ غزل کے اسلوب سے غیر مطمئن نظر آئے ہیں۔ ظفر اقبال کو انیس ناگی نے جرأت مند شاعر کہا ہے (وہ زندگی کے عقائد، اقدار اور انسانی تعلقات کے مسلمات سے منکر ہے) اریکا یونگ کی نظموں پر مرقومہ مختصر مضمون میں انیس ناگی نے انھیں (معنویت سے لبریز چونکا دینے والی نظمیں کہا ہے) یہ نظمیں اندرونی آزادی کی نظمیں ہیں اور ایک بے باک شاعرہ کی تخلیقات، ایریکا کی شاعری براہ راست اسلوب ہے اور استعاراتی پیرایے سے گریز کیا گیا ہے۔ ان کی نظمیں ناگی کے بقول جنسی وارفتگی کی بجائے جذباتی ہسٹیلزم کا شکار ہیں اس مضمون میں ایریکا کی آٹھ نظموں کے ترجمے بھی درج ہیں، ایذرا پاؤنڈ پر انیس ناگی کا مضمون اس عظیم شاعر کے کارناموں سے اردو قارئین کو متعارف کرواتا ہے۔ پاؤنڈ ناگی کے

بقول (امریکیت سے بھاگا ہوا لٹھ باز امریکی شاعر تھا جو اپنی بات کہنا اور منوانا جانتا تھا) پابلو نرودا کی تلاش انیس ناگی کے ویژن کے پھیلاؤ اور گہرائی کا مظہر ہے اس میں انھوں نے نرودا کی شخصیت کے پیچ وخم اور فن کے اتار چڑھاؤ کو مائیکروسکوپک نظر سے دیکھا ہے۔ نرودا کی جنوبی امریکہ سے محبت اور نظریاتی کومٹ منٹ کے تحریری ثبوت مہیا کیے ہیں۔ ’نیا افریقی لحن‘ افریقہ کی جدید شاعری پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے افریقی شاعری، شاعری اور زندگی کے قرب کی عظیم شاعری ہے۔ سیگنھور کریویدینا، ڈیوڈ ڈیوپ، رابرویلو گبریل ادکار کی شاعری کے حوالے سے افریقی شاعری کے لینڈ سکیپ کی توضیح کرتے ہوئے ناگی کا کہنا ہے۔

افریقی شاعری انقلابی جد وجہد کی شاعری ہے یہ سفید فام نسل کے خلاف سیاہ فام مظلوم نسل کا احتجاج ہے یہ عظمت اور آزادی کی شاعری ہے۔ اس شاعری پر فرانسیسی علامتی شاعری کے خاصے اثرات ہیں۔ ’تصورات‘ میں ایک مضمون پابلو پکاسو کی شخصیت اور مصوری کی وضاحت کے لیے بھی شامل کیا گیا ہے (وہ تجربات جو پکاسو کی متخیلہ کو حرکت دیتے ہیں ان میں انسان اور انسانی حقیقتیں بنیادی حیثیتیں رکھتی ہیں) پکاسو نے کولیج، لتھوگرافی، پنسل ڈرائنگ، ظروف سازی اور مجسمہ سازی کے ذرائع سے بھی اپنے نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے (وہ عدم تناسب سے تناسب تشکیل کرتا ہے)۔

تصورات ’انیس ناگی‘ کا ایسا تنقیدی مجموعہ ہے جو ان کی کومٹ منٹ کا نقیب بھی ہے اور ان کے نظری مسائل کا مفسر بھی۔ انیس ناگی نے اپنے ہر مضمون کو انسان اور اس کے ارد گرد کے ماحول اور معاصر حقائق کے تناظر میں ترتیب دیا ہے۔ یہ مضمون انیس ناگی کو آزادی پسند، فسطائیت دشمن، مساوات کا جویا اور شعور کا متلاشی ثابت کرتے ہیں، انھوں نے اپنے عہد کی سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی صورت حال کا کھلی نظروں سے احاطہ کیا ہے اور دانشوروں کو ان کے حقیقی مناصب سے آگاہ کرنے کا جتن کیا ہے۔ یہی نہیں یہ مجموعہ انیس ناگی کی فنی بصیرتوں اور تکنیکی مہارتوں کا عمدہ مرقع ہے۔ میرے نقطۂ نظر کے مطابق کہیں کہیں معاصر نقادوں کا جائزہ لیتے ہوئے انیس ناگی افراط وتفریط کا شکار ہوئے ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ مضامین اردو تنقید کے درخشندہ باب کی نشان دہی ہیں۔ ان کتب کے علاوہ انیس ناگی نے اپنے شعری مجموعوں کے آغاز میں بھی کچھ اصولی مباحث رقم کیے ہیں اور تراجم کے آغاز میں بھی بیش قیمت پیش لفظ ترتیب دیے ہیں۔ راں بو کی شاعری پر ان کا نوٹ اور سینٹ جان پرس کی نظموں پر ان کی خامہ فرسائی اردو قارئین کے لیے خاصے کی چیزیں ہیں اس کے علاوہ انھوں نے جدید اردو نظموں کے ترجموں پر مشتمل ایک کتاب (MODERN URDU POCMS FROM PAKISTAN) کا پیش لفظ بھی تحریر کیا ہے۔ سیسیفس کی کہانی میں البرٹ کامیو پر ان کا ایک پر مغز مضمون شامل ہے۔ انیس ناگی کو فرانسیسی زبان سے خصوصی لگاؤ ہے اور MYTH OF SYSIPHUS کا ترجمہ ان کے اس لگاؤ کی کھلی دلیل ہے۔ انیس ناگی نئی تنقید کا قابل قدر اثاثہ جمع کر چکے ہیں۔ ابھی ان کا ارتقائی سفر جاری ہے۔ اردو قارئین کو ان کے قلم سے اور بھی متنوع قسم کے عطیات ملنے کی توقع ہے ان کی تنقیدی تخلیقات بلاشبہ اردو تنقید کی کم مائیگی کو ختم کرنے میں معاون ہیں۔

سکندر علی وجد

ایلورا

مئے خیال ہے سنگین آبگینوں میں
دلوں کا سوزِ نہاں، پتھروں کے سینوں میں
چھپائے نورِ ازل بُت ہیں آستینوں میں
حیات جذب ہے ان بے شکن جبینوں میں
یہاں جو سیر کو فکرِ رسا نکلتی ہے
وفورِ شوق میں پربت کی سانس چلتی ہے
عیاں ہیں عرصۂ ہستی کے سب نشیب و فراز
ہوئی ہے روئے حقیقت سے دور گردِ مجاز
ملی جو ذوقِ عمل کو خیال کی پرواز
نشاطِ کار نے کر دی حیاتِ کار دراز
کمندِ گردشِ ایام کے اسیر نہیں
نقوشِ دستِ عقیدت فنا پذیر نہیں
عظیم عزم تھے جانباز نقش کاروں کے
خزاں کی فکر، نہ ارمان تھے بہاروں کے
دلوں میں خواب تھے بیدار کوہساروں کے
نظر عقاب کی، تیشے تھے برق پاروں کے
تصورات کے پیکر تراش ڈالے ہیں
دیے وہ دل جو ہمیشہ دھڑکنے والے ہیں

بنائی تیشہ وروں نے خیال کی دُنیا
کھلی ہوئی ہے عروج و زوال کی دُنیا
جنوں نواز جلال و جمال کی دُنیا
رہینِ محنتِ ماضی ہے حال کی دُنیا
نجوم ڈوب گئے جلوۂ سحر کے لیے
ہوا ہے خونِ دل اس جنتِ نظر کے لیے
نگار خانۂ عالم کا عکس یہ وادی
ہزار حشر بداماں خموش آبادی
ہنروروں کو تھی عرضِ ہنر کی آزادی
یہاں نہیں ہے کوئی نقش نقشِ فریادی
غلامِ مرضیِ حالات حُسنِ کار نہیں
کمالِ فکر کے شہکار، اشتہار نہیں
سکونِ روح اِس آغوشِ کوہسار میں ہے
یہ زندہ خواب کسی چشمِ انتظار میں ہے
زمامِ شام و سحر دل کے اختیار میں ہے
زمانہ محو یہاں جستجوئے یار میں ہے
نگاہ ڈھونڈ رہی ہے، نشاں نہیں ملتا
غبار سامنے ہے کارواں نہیں ملتا

سکندر علی وجد

مزدوروں کا پیغام

طلبائے جامعۂ عثمانیہ کے نام

(جامعۂ عثمانیہ کے آرٹس کالج کی حسین اور شان دار عمارت بنانے والے مزدوروں کو کام ختم کرکے آخری بار جاتے ہوئے دیکھ کر یہ اشعار فی البدیہہ کہے گئے تھے)

نونہالانِ چمن اہلِ ہنر جاتے ہیں
جوش زن قلب میں ہے شوقِ سفر جاتے ہیں
صورتِ خاک رہے مثلِ شرر جاتے ہیں
یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ کدھر جاتے ہیں
لو چلا قافلۂ کوہ کن خانہ بدوش
کل سے ہوجائیں گی تیشوں کی صدائیں خاموش

ہم کو آجر سے شکایت ہے نہ قسمت کا گِلا
مُلہمِ غیب سے ہر وقت یہی درس مِلا
صبر کی سان پہ ہوتی ہے طبیعت کی جِلا
ہر بڑے کام کی تکمیل ہے خود اُس کا صِلا
دل سے نکلا ہے یہ پیغام جگرداروں کا
عزمِ سرشار ہی خلاق ہے شہکاروں کا
جوش و اخلاص سے کی کوششِ پیہم ہم نے
نظم کہسار کیا درہم و برہم ہم نے
کوہِ غم ٹوٹ پڑے پر نہ کیا غم ہم نے
کر دیا علم کا اک خواب مجسّم ہم نے
ہم نے نقشِ ہوسِ خام نہیں چھوڑا ہے
کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

OO

اشعار

ہوی عشق میں زندگی رائگاں
مزہ زندگی کا مگر مل گیا

رونے والے یوں مصیبت پر نہ رو
زندگی اک دردِ سر ہوجائے گی
بعد تعمیرِ مکاں، زنجیرِ غم
الفتِ دیوار و در ہوجائے گی
لا دلیلِ عشق و مستی درمیاں
ختم بحثِ خیر و شر ہوجائے گی

ان کے جلوہ کا جب آتا ہے خیال
خود بخود آنکھ جھپک جاتی ہے

فسانہ زندگی کی ہر حقیقت
حقیقت اک محبت کا فسانہ
ادائے دل نوازی کچھ نہیں ہے
محبت ڈھونڈ لیتی ہے بہانہ

شوق کی نکتہ دانیاں نہ گئیں
رات بیتی کہانیاں نہ گئیں
نقش بن بن کے رہ گئیں دل میں
سرسری نوجوانیاں نہ گئیں

جب نگاہِ لطفِ ساقی پھر گئی
ترکِ شغلِ جام و مینا چاہیے

روز ہمراہِ سحر تیرے تبسم کا خیال
موجِ دریا کی طرح مستِ خرام آتا ہے
لرزشِ تارِ نفس کیوں ہے دل آویز بہت
آج شاید تری آمد کا پیام آتا ہے

جانے والے کبھی نہیں آتے
جانے والوں کی یاد آتی ہے

ساحل نے تو سُن لی موجوں سے آلامِ دلِ دریا کی خبر
اب کوئی دلِ دریا کو بھی مانوسِ غمِ ساحل کردے

انتہائے سخن ہے خاموشی
ابتدا ذوقِ خوش نوائی ہے

پاس کچھ بھی نہ رہا دیدۂ پُرنم کے سوا
اب کوئی کام نہیں دل کو ترے غم کے سوا

جہاں حد ہے احساس اور آگہی کی
وہیں تک خودی ہے وہاں سے خدا ہے

کل تک مجھے تیری جستجو تھی
آج احسن کو خود اپنی جستجو ہے

کن مراحل سے گزرتے ہیں اسیرانِ ستم
رات زنداں میں تو مقتل میں سحر ہوتی ہے

ایسے روٹھے روٹھنے والے
روٹھ گیا سمجھانے والا

دل کے گلشن میں ہے وہ سروِ رواں
جس کی رفتار میں گفتار ملے

آ گئی اک مہک سی خاروں میں
گُل نے کیا زندگی گزاری ہے

فضا بے کیف ہے اے جانِ محفل
زرا اک غمزۂ ترکانہ ہو جائے
ترے جلوے بصیرت بخشتے ہیں
کوئی کم ظرف کیوں دیوانہ ہو جائے

بے خودی کام آئی رہِ درد میں
چشمِ بیدار سنگِ گراں بن گئی

یہاں پرواز کے آداب سیکھو
اسیری تربیت ہے بال و پَر کی

ساحل کی تلاش ناخدا کو
طوفاں کو تلاش ناخدا کو

تیری دوری سے ہے خالی خالی
وقت بے برگ و نوا ہو جیسے

ہمہ تن چشم و گوش رہتا ہوں
جانے کس وقت کیا پیام آئے

ہجر میں اور کچھ تو کر نہ سکے
ہم نے تاروں سے شب کی مانگ بھری

چمن اداس ہے سارا تری خموشی سے
قفس نصیب چہکنا تو اختیار میں ہے

نگاہِ لطف میں ہے صبح کا سہانا پن
نشاطِ موسمِ گل بوئے زلفِ یار میں ہے

شباب موسمِ گل میں بھی یہ کلی نہ کھلی
حیات کس کے تبسم کے انتظار میں ہے
چمن اداس ہے سارا تری خموشی سے
قفس نصیب، چہکنا تو اختیار میں ہے

روشنی کن کو یاد ہے ان کی
چاندنی میں بہت چراغ جلے

بڑھ گیا اور شوق پروانہ
اب اندھیرا نہیں چراغ تلے

جو مروت میں مرنے کو تیار ہے
کیا کرے گا محبت اگر ہو گئی

مآلِ جذبۂ تکمیل آج تک نہ کھلا
عجیب چیز تھی دُھن آشیاں بنانے کی

صہبا دل کے درد کا درماں
نغمہ روح کے زخم کا مرہم

مُغنی تبسّم

حسرت کی غزل گوئی کے چند پہلو

حسرت کی فن کارانہ حیثیت کو متعین کرتے ہوئے شاید ہم انھیں اردو کے عظیم شاعروں میں جگہ نہ دے پائیں پھر بھی ان کے اسلوب کی محدود لیکن منفرد دل کشی اور اردو غزل کو ایک نئی جہت دینے اور اس کے احیا کے سلسلے میں حسرت کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اردو غزل کو حسرت کی جو کچھ دین رہی ہے اُسے جاننے کے لیے حسرت کے تخلیقی رویّے کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ شاعری حسرت کے لیے وسیلۂ اظہار ہونے کے علاوہ پیرایۂ اظہار سے لُطف اندوز ہونے کا ایک ذریعہ بھی تھی۔ ان کے کلام کا ایک معتد بہ حصّہ سخن سے زیادہ "مشقِ سخن" کی ذیل میں آتا ہے۔ ان کی بہت سی غزلیں قیدِ فرہنگ کے زمانے کی تصنیف ہیں۔ حسرت نے اپنے دیوان کا حصّہ ہفتم ایامِ قید میں صرف گیارہ دن میں مرتب کیا تھا۔ ایک دن میں وہ چار پانچ غزلیں کہہ لیا کرتے تھے۔ یوں بھی ہوا ہے کہ ایک ہی ساتھ کئی زمینوں میں انھوں نے غزلیں کہنا شروع کیں اور تین چار دن میں انھیں مکمل کر لیا۔ دیوان کی تکمیل کے لیے وہ حروفِ ابجد میں سے ہر حرف پر ختم ہونے والی ردیف یا قافیے (اگر غزل غیر مردّف ہو) میں غزل کہنے کی کوشش کرتے۔ حسرت کو نئی زمینیں اختراع کرنے اور مشکل ردیف و قوافی باندھنے کا بھی شوق تھا اور صنعت نگاری سے بھی دلچسپی تھی۔ حسرت نے اپنی پُرگوئی اور کمالِ فن کا اظہار جس طرح کیا ہے اس کا نمونہ یہ اشعار ہیں:

فرقت میں تیری ہیچ ہے شانِ شبِ برات
اک آگ سی لگی ہے بجانِ شبِ برات

کیوں نہ مقبول ہو دعائے خلوص
کہ اثر خود ہے خاکِ پائے خلوص

کچھ نہ ابدال سے پہنچا ہے نہ اوتاد سے فیض
جس کو پہنچا ہے سو پہنچا ہے تری یاد سے فیض

سرورِ دلِ عاشقاں ماہِ خوبی
شہنشاہِ خوباں ہے وہ شاہِ خوبی

امیدِ انتظار سے ہرگز نہ آئے باز
ہم شوقِ لطفِ یار سے ہرگز نہ آئے باز

اک بار بس گیا جو کبھی ان کی باس میں
خوش بوئے حسن برسوں رہی اس لباس میں

تجھ سے جو دردِ دل کا بھی ہوتا نہیں علاج
ہے کس مرض کا اور تو اے نازنیں علاج

قافیہ پیمائی اور صنعت نگاری کے شوق نے ان سے ایسے بھی اشعار کہلوائے ہیں جن پر محض تک بندی کا اطلاق ہوتا ہے مثلاً

ان کی تحریرِ خام بھی ہے عزیز
کہ نہیں ہم کو خوش خطی سے غرض

بیکار تھی ململ بھی گرمی میں شبِ فرقت
کام آئیں گی جاڑوں میں فردیں جو لحافی ہیں

ہے مجھے کافی تبسم اس نگاہِ ناز کا
ہو رقیبوں کو مبارک قاہ قاہِ التفات

اونچا ہوا ہے اور بھی کچھ آشیانِ حسن
کھولے ہیں جب سے مرغِ تمنا نے بال و پر

لیکن خود حسرت کے قول کے مطابق ایسی غزلیں اور اشعار بھی بے لطف و بے رنگ نہیں ہیں۔ یہ اشعار اگرچہ حسرت کے اس رنگِ سخن کی نمائندگی نہیں کرتے جس کی بنا پر ان کا شمار اردو کے معتبر غزل گو شاعروں میں ہوتا ہے لیکن ان سے تخلیقِ شعر کے ایک مخصوص رویے کی نشان دہی ہوتی ہے جس میں شاعر کسی خارجی یا داخلی تحریک سے مجبور ہو کر شعر نہیں کہتا بلکہ محض شعر کہنے کے ارادے سے شعر کہتا ہے۔ بیش تر یوں ہوتا ہے کہ الفاظ شاعر کو مضمون سجھاتے ہیں۔ کبھی کوئی لفظ تخیل کو مہمیز دیتا ہے اور فکرِ شعر کے دوران شاعر لاشعور کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جس کے نتیجے میں کوئی داخلی کیفیت یا تجربہ معرضِ اظہار میں آجاتا ہے۔ حسرت موہانی کے کلام کا ایک قابلِ لحاظ حصہ جذبات کی شدت سے خالی ہے تو اس کا سبب فکرِ شعر کے وقت شعور کی بیداری ہے۔ اس تخلیقی رویے میں حسرت کے مزاج کا بھی دخل رہا ہے۔ عام زندگی میں حسرت ایک جذباتی انسان رہے ہیں۔ وہ جذبات سے مغلوب بھی ہو جایا کرتے تھے لیکن شکست، محرومی، مایوسی اور رنج و الم کے جذبات کا اظہار ان کے مزاج منافی تھا۔ حسرت کے مزاج کی اس خصوصیت کا اندازہ دیوان کے حصۂ ہفتم کے دیباچے کی اس تحریر سے لگایا جا سکتا ہے

" یہ کل غزلیں اس زمانے میں لکھی گئیں جب کہ فقیر پر حکومت کی جانب سے ایک دوسرا مقدمہ چلایا جا رہا تھا مگر اس کے سبب سے انشاءاللہ تعالیٰ کہیں پریشانیٔ خیال کے نمونے نظر نہ آئیں گے۔" شاعری میں بھی غلبۂ درد کو وہ اہلِ سخن کی روش کے خلاف سمجھتے تھے۔

غلبۂ درد ہیں درد سراپا اشعار
یعنی ہم پیرویِ اہلِ سخن بھول گئے

حسرت کے مزاج میں جو ضبط اور استقلال تھا وہ ان کے شعری اظہار پر بھی اثر انداز ہوا ہے حسرت کے ان اشعار میں بھی جن کی تخلیق میں داخلی تحریک کارفرما رہی ہے جذبات کا برملا اظہار بہت کم ہوا ہے۔ ان میں جذبے کی دھیمی آنچ ضرور محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنی کیفیاتِ نفس کو اشاراتی انداز میں پیش کرتے ہیں اور کہیں محض لہجے ہی سے ان کے جذبات نمایاں ہو جاتے ہیں۔ حسرت اپنے افسانۂ غم اور داستانِ ہجر کو بھی کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں جیسے یہ کسی اور کی کہانی ہو اور تاثر یہ دیتے ہیں جیسے سخت سے سخت مصیبت بھی ان کے لیے کوئی چیز نہیں ہے۔

خود آزاریت کی یہ وہ منزل ہے جہاں ہر ایذا سامانِ راحت فراہم کرتی ہے[۱]۔ چنانچہ وہ شر میں بھی خیر کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ اس رویے کی وجہ سے حسرت کی شاعری میں حزن و ملال کی کیفیات پر ان کی جمال پرستی غالب آگئی ہے۔ وہ ہر وقت حسن و جمال کی لذت سے سرشار نظر آتے ہیں اور ان کے لہجے میں ایک والہانہ کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ حسرت کی بیشتر غزلوں میں بندشِ الفاظ، بحر کے انتخاب اور ردیف و قوافی کی تنظیم سے جو نغمگی پیدا ہوتی ہے وہ اسی کیفیت کی آئینہ دار ہے۔ اس نقطۂ نظر سے حسرت کی شاعری کا صوتی آہنگ مستقل مطالعے کا موضوع بن سکتا ہے۔ یہاں میں چند غزلوں کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہوں گا جن کا نغمہ اور لہجہ اس خاص کیفیت کا حامل ہے:

دل کو تری دزدیدہ نظر لے کے گئی ہے
اب یہ نہیں معلوم کدھر لے کے گئی ہے
ستم ہو جائے تمہیدِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے
محبت میں بتا اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے؟

محرومِ طلب ہے دلِ دل گیر ابھی تک
باقی ہے ترے عشق کی تاثیر ابھی تک
ہم دیر سے نظارۂ خوباں میں لگے ہیں
یہ پھول غضب گلبنِ خوباں میں لگے ہیں
پھر بھی ہے تم کو مسیحائی کا دعویٰ دیکھو
مجھ کو دیکھو مرے مرنے کی تمنا دیکھو
توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا، خفا ہو جائیے
عشقِ بتاں کو جی کا جنجال کر لیا ہے
آخر یہ میں نے اپنا کیا حال کر لیا ہے

ان اشعار میں حسرت نے طویل مصوتوں کی کثرت، بعض الفاظ میں ساکن مصمتوں سے قبل آنے والے مصوتے کا طول دے کر اور مصمتوں کی صوتی رمزیت سے استفادہ کرتے ہوئے لہجے اور غنائیت کو آپس میں اس طرح مدغم کر دیا ہے کہ ان کو مناسب وقفے قائم کرتے ہوئے تحت اللفظ پڑھا جائے تو مکالمے کا لہجہ ابھر آتا ہے اور اگر قرأت میں عروضی آہنگ کا لحاظ رکھا جائے تو غنائی کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ طویل اور رواں ردیفوں سے پیدا ہونے والی تکرارِ اصوات نے اس کیفیت کو دوبالا کر دیا ہے۔ حسرت کی شاعری کے صوتی آہنگ کا ایک منفرد پہلو یہ ہے کہ وہ شعر میں کسی طویل مصوتے والے لفظ کا اندراج اس طرح کرتے ہیں کہ اس کی ادائیگی میں جھٹکے کے ساتھ اونچی پینگ لینے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور طویل مصوتہ ساکن مصمتے سے قبل مندرج ہو تو یہ پینگ، بلندی پر تھم جاتی ہے۔ حسرت نے اپنی کئی مترنم غزلوں میں اسی انداز کے قافیے باندھے

۱۔ حسرت کی سیاسی زندگی کی طرح ان کی شاعری میں بھی سماجی خود آزاریت کا پہلو نمایاں ہے۔ حسرت نے اپنی اذیت پسندی کا خود بھی اعتراف کیا ہے:

لیا جب اس نے کوئی شرط اٹھا یا
مرا ایذا پسندی نے دعا دی
ہوتا ہے پر الذتِ آزار کا لپکا
مرنا بھی کہیں مجھ کو یہ دشوار نہ کر دے
شوق سے جور کیے جائیں وہ، اربابِ وفا
خوش بہرحال ہیں عیشِ غمِ پنہاں کی قسم

اس کے چند نمونے مندرجہ بالا اشعار میں پیش کیے گئے ہیں۔

مخصوص اصوات کی تکرار کا رجحان بھی حسرت کی شاعری میں ملتا ہے مثلاً

گر نظارہ رنگ بزمِ یار میں نیرنگِ عالم کا
کسی کو سرنگوں دیکھا کسی کو شادماں پایا

اس شعر میں /گ/ /ر/ اور /م/ کی تکرار اور تنظیم لائقِ توجہ ہے۔

کیا حال کہے کوئی کہ درباں کے ستم سے
آنے کی اجازت ہی نہیں آپ کے نزدیک

اس شعر میں /ک/ اور /ہ/ کا تکرر صوتی رمزیت کے ساتھ ہوا ہے۔

/ک/ کی بندشیت اس رکاوٹ کا صوتی استعارہ ہے جو محبوب سے ملاقات میں حائل ہے ک اور ہ کی صوتی کیفیات کے امتزاج سے جہاں شکایتِ محبوب کا انداز پیدا ہو چلا ہے ـ قافیہ "اجازت" کی ایک جھٹکے اور زور کے ساتھ ادائیگی گستاخ خفگی کو ظاہر کرتی ہے۔ اس طرح اصوات شعر ایک پیچیدہ نفسی صورتِ حال کی بڑی عمدگی سے تصویر کھینچ دی ہے۔

حسرت کے تصورِ عشق میں خود اذیتی کے میلان کے ساتھ محاسنِ کلام سے یہ جمالیاتی شغف ہم آمیز ہو گیا ہے بظاہر حسرت کی شاعری قدیم غزلیہ روایت کی پوری طرح پاسدار نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ حسرت نے اپنے تجربوں اور تخیل کے امتزاج سے ایک ایسی دنیا تخلیق کی ہے جو پابندِ روایت ہوتے ہوئے بھی نئی ہے۔ ان کی غزل میں عاشق اور محبوب کے کردار منفرد شخصیتیں ہیں جو روایت کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آتی ہیں۔

روایتی غزل کی طرح حسرت کا محبوب بھی ظالم اور جفا شعار ہے لیکن اس کا ستم، لگاؤ کے اظہار کا محض ایک پیرایہ ہے ـــ ایک طرزِ التفات ہے۔ بقول حسرت:

نہاں شانِ تغافل میں ہے رنگِ امتیاز ان کا
یہ اندازِ جفا ہے التفاتِ دل نواز ان کا

دوسری طرف حسرت کی غزل کا واحد متکلم ایسا حسن پرست ہے جو محبوب کے ظلم اور اس کی جفا کاری پر محض اس:
جان دیتا ہے کہ اس میں بھی ایک شانِ جمال پائی جاتی. بلکہ وہ محبوب کو تاکید کرتا ہے کہ:

ہم سے روٹھو بھی تو لازم ہے کہ اک ناز کے ساتھ
پھر بھی ہم پہ کرو ستم تو دلآویز کرو

محبوب کی جفا کاری پر حسرت نے جس جس طرح اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا ہے وہ اردو غزل کے لیے خلافِ معمول ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

اس نازنیں سے ہم کو جتنے گزند پہنچے
سب دل پذیر پہنچے، سب دل پسند پہنچے

شادماں ہو کے ترے درد سے کہتا ہے یہ دل
ہے اذیت جو یہی چیز تو راحت کیا ہے

حسرت کے خیال میں استغنا حسن کا وصفِ خاص ہے جس کی شانِ بے نیازی کے آگے جفا اور وفا عاشق کے وسوسے اور واہمے بن کر رہ جاتے ہیں۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں:

غلط ہے شکوہ سمجھی میرے عشقِ ناشکیبا کی
بجا کرتا ہے جو کرتا ہے حسنِ بے نیاز ان کا

نہ کرم غیر پہ نہ ہم پہ ستم
اس تغافل نشاں سے کچھ نہ ہوا

اس تصورِ حسن کے ساتھ حسرت کی شاعری میں رضا کا تصور ابھرتا ہے۔ عاشق کی خود سپردگی اور تسلیم کے مضامین قدیم اردو غزل میں بھی مل جاتے ہیں لیکن حسرت نے ان مضامین کو روایتی انداز میں نہیں دہرایا ہے ان کی خود آزادانہ شخصیت ایک رضا پیشہ عاشق کا روپ دھار لیتی ہے اور رضا پیشگی ان کی شاعری میں تہذیب عاشقی کا لازمہ بن گئی ہے۔ عاشق کی خود سپردگی ایذا پسندی کے جذبے کو تشفی بخشنے کے ساتھ درد کو درماں اور ستم کو کرم کا روپ دے کر عیشِ پنہاں کا سامان مہیا کرتی ہے۔

جدھر کو اب وہ چلائے وہی ہے راہِ مراد
رضائے یار سے وابستہ ہے رضا میری

ہم رضا پیشہ ہیں تاویلِ ستم خود کر لیں
کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی

رنج و راحت ہے اگر حسبِ تقاضائے مراد
اہلِ تسلیم ترے درد کو درماں کر لیں

یہ رضا پیشہ عاشق وصل سے زیادہ ہجر میں شاد رہتا ہے اور وصال و ہجر سے کہیں زیادہ کیفیتِ انتظار کا دل دادہ ہے:

ان سے مل کر شکوۂ بے اعتنائی پھر کہاں
شاد رہ اے دل کہ یہ لطفِ جدائی پھر کہاں

قرب میں ہے نہ بعدِ یار میں تھا
جو مزہ اس کے انتظار میں تھا

آنکھوں کو انتظار سے گرویدہ کر چلے
تم تو یہ خوب کا پسندیدہ کر چلے

حسرت نے حسن و کو جو مثالیت دی وہ فلاطونی تصور سے مختلف ہے۔ حسرت کا عشق ترفع کے باوجود اپنی عرضیت نہیں کھوتا۔ چوں کہ رضا بھی ایک طرزِ التفات ہے اس لیے یہ عشق یک طرفہ نہیں رہ جاتا۔ یہ ضرور ہے کہ حسن سادہ کو اپنے مطلوب بن جانے کا احساس خود بیں و خود آرا بنا دیتا ہے لیکن یہی خود آرائی چاہے جانے کی آرزو کو جذبۂ عشق میں بدل دیتی ہے۔ حسرت نے عشق کے ان فطری جذبات کی کھری اور نکھری ہوئی تصویریں بعض مسلسل غزلوں اور متفرق اشعارِ غزل میں پیش کی ہیں ان میں اردو کی قدیم غزلیہ شاعری کی روایت سے انحراف بہت نمایاں ہے۔ مثلاً یہ غزل:

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

یہ فطری رنگ ان غزلوں میں بھی جھلکتا ہے جو حسرت نے اپنی بیگم کی وفات کے بعد ان کی یاد میں کہی تھیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

دے کے جاں اپنی کیا تائبِ عصیاں مجھ کو
رنج کیا کیا نہ سہے اس نے بدولت میری

جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لیے
اب وہ حاصل ہے تو اک آزار ہے تیرے بغیر

کیا کہتے تھے حسرت ان سے کبھی قسمت میں نہ نکلے گی
حالاں کہ وہ اب دنیا میں نہیں پھر بھی ہمیں ہر شب تا ہے

لیکن حسرت کی عام شاعری میں روایت سے واضح انحراف کی ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی روایت سے ان کا انحراف بہت ہی ڈھکا چھپا ہے۔ انھوں نے عشق کے فطری جذبات اور تجربات کو قدیم غزل کی لفظیات میں معاملاتِ عشق کی تمام رسمیات کے ساتھ

پیش کیا ہے۔ رسمیات کا احترام حسرت نے یہاں تک کیا ہے کہ اپنی شاعری میں رقیب کے کردار کو بجنسہٖ برقرار رکھا ہے جب کہ ان کا محبوب ظاہری جفا کاری اور ستم شعاری کے باوجود باوفا ہے۔ رقیب کا کردار ان کی اس غزل میں بھی در آیا ہے جو انھوں نے اپنی بیگم کی وفات سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ شعر یہ ہے:

رشک باقی ہے اور نہ کوئی رقیب
نہ ضرورت کسی بہانے کی

اس قدر پابندِ روایت ہونے پر بھی حسرت کی معاملہ بندی میں ایک ندرت اور لطافت ہے اس تازہ کاری میں حسرت کی نفسیات نگاری کا بڑا دخل ہے اس کے علاوہ مثالی عشق کے یکطرفہ پن کو دور کرنے کے لیے انھوں نے واسوخت کی روایت سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان دو طریقوں سے کام لے کر حسرت نے اپنی شاعری میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کی ہے۔ معاملہ بندی سے ہٹ کر جہاں کیفیات نگاری سے کام لیا ہے داخلی محاکات کا کمال دکھایا ہے۔ ان خصوصیات کے ساتھ حسرت کی شاعری میں جو انفرادی رنگ اُجاگر ہوا ہے اس کی مثال یہ چند اشعار ہیں۔

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
گراں گزرے گا حرفِ آرزو اس طبعِ نازک پر
نگاہِ شوق اس مفہومِ رنگیں کو ادا کر دے
آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے
حالِ مجبوری دل کی نگراں ٹھہری ہے
دیکھنا وہ نگہہِ ناز کہاں ٹھہری ہے
تجھ سے اب مل کے تعجب ہے کہ عرصہ اتنا
آج تک تیری جدائی کا یہ کیوں کر گزرا
کہنے کو تو ظاہر میں خفا ہم بھی ہیں حسرت
کچھ دل کا عجب حال ہے جب سے وہ خفا ہے
مایوس نہ یوں ہوتے تو دور اگر ہوتا
ہم کچھ نہ تجھے کہتے تو دور اگر ہوتا
نگہہ دوست ہے محجوب تو ہم بھی حسرت
لب تک اب شکوۂ ہجراں نہیں لانے والے
تری دلداریوں سے صورتِ بیگانگی نکلی
خوشی ایسی بھی ہوتی ہے الم ایسا بھی ہوتا ہے

ان اشعار کا لہجہ اور اسلوب ایک ایسی شخصیت کو محوِ کلام دکھاتا ہے جو ایک جمال پرست مہذب عاشق اور شائستہ سخن طراز ہے۔ نیازمند اور خوددار حسنِ ہزار شیوہ کا دل دادہ ہی نہیں بلکہ خالقِ حسن بھی ہے۔ حسرت کا فن یکسر حسن ہے افادیت کے تصور سے عاری۔ حسرت کی شاعری تمام تر اندازِ اظہار اور شوخیِ گفتار ہے جس کو پڑھنے یا سننے کے بعد میر کا یہ مصرع زبان پر آجاتا ہے:

دیکھو باتیں تو کیا بناتا ہے

مختار شمیم

"ہم سرگرداں سرگرداں سے"

بستی بستی، کوچہ کوچہ، ڈگر ڈگر آوارہ ہم
سرگرداں سرگرداں سے ——
اس چھور سے جب اُس چھور گئے
ہر گام اندھیروں نے لوٹا
ہر راہ میں ٹھوکر کھائی ہے
ہر نقشِ قدم پر ٹوٹ گئے
ہر راہ کنارے چاند اگا تو زخم کھلا!

یہ زخمِ تمنا، زخمِ وفا
بتلائیں کسے، دہرائیں کیا!
ہے کون جو اپنا درد سنے ؟
ہے کون ؟ کہ جس سے ٹوٹ کے ہم ——
مل جائیں تو —— لمحے جاگ اٹھیں
اور وقت کے پیروں میں گھنگرو

جب.....
چھم چھم چھم چھم باج اٹھیں
دل ناچ اٹھیں !

یہ جھوٹے، سچے خواب مگر ——
آنکھیں جو دیکھا کرتی ہیں
آنکھیں جو سرابوں میں گم ہیں
آنکھیں جو بھٹکا کرتی ہیں
ہر سمت نہ جانے کس کے لیے ؟
ہر راہ نہ جانے کس کے پیچھے ؟
اچھا ہے کہ یارو اب اپنی ہر صبح دھندلکوں میں گم ہے
ہر شام سیاہی پیتی ہے !
اچھا ہے کہ اپنے سینوں پر بے مہری کی سنگینیں ہوں
اچھا ہے کہ اپنے سر پر ہم اک بوجھ ستم کا رکھ کے چلیں

اس چھور سے جب اُس چھور تلک
ہم ——
سرگرداں سرگرداں سے.....
پھر ٹوٹے قدموں جائیں گے
اک راہ نئی پھر پائیں گے !

واحد پریمی

○

غم کی پگڈنڈی پہ یوں سیکڑوں انسان گرے
ہل چلاتے ہوئے جیسے کوئی دہقان گرے

پیار کے دیپ بجھے امن کے ایوان گرے
دُکھ کے پاتال میں پھر کیوں نہ یہ انسان گرے

شیشۂ دل پہ کچھ اس طرح پڑی ضربِ الم
جیسے جھونکے سے ہوا کے کوئی گلدان گرے

ذہن امواجِ خیالات میں یوں ڈوب گیا
گہرے تالاب میں جیسے کوئی چٹان گرے

ہم نے وہ دور بھی دیکھا کہ ہر شہرِ وفا
تیشۂ غم سے تمناؤں کے ایوان گرے

صبح آئی تو کہیں دھوپ میں سایہ نہ ملا
رات آئی تو اندھیروں میں شبستان گرے

"پیار اک آگ کا دریا ہے" یہ سب علم میں تھا
اس کو کیا کہیے کہ ہم بن کے خود انجان گرے

ہم وہاں سے بھی گزر آئے جنوں میں واحدؔ
ٹھوکریں کھا کے جہاں صاحبِ عرفان گرے

▲▲

احمد حسین خاں

گلِ سرخ

اک پھول گلستاں میں بہت خوب کھلا ہے
رنگت پہ شفق جس کی دل و جاں سے فدا ہے
کچھ ایسا شگفتہ ہے کہ ہر برگِ گل اس کا
شادابی میں خونِ دلِ عاشق سے سوا ہے
رگ رگ سے ٹپکتی ہے جوانی کی مئے ناب
مستی میں ژولیدہ بہ خم، جھوم رہا ہے
رقصاں ہے ہواؤں سے گلے مل کے وہ شاداں
سنجیدگیٔ شاخ پہ پر تول رہا ہے
کی اس پہ نظر میں نے تو دل ہوگیا مضطر
محسوس ہوا مجھ کو کہ جی چھوٹ گیا ہے
چاہا کہ اسے توڑ کے سینہ سے لگا لوں
آواز یہ دی اس نے کہ تو بھول گیا ہے
تو بھی تو کبھی پھول تھا گلزارِ ازل کا
آدم نے تجھے توڑ کے یہ کھیل کیا ہے
گلِ مبدءِ تحقیق کا تو، شاخ تری ہو
ٹوٹے سے ترے عہدِ بلیٰ ٹوٹ گیا ہے
حسنِ ازلی شد متجلی بہ رخِ گل
گل چینی دگر معنی بہ کم ظرفیِ بلبل

○○

روحِ پر فتوح

مخزن تھے کمالات کے یہ حضرتِ یکتا
اوصاف کا ان کی نہ تھا کوئی بھی شناسا
اظہار کی فطرت کا کیا ان سے تقاضا
ہو کوئی ثنا خواں مرا۔ یہ راز ہو افشا
برقا کے ہوا، جان بھری، روح سے اپنی
اک خاک کے پتلے کو ذرا شا سا بنایا
فی انفسکم کہہ کے مقام اپنا بتایا
پھر دیکھنے پہچاننے کو ہوش جگایا
موتی متکلم کے جو پروئے تھے کبھی کے
تارِ نفسِ انساں کا پھر ان سے بنایا
آیاتِ نفخت نے اشارے یہ بتائے
فتنہ گو نیابت کے ہے سوتے سے جگایا
اک فیہ ضرور اس میں ہے، ہشیار خبردار
یہ آدمِ خاکی تو ہے بس عقل کا مارا
انساں نہیں، گتھی ہے یہ رازِ دروں ہے
"ایغو" کا "انا" کا یہ "خودی" کا ہے معما
یا کوئی کرن ناچتی گاتی ہوئی لرزاں
پابندِ عناصر ہے وہ انساں کا مجسمہ
یا اس کے ارادہ کا کوئی عکس مکمل
یا پردہ تصاویر کا یا ایک کھلونا
انسان جو آتا ہے کسی ذاتِ خفی سے
ہوتا ہے اسی ذات میں دوبارہ روانہ
گو بنا ہے یہ علم قلیل اور ادھورا
پر کھل گیا ہم پر تو محبت کا کرشمہ

▲▲

فخر واحدی

○

خوابِ موسمِ گُل کی کیا یہی ہیں تعبیریں
ہتھکڑی ہے ہاتھوں میں پاؤں میں ہیں زنجیریں
کوئی جہدِ پیہم ہے اور نہ کوئی تدبیریں
پھر بتاؤ بدلیں تو کیسے بدلیں تقدیریں
دوستو ذرا سوچو کیا یہی ہے صبحِ نَو
اک طرف اندھیرے ہیں اک طرف ہیں تنویریں
قصۂ گل ولالہ، داستانِ فصل و گُل
خون سے لکھیں ہم نے بارہا یہ تحریریں
پُرفریب ہیں کتنے امن کے پیمبر بھی
لب پہ پیار کے نغمے ہاتھ میں ہیں شمشیریں
صورتاً تو انساں ہیں سیرتاً درندے ہیں
فخر شہر والوں کی دو رُخی ہیں تصویریں

○○

شاہ غیاث

○

پوچھیں اگر کہیں جو وہ بیداد گر ملے
مدت ہوی ہے ہم کو بھی اپنی خبر ملے
اشکوں کے ساتھ خونِ جگر بھی رواں ہے اب
"میرا سلام کہیو اگر چارہ گر ملے"
عنقا ہیں دوست شہرِ نگاراں میں ہم نشیں
قاتل ملے بصورتِ یاراں مگر ملے
کس کی تلاش ہے دلِ ناداں کو اے ندیم
کوئی پتہ بتائے جو صاحب نظر ملے
سیماب پا ہے دل تو کہیں ٹھیرتا نہیں
دیکھو کہیں وہ کوچۂ جاناں میں گر ملے

○○

ای، ایم، فارسٹر

مترجم: نجمہ شہریار

واپسی

نہ جانے کیوں مسٹر لوکس اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنی عمر کی اس منزل پر تھے جب آزادی کی قیمت ہزار گناہ بڑھ جاتی ہے۔ کیوں کہ یہ بہت جلد کھو جانے والی چیز ہے۔ وہ اپنے نوعمر ساتھیوں کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی توجہ اور نگہداشت سے عاجز آچکے تھے، تھک سے گئے تھے، اسی لیے وہ ان لوگوں سے آگے بڑھ گئے تھے تاکہ خچر پر خود چڑھ اور اتر سکیں۔ زیادہ وہ اس خیال سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے کہ وہ دوپہر کے کھانے پر ان لوگوں کا انتظار کریں اور پھر جب وہ لوگ پہنچیں تو ان کو بتائیں کہ انتظار کتنی اہم چیز ہے۔

اسی لیے بچوں کی سی بے صبری کے ساتھ انھوں نے جانور کی پیٹھ تھپتھپائی اور چھڑی کو اس کی پیٹھ میں چبھو دیا اور پھر پہاڑیوں پر ادھر ادھر گھومتے رہے ۔۔۔ دور تک حسین سمندر، پھول اور گل فردوس کھل رہے تھے تب ہی انھوں نے بہتے ہوئے پانی کی آواز سنی اور اس کے بعد وہ چنار کے درختوں کی طرف آئے اسی جگہ ان سب کو کھانا کھانا تھا۔

حالاں کہ انگلستان میں بھی وہ چنار کے درخت اتنے ہی حیرت خیز رہے ہوں گے۔۔۔۔۔ کتنے تناور درخت تھے ۔۔۔ اس کی شاخیں ایک دوسری میں گتھی ہوئی تھیں اور ان پر سبز رنگ تھرتھرا رہا تھا اور یہاں یونان میں وہ عدیم المثال تھے۔ اس دور تک پھیلے ہوئے خطے میں ایک وہی جگہ خشک تھی جسے اپریل کے سورج کی گرمی نے تھوڑا سا تپا دیا تھا۔ ان درختوں کے درمیان چھوٹی سی ایک دیہاتی سرائے چھپی ہوئی تھی جسے "کھین" کہتے تھے۔ یہ مٹی کی ایک چھوٹی سی عمارت تھی جس میں لکڑی کی ایک کشادہ بالکنی تھی اور جس پر ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی چرخہ کات رہی تھی۔ ایک چھوٹا سا بھورے رنگ کا سور اس کے پاس بیٹھا سنگترے کے چھلکے کھا رہا تھا۔ بھیگی زمین پر ٹخنوں کے بل دو بچے بیٹھے ہوئے تھے جو انگلیوں سے کوئی بہت قدیم کھیل کھیل رہے تھے۔ اور ان کی ماں جو کوئی زیادہ صاف ستھری نہ تھی اندر بیٹھی چاول پکا رہی تھی۔ مسز فورمن اگر یہاں آتیں تو یقیناً کہتیں ۔۔۔ "اوہ! یہ سب کس قدر یونانی چیزیں ہیں" مسٹر لوکس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اس وقت یہاں نہیں ہیں ۔۔۔ انھیں اس خیال سے بھی خوشی ہو رہی تھی کہ وہ لوگ کھانا لے کر آتے ہوں گے اور یہاں سب لوگ

ٹھلی ہوا میں کھائیں گے۔

وہ بڑے خوش ہو رہے تھے کہ وہ اس وقت یہاں تنہا ہیں۔ تجربے نے ان کا بڑا ساتھ دیا تھا۔ وہ اس بات سے بار بار خوشی محسوس کر رہے تھے کہ مسز فورمن اس وقت یہاں پر نہیں ہیں، ورنہ ہر ہر بات پر ٹوکتیں۔ ساتھ ہی وہ اس بات سے بھی خوش ہو رہے تھے کہ ابھی کم از کم آدھ گھنٹہ ایتھل یہاں نہیں آنے کی۔ ایتھل ان کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی جو اب بھی غیر شادی شدہ تھی۔ وہ بہت محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ اور لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ساری زندگی باپ کی خدمت کرے گی "تاکہ ان کا بڑھاپا آرام سے گزرے۔ مسز فورمن ہمیشہ اسے اینٹی گنی اور مسٹر لوکس کو ای ڈی پس کہا کرتی تھیں۔

ان میں اور ای ڈی پس میں مماثلت یہ تھی کہ وہ بوڑھے ہو رہے تھے۔ اب یہ بات خود ان پر بھی واضح ہو چکی تھی ــــ ان کو دوسروں کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی..... بہت کم کسی کا جواب دیتے۔ ان کو خود سے باتیں کرنے کا شوق تھا۔ اکثر بات کرتے کرتے بھول جاتے کہ کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ ان کے جملے اور لہجہ اب خاصا ماند ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قصے جو وہ اکثر سب کو سنایا کرتے تھے اور جو کبھی بہت شوق سے سُنے جاتے تھے اب اپنی دلچسپی کھو چکے تھے، سپاٹ ہو چکے تھے۔ ان کی خاموشی اتنی ہی بے معنی ہو چکی تھی جتنی ان کی گویائی ــــ تاہم انھوں نے ایک بہت صحت مند اور باعمل زندگی گزاری تھی، بڑی مستعدی سے کام کیا تھا، بہت کمایا تھا اپنے بچوں کو تعلیم دلائی تھی..... کسی کو الزام دینا بے کار تھا سب سے بنیادی بات تو یہ تھی کہ وہ بوڑھے ہو رہے تھے!

اس لمحہ وہ یونان میں تھے۔ ان کی زندگی کا ایک اہم خواب شرمندۂ تعبیر ہو رہا تھا۔ چالیس سال پہلے ان کو یونانیت کا بخار چڑھا تھا۔ ان کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ وہ اس سرزمین کی سیر کر سکتے۔ اگر وہ ایسا کر سکتے تو ان کی زندگی بے کار نہ جاتی لیکن ایتھنز بہت غبار آلود تھا۔ ڈیلفی میں سیلن بہت تھی۔ تھرماپلے بالکل سپاٹ تھا۔ اپنے ساتھیوں کے مسرت سے بھرپور فقرے سن کر ان کو تعجب بھی ہوتا تھا اور کوفت بھی۔

یونان نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کا ان کو شعوری طور پر احساس نہیں تھا۔ اس نے ان کے وجود کو بے چین کر دیا تھا کہ بے چینی ہی میں زندگی کی حرارت ہے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ مستقل محرومی کا شکار نہیں رہے ہیں۔ ان کو جس حریف سے جنگ کرنا تھی وہ کوئی چھوٹا موٹا دشمن نہیں تھا ــــ پچھلے مہینے سے ان کے دل میں ایک عجیب و غریب خواہش جنم لے رہی تھی کہ وہ لڑتے لڑتے مر جائیں۔

یونان کی سرزمین نوجوان لوگوں کے لیے ہے۔ انھوں نے اپنے آپ سے کہا جس وقت کہ وہ چنار کے درختوں کے نیچے کھڑے تھے۔ لیکن میں اس میں داخل ہو جاؤں گا اور اسے اپنا لوں گا۔ "پتیاں پھر سے ہری ہو جائیں گی، پانی شیریں ہو جائے گا آسمان نیلا ہو جائے گا ــــ چالیس سال پہلے بھی سب کچھ ایسا ہی تھا۔ میں ان سب کو پھر سے جیت لوں گا مجھے بڑھاپے سے سخت نفرت ہے۔ وہ دو قدم آگے بڑھے۔ اسی لمحے ان کے ٹخنوں پر ٹھنڈا پانی شور مچا رہا تھا ــــ " ارے یہ پانی کہاں سے آیا بھلا؟" انھوں نے

اپنے آپ سے سوال کیا۔ مجھے یہ تک نہیں معلوم۔ انھیں یاد آیا کہ پہاڑی علاقہ خشک تھا ۔۔۔ تو پھر یہ سٹرک اچانک کیسے بہتے ہوئے چشمے سے ڈھک گئی؟

وہ ایک عالمِ حیرت میں یہ کہتے ہوئے رُک گئے ۔۔۔ پانی ۔۔۔ ؟ چنار کے اندر سے ؟ کھوکھلے درخت کے اندر سے ؟ ایسا تو نہ ہی کبھی دیکھا اور نہ ہی سوچا تھا ۔۔۔ اسے تار کول نکالنے کے لیے جلایا گیا ہوگا ۔۔۔ اس کے تنے سے ایک چشمہ پھوٹ رہا تھا جس نے درخت کی چھال کو ننھے ننھے پودوں سے ڈھانک دیا تھا اور وہ چشمہ پگڈنڈی پر بہہ رہا تھا اور وہ پورا خطّہ ایک حسین سبزہ زار میں تبدیل ہوگیا تھا۔ سیدھے سادے دیہاتی اس منظر کو دیکھ کر اسے مافوق الفطرت چیز سمجھے ہوں گے۔ جس وجہ سے انھوں نے اس جگہ کو ایک چھوٹی سی عبادت گاہ میں بدل دیا تھا اور انھوں نے عشق اور اسرار کو مختلف تحائف نذر کیے تھے۔ اس میں ایک چراغ اور کنواری مریم کی تصویر لٹکائی تھی ۔۔۔ مریم جو جل پریوں اور درخت کی دیویوں کی اس مشترکہ زودگاکی وارثہ تھیں۔

میں نے کبھی بھی ایسی حیرت انگیز چیز نہیں دیکھی تھی۔ مسٹر لوکس نے سوچا ۔۔۔ میں تو اندر قدم رکھ سکتا ہوں اور دیکھ سکتا ہوں کہ پانی آخر کہاں سے آتا ہے۔ لمحہ بھر کے لیے ان کو اس عبادت گاہ کے اندر داخل ہونے میں تامل ہوا۔ انھوں نے سوچا کہیں اس مقدس جگہ کی بے حرمتی نہ ہو۔ پھر انھیں اپنا ایک خیال یاد آیا۔ یہ جگہ میری ہوگی، میں اس میں داخل ہو کر اسے حاصل کر لوں گا اپنا لوں گا۔ اور وہ چھلانگ مار کر دوسرے ہی لمحہ اندر ایک پتھر پر جا کھڑے ہوئے۔

پانی منتقل بڑی خاموشی سے بہہ رہا تھا اور درخت کے کھوکھلے تنے اور پوشیدہ دراڑوں سے باہر نکل رہا تھا جس سے کہ باہر ایک چھوٹا سا کرپانی حیوانیہ کنڈ سا بن گیا تھا۔ مسٹر لوکس نے اس پانی کا ذائقہ چکھا جو کہ میٹھا تھا اور جب انھوں نے اوپر کی طرف دیکھا تو ان کو تنے میں اوپر کی طرف ایک خول سا نظر آیا جس سے کہ درخت سے تار کول نکالتے وقت دھواں نکلا ہوگا۔ اس میں سے انھیں آسمان نظر آیا جو کہ نیلا تھا، اور درخت کی چند پتیاں بھی نظر آئیں جو سبز اور تروتازہ تھیں اور پھر ان کو عجیب وغریب قسم کا احساس ہوا۔ چھوٹے چھوٹے تحائف جو خالقِ کائنات کی نذر کیے گئے تھے وہ چھال پر بندھے ہوئے تھے۔ ننھے ننھے بازو، پاؤں، آنکھیں، ہاتھ، دماغ اور دل کے نمونے وہ سب علامات تھیں کسی کھوئی ہوئی چیز کی واپسی کی ۔۔۔ مثلاً طاقت، عقل یا محبت۔ فطرت وہاں تنہا نہ تھی کیوں کہ انسانیت کے شادی وغم اس درخت کے سینے میں سما گئے تھے۔ انھوں نے اپنے بازو پھیلائے اور اپنے آپ کو ملی ہوئی نرم لکڑی کے سہارے مضبوطی سے ٹکا دیا، ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ انھیں لگا جیسے وہ بڑے آہستہ آہستہ چل رہے ہوں لیکن پھر بھی پُرسکون ہوں۔ انھیں محسوس ہوا جیسے وہ ایک تیراک ہوں جو طوفانی سمندروں سے کافی دیر تک جنگ کرنے کے بعد محسوس کرتا ہے کہ بالآخر مدوجزر اس کو اس کی منزل تک پہنچا دیں گے۔

اسی لیے وہ بے حس وحرکت کھڑے رہے۔ ان کو صرف یہ احساس تھا کہ ان کے قدموں کے نیچے

چشمہ ہے، اس لیے کہ جب انھیں نے اپنی آنکھیں
کوئی غیر متصور، بے نام سی شے ہے ان کو ہر چیز میں سمائی
محسوس ہوئی جس نے آس پاس کی ساری چیزوں
بنا دیا۔

وہ بوڑھی عورت جو جھکی ہوئی چرخہ کات رہی تھی
ہت معنی خیز معلوم ہوئی۔ سور کی اچھل کود اور اون
لے میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ تھا۔ ایک نوجوان
ار کوئی گیت گاتا ہوا چشمے پر آیا۔ اس کے انداز میں
تھا۔ اس کی خوش آمدید میں ایک خلوص تھا۔ درختوں
ہوئی شاخوں پر سورج جو نقش و نگار بنا رہا تھا وہ
غیر متوقع اور اتفاقی چیز نہ تھے۔ گلِ فردوس کے
تے ہوئے کنجوں میں، پانی کی موسیقی میں اب ایک
معانی تھے۔ مسٹر لوکس کو جنھوں نے بہت ہی کم
نہ صرف یونان کو بلکہ انگلستان، ساری دنیا اور
رگی کو دریافت کرلیا تھا۔ اور اب یہ خواہش ان کو
مضحکہ خیز نہ لگ رہی تھی کہ وہ بھی اس درخت کو ایک
پیش کریں جو ایک مکمل انسان کا ماڈل ہو ــــ!

"کیوں پاپا، یہاں آپ کیا کر رہے ہیں ــــ؟
گ آ گئے تھے ..... ایتھل، مسز فورمین، مسٹر گراہم
یزی بولتا ہوا ترجمان۔ بڑے مشکوک انداز سے
س نے ان کی طرف دیکھا۔ اچانک وہ سب ان کو
اجنبی اور پرائے پرائے سے لگے۔ ان کی ہر بات
ن کو بھدی اور ناگوار سی محسوس ہو رہی تھی۔

"اگر آپ کی اجازت ہو تو باہر آنے میں میں آپ کی
ں ــــ۔" مسٹر گراہم ہمیشہ بزرگوں سے بڑے
سے پیش آتے تھے۔

مسٹر لوکس جھنجھلا گئے ــــ "شکریہ میں خود
اپنی مدد کر سکتا ہوں۔" انھوں نے جواب دیا اور درخت
سے باہر آتے میں وہ اچانک پھسل گئے اور ان کا ایک
پیر چشمے میں جا پڑا۔

"ہائے میرے پاپا ــــ" ایتھل بولی "یہ
آپ کیا کر رہے ہیں؟ خدا کا شکر ہے کہ میں آپ کے
دوسرے کپڑے ساتھ لائی ہوں ــــ"

بڑی مستعدی سے اس نے ان کو کپڑے تبدیل
کرائے۔ انھیں صاف موزے اور خشک جوتے دیے
اور لنچ باسکٹ کے پاس بچھے قالین پر ان کو بٹھا دیا۔
اور پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کنج کے حسن سے لطف اندوز
ہونے چل دی۔

وہ سب بڑے سرشار ہو کر لوٹے۔ مسٹر لوکس
بھی ان کے ساتھ گفتگو میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ لیکن
وہ لوگ ان کو بہت ناقابلِ برداشت معلوم ہوئے۔
اس لیے کہ ان لوگوں کا جوش بالکل سطحی اور معمولی تھا۔
ان کو اس غیر معمولی حسن کا احساس نہ تھا جو ان کے ہر سُو
بکھرا ہوا تھا۔ بہ مشکل تمام انھوں نے اپنے احساسات
کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

"مجموعی طور سے میں یہاں کی چیزوں سے
بہت خوش ہوا۔ یہ سب مجھے بڑا متاثر کر رہی ہیں ــــ
درخت بہت عمدہ ہیں ....
..... اور اس صاف و شفاف بہتے ہوئے پانی میں
کوئی بڑی شاعرانہ چیز ہے۔ یہاں کے لوگ بھی بہت
مہربان اور مہذب معلوم ہوتے ہیں۔ واقعی یہ بے حد
دلکش جگہ ہے۔"

مسز فورمین نے ان کی اس سادہ سی تعریف پر فقرہ کسا "اوہ! یہ تو لاکھوں میں ایک جگہ ہے۔ میں تو اس کے لیے اپنی جان تک دے سکتی ہوں۔ اور یہیں جینا ہیں مرنا چاہتی ہوں۔" وہ چلائیں — "اگر مجھے ایتھنز واپس نہ جانا ہوتا تو یقیناً میں یہاں ہی رُک جاتی۔ یہ جگہ مجھے سوفوکلیس کی کولونس کی یاد دلاتی ہے۔"

"واقعی مجھے یہاں رُکنا چاہیے —"

"ہاں ہاں ضرور رُکو — تم اور تمہارے پاپا — اینٹی گنی اور ای ڈی پس تمھیں واقعی کولونس میں رُکنا چاہیے —"

مسٹر لوکس کو اپنا سانس رُکتا ہوا سا محسوس ہوا۔ اس سلسلہ میں وہ بے حد پُر جوش تھے۔ جب وہ درخت کے اندر کھڑے تھے تب انھیں یقین ہو گیا تھا کہ ان کی مسترتیں زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہوں گی لیکن چند لمحات کی اس گفتگو نے ان کے اس واہمے کو ختم کر دیا تھا۔ وہ اب دنیا کی سیر کی آرزو نہ رکھتے تھے۔ نہ ان کو اس سلسلے میں خود پر اعتماد تھا۔ اس لیے کہ بوڑھے فرسودہ خیالات، بوڑھی تھکاوٹیں، ان کا انتظار کر رہی تھیں تاکہ جیسے ہی وہ چنار کے ان درختوں کا سایہ چھوڑیں اور یہ ان کو آپکڑیں۔ کھین میں ان مہربان اور نرم آنکھوں والے لوگوں کے ساتھ سونا — جگنگاتے دن کو دیکھنا اور چاند کو مختلف نقش و نگار بناتے ہوئے دیکھنا — ایک ایسی رات ان کی کایا پلٹ کر دے گی اور وہ سلطنت جو انھوں نے حاصل کی تھی اس میں وہ ہمیشہ خوش رہ سکیں گے لیکن — ان کے لب جو کچھ کہہ سکے وہ صرف یہ تھا:

"میری خواہش ہے کہ میں کم از کم ایک رات بسر کر سکتا —!"

"پاپا! آپ کا مطلب ایک ہفتہ قیام سے ہے نا —؟ اس لیے کہ اس سے کم رُکنا مقدس جگہ کی توہین کرنا ہے۔"

"ہاں ہاں — ایک ہفتہ بھی رہ سکتے ہیں۔" اپنے جملے کی تصحیح سے انھوں نے کچھ جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا جب کہ ان کا دل بلّیوں اچھل رہا تھا۔ کھانے کے دوران انھوں نے ان لوگوں سے کوئی بات نہ کی۔ بس اس مقام کو بغور دیکھتے رہے جس کو وہ مزید جاننا اور دریافت کرنا چاہتے تھے اور ان لوگوں کو دیکھتے رہے جو بہت جلد ان کے دوست بننے والے تھے۔ کھین کے باسیوں میں ایک بوڑھی عورت، ایک ادھیڑ عورت، ایک نوجوان اور دو بچے تھے۔ اور ان میں سے کسی سے بھی انھوں نے بات نہ کی تھی تاہم وہ ان سے محبت کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان کو ہر وہ شئے محبوب نظر آ رہی تھی جو چنار کے درختوں کے ان مہربان سایوں کے نیچے متحرک تھی، سانس رہی تھی اور زندہ تھی۔

"اچھا بھئی! اب ہم کو روانہ ہونا چاہیے یہاں سے۔" مسز فورمین کی تیز آواز آئی — "اچھا ..... مسٹر گراہم ..... اب یہ سب چکر ختم ہونا چاہیے۔"

"آج کی رات ....." مسٹر لوکس نے کہا "یہ لوگ اس عبادت گاہ کے پاس ننھے ننھے چراغ جلائیں گے اور جب ہم سب کے سب بالکنی پر بیٹھیں گے تب شاید وہ لوگ بتائیں گے کہ اس میں کون سا نذرانہ کس نے پیش کیا ہے۔"

مسٹر گراہم بولے "معاف کیجیے مسٹر لوکس لیکن یہ سب تو یہ چاہ رہے ہیں کہ ہم لوگ اپنا بوریا بستر اسنبھال لیں اور یہاں سے ایک دو تین ہوں۔"

مسٹر لوکس یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اچھل

پہلے سو نے جائے گی پھر میں ان کو یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ کیا چیز مدّ نظر رکھوں اس لیے کہ یہ کام مجھے ضرور کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ جب میں ان کے ساتھ تنہا ہوں گا تو وہ میری بات، میری زبان ضرور سمجھ جائیں گے۔"

ایتھل، ان کے رخساروں کو چھو کر بولی "پاپا سب خچر یہاں موجود ہیں اور میں آپ سے تین بار کہہ چکی ہوں کہ اب چلیے۔"

"خچر — ؟ کس کے خچر — ؟"

"ہمارے .... اور کس کے .... ؟ ہم سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں .... مسٹر گراہم پلیز — پاپا کی مدد کیجیے ....."

"ایتھل .... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" "میرے بہت پیارے پاپا ہم کو اب یہاں سے چلنا چاہیے۔ پتہ ہے ہم کو آج رات اولیمپیا پہنچنا ہے۔"

مسٹر لوکس نے بڑے پُر اعتماد لہجہ میں کہا "ایتھل میں چاہتا ہوں کہ کوئی بھی پروگرام بناتے وقت ذرا تم ہوش و حواس سے کام لیا کرو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہم یہاں ایک ہفتہ قیام کریں گے اور خود تم نے ہی یہ کہا تھا۔!"

ایتھل بد کلامی پر اُتر آئی "واہ کیا احمقانہ خیال ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں محض مذاق کر رہی تھی۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ کاش ہم یہاں ایک ہفتہ قیام کر سکتے۔"

مسز فورمین نے ایک سرد آہ بھری "کاش ہم ہر کام اپنی مرضی سے کر سکتے —!" وہ محترمہ پہلے ہی خچر پر سوار ہو چکی تھیں۔

"واقعی میرا بھی یہی مطلب تھا کہ کاش ....."

ایتھل نے بڑے پُر سکون لہجہ میں کہا۔

"یقیناً میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ میں نے تو سارے منصوبے بھی بنا لیے تھے۔ میرے لیے روانگی ناممکن ہے۔" کچھ اس انداز میں انھوں نے یہ جملہ ادا کیا کہ مسٹر گراہم اور مسز فورمین کو اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے اپنا منہ دوسری طرف کرنا پڑا۔

"میں اتنی بے احتیاطی سے بولنے کے لیے معافی چاہتی ہوں۔ یہ میری غلطی تھی۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہم اپنے ساتھیوں کا ساتھ کسی قیمت پر بھی چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ یہاں ایک رات بھی رُکنے کا مطلب یہ ہے کہ پیٹرس پر ہمیں کشتی نہ مل سکے گی۔"

مسز فورمین نے مسٹر گراہم سے سرگوشی والے انداز میں کہا کہ "دیکھیے تو کس طرح ایتھل اپنے باپ کو ٹھیک کرتی ہے۔"

"پیٹرس کی کشتی پر جانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم نے ہی کہا تھا کہ ہمیں یہاں رُکنا ہے اور اسی لیے ہم یہاں رُک رہے ہیں۔"

ایسا لگ رہا تھا جیسے کھین کے باسیوں کو یہ معلوم ہے کہ یہ بحث ان ہی سے متعلق ہے۔ بوڑھی عورت نے چرخہ کاتنا بند کر دیا۔ اور وہ نوجوان اور بچے مسٹر لوکس کے پیچھے آ کھڑے ہوئے جیسے کہ پشت پناہی کے لیے آئے ہوں۔

نہ ہی حجت اور نہ منت و سماجت ان کو اپنی جگہ سے ہلا سکی۔ وہ خاموش تھے لیکن اپنے فیصلے پر مائل تھے۔ اس لیے کہ زندگی میں پہلی بار انھوں نے اپنی روزمرہ زندگی کو صحیح راہ پر گامزن دیکھا تھا۔ ان کو انگلستان جانے کی کیا ضرورت تھی۔ کون وہاں ان کی کمی کو محسوس کرے گا۔ ان کے دوست

یا تو دنیا سے رخصت ہو چکے تھے یا سرد مہر ہو چکے تھے۔ ایتھل ان سے محبت کرتی تھی لیکن اس کی اپنی الگ دلچسپیاں تھیں اور اس میں اس کی کوئی غلطی بھی نہ تھی۔ اپنے دوسرے بچوں کو وہ کبھی کبھار ہی دیکھ پاتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی صرف ایک ہی رشتہ دار تھیں جن سے وہ خائف بھی رہتے تھے اور نفرت بھی کرتے تھے۔

انھوں نے دل ہی دل میں سوچا کہ یہ ان کی بے وقوفی اور بزدلی ہوگی اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے بھی — وہ جگہ جس نے ان کو سکون بخشا تھا مسرتیں دی تھیں۔

آخرکار ایتھل ان کو خوش کرنے کی غرض سے اپنی جدید یونانی کے علم کا اظہار کرتی اس جیرت بہ دنداں ترجمان کے ساتھ کیبن کے اندر کمرے دیکھنے کی غرض سے گئی۔ اندر بیٹھی ہوئی عورت نے اُن کا پُرجوش خیر مقدم کیا، اور وہ نوجوان مسٹر لوکس کے خچر کو اصطبل کی طرف لے چلا۔

"اسے چھوڑو .... اے او .... ڈاکو ....

مسٹر گراہم چلائے۔ جو ہمیشہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ غیر ملکی اگر چاہیں تو انگریزی سمجھ سکتے ہیں۔ ان کا یہ خیال صحیح تھا۔ اس نوجوان نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ایتھل کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

آخرکار ایتھل نمودار ہوئی۔ اس نے اپنی اسکرٹ اوپر کی طرف کھونس رکھی تھی — ترجمان اس کے پیچھے تھا۔ سور اس کے ساتھ تھا جسے اس نے خرید لیا تھا۔

"میرے بہت پیارے پاپا۔ میں آپ کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں لیکن کیبن میں قیام ——— ناممکن ...."

"اچھا تو تم لوگ جاؤ، مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں تنہا رکوں گا۔"

"یہ سراسر حماقت ہے۔" ایتھل نے غصہ سے اس بڑھاپے میں آپ یہاں تنہا کیسے چھوڑے جا سکتے ہیں میں سارے خطوط آپ کے منتظر ہیں۔ آپ کی بوٹ چھوٹ اور جس کا مطلب ہے لندن کے اوپرے سے ہاتھ دھو اور پورے مہینے کے پروگراموں میں جو گڑبڑ ہوگی سو لگتا ہے آپ اکیلے سفر کر سکتے ہیں .... بہت خوب ... یہ لوگ آپ کے چھرا گھونپ سکتے ہیں ...." مز نے شوشہ چھوڑا۔

وہ دیہاتی یونانی خاموش تھے۔ لیکن جب مسٹر ا نے ان کی جانب دیکھا تو انھوں نے انھیں سر اٹھ جانب اشارے سے بلایا۔ بچوں کا بس چلتا تو وہ ا کوٹ پکڑ کھینچ لیتے۔ بالکنی پر بیٹھی بوڑھی عورت نے کاتنا بند کر دیا تھا اور مسٹر لوکس کی طرف بڑی پُرا نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

جس وقت وہ اس کشمکش میں تھے، اس معاملے ایک بڑی سنجیدہ صورت اختیار کر لی۔ ان کو یقین تھ یہاں صرف اس لیے نہیں رک رہے تھے کہ ان کو ان کی واپس مل گئی تھی۔ یا ان کو بے کراں مسرتوں کا احسا ہوا تھا۔ یا انھوں نے حسن کا ادراک کیا تھا بلکہ اس پر اور ان لوگوں کے ساتھ میں ایک بے حد اہم واقعہ کا منتظر تھا جو کہ دنیا کی صورت ہی بدل کر رکھ دے گا۔ لمحہ اس قدر اہم تھا کہ ——— انھوں نے محبت کو بے سمجھا اور اپنے ان طاقتور لیکن خاموش ساتھیوں ا نغمہ ریز پانیوں، سرگوشیاں کرتے چناروں کے بارے سوچنے لگے۔ وہ اسی خیال سے پُرسکون ہو گئے اور کہ وہ جگہ ان کو یک زبان ہو کر بلا رہی تھی جو کہ ان کے لیے

بامعنی تھی اور ان کے وہ باتونی، چرب زبان مخالفین ہر لمحہ ان کے لیے بے معنی ہوتے جارہے تھے ـــــ جلد ہی وہ لوگ اکتا جائیں گے، تھک جائیں گے اور پھر چرب باتیں کرتے دھوپ میں جائیں گے۔ اور ان کو اس خنک پُرفضا کنج اور چھٹکی ہوئی چاندنی میں چھوڑ جائیں گے اور ساتھ ہی ان کو نصیب آزمائی کے لیے چھوڑ جائیں گے ـــــ جس کا ان کو پہلے ہی الہام ہوگیا تھا۔

مسز فورین اور ترجمان پہلے ہی روانہ ہوچکے تھے۔ ان کے ساتھ میں ستوز اپنی بولی بولتا ہوا جارہا تھا۔ اور یہ کشمکش یقیناً اور طول اختیار کرتی اگر اینجل نے مسٹر گراہم کو آواز نہ دی ہوتی۔

"کیا آپ میری کچھ مدد کرسکتے ہیں؟" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "ان سے نمٹنا تو بہت مشکل ہے۔"

"حجت اور بحث میں میں بہت کمزور ہوں۔ لیکن میں کسی دوسرے طریقے سے بے شک تمہاری مدد کرسکتا ہوں ...." انھوں نے بڑی طمانیت کے ساتھ اپنے صحت مند خوب صورت جسم کو دیکھا۔

اینجل ہچکچائی ـــــ تب اس نے کہا "کسی بھی طرح میری مدد کیجئے۔ یہ سب ہم انھیں کے ہی بھلے کے لیے کررہے ہیں۔"

"اچھا تو ایسا کرو کہ ان کے خچر کو ان کے پیچھے پیچھے کردو۔" مسٹر لوکس جب یہ سوچ رہے تھے کہ انھوں نے مہم سر کرلی ہے۔ انھیں محسوس ہوا کہ ان کو زمین پر سے اٹھایا جارہا ہے اور پھر وہ خچر پر بٹھا دیے گیے ہیں۔ اس لمحے خچر نے زور سے ایڑ لگائی۔ انھوں نے کچھ نہ کہا اس لیے کہ ان کے پاس کہنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔ یہاں تک کہ ان کا چہرہ بھی جذبات سے عاری تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ درختوں کے سائے دھیرے دھیرے گزرتے جارہے ہیں، اور پانی کی آواز مدھم ہوتی جارہی ہے۔ مسٹر گراہم ان کے بازو میں دوڑ رہے تھے۔ ہیٹ ان کے ہاتھ میں تھا اور وہ برابر معافی مانگ رہے تھے۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ کام میرا نہ تھا۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ کسی دن آپ ضرور یہ محسوس کریں گے کہ میں .... لاحول ولاقوۃ ...."

ایک پتھر ان کی پیٹھ پر آ لگا تھا جو چھوٹے لڑکے نے پھینکا تھا جو راستہ میں ان کا پیچھا کررہا تھا۔ اس کے پیچھے اس کی بہن اس کے پیچھے بھاگ کر آرہی تھی اور پتھر پھینک رہی تھی۔

اینجل نے چلاّ کر ترجمان کو بلایا جو مسز فورین کے ساتھ تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کے پاس آتا ایک دوسرا حریف نمودار ہوا۔ یہ وہ نوجوان تھا جو ان کا راستہ کاٹ کر مسٹر لوکس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

خوش نصیبی سے مسٹر گراہم بڑے اچھے مکہ باز تھے۔ اور ذرا سی دیر میں انھوں نے یونانی نوجوانوں کو پچھاڑ دیا۔ وہ خون میں لت پت چہرہ لیے زمین پر رینگتا یونانی جنت کے سدا بہار پھولوں کی طرف چل دیا۔ اسی اثنا میں ترجمان آگیا تھا۔ بچے اپنے بھائی کی ہیئت کذائی سے خوف زدہ ہوکر رک گئے تھے اور مسٹر لوکس کو بچانے والا وہ گروہ پھر درختوں میں منتشر ہوگیا۔

"ننھے شیطان ـــــ!" مسٹر گراہم نے کہا اور بہت فاتحانہ انداز سے ہنسے۔ "یہ جدید یونانی ہیں۔ لگتا ہے تمہارے پاپا ان کی ملکیت تھے۔ اور لگتا ہے کہ

جیسے ہم ان سے وہ ملکیت چھین لیے جا رہے ہوں۔"

"اوہ بڑے خطرناک ہیں یہ لوگ۔ بالکل جنگلی ــــ میں آپ کا شکریہ کس منہ سے ادا کروں۔ آپ نے میرے پاپا کی جان بچائی ہے۔" ایتھل بولی۔

"مجھے یقین ہے کہ تم مجھے وحشی نہ سمجھو گی۔"

"ارے نہیں" ایتھل نے جواب دیا اور سرد آہ بھری۔ مجھے طاقت اور توانائی بے حد پسند ہے۔"

وہ چھوٹا سا قافلہ پھر سے مجتمع ہو گیا اور مسٹر لوکس (جیسا کہ مسز فورمین کا خیال تھا کہ انھوں نے اپنی لاچاری اور بے بسی کو بہت خوش اسلوبی سے برداشت کر لیا ہے۔) اپنے خچر پر آرام سے بیٹھ گئے۔ وہ لوگ بڑی تیزی سے مخالف سمت کے پہاڑی سلسلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کو خوف تھا کہیں حملہ دوبارہ نہ ہو۔ یہاں تک کہ وہ جگہ بہت پیچھے رہ گئی۔ اس وقت ایتھل کو اپنے باپ سے بات کرنے کا موقعہ ملا۔ اس نے ان سے اپنے رویے کی معافی مانگی۔

"پاپا اس وقت وہاں اتنے بدلے بدلے سے لگ رہے تھے۔ میں تو بری طرح ڈر گئی تھی۔ اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ وہی پہلے جیسے بزرگ ہیں۔"

مسٹر لوکس نے جواب دیا۔ ایتھل نے ان کی خاموشی کا یہ مطلب اخذ کیا کہ اس کے رویے سے ان کو تکلیف پہنچی ہے جو کہ بالکل فطری بات تھی......

...... کھین سرائے چنار کے سبز گنبد کے نیچے چھپ گئی تھی اور کھلی جگہ پر اب بھی تین لوگ کھڑے تھے اور پھر اس صاف ستھری فضا سے ایک مدھم سی چیخ بلند ہوئی جو لگتا تھا خدا حافظ کہہ رہی ہو۔

مسٹر لوکس غیر ارادی طور پر رک گئے۔ اور لگا ہاتھ سے گر جانے دیا۔

"آئیے پاپا...... ایتھل نرمی سے بولی۔ انھ تعمیل کی اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک چٹان نے ا خطرناک منظر کو ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل کر

(۲)

ناشتے کا وقت تھا لیکن گیس جل رہی تھی کہ کہ موسم کہر آلود تھا۔ مسٹر لوکس گزشتہ رات کے تجربات بیان کر رہے تھے جیسے بسر کرنا ان کے لیے د ہو گیا تھا۔ ایتھل جس کی جلد ہی شادی ہونے وا اپنے بازو میز پر ٹکائے ہوئے ان کی گفتگو سن رہ پہلے گھنٹی بجی، پھر تم تھیٹر سے واپس آ اس کے بعد کتا شروع ہو گیا اور پھر بلی اور.... تین بجے ایک نوعمر، بدتمیز، بے ہودہ لڑکا کوئی گا ہوا سڑک پر گزرا اور پائپ میں پانی اتنی بری آواز سے بہہ رہا تھا کہ میرا سر چکرانے لگا۔"

"شاید وہ غسل خانے کا پانی ہوگا۔" ا نے کہا۔ وہ خاصی تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

ہاں ہاں دراصل مجھے سب سے زیادہ جو ناپسند ہے وہ بہتا ہوا پانی ہے ــ اس گھر میں آنا بالکل ناممکنات میں سے ہے۔ میں اسے چھوڑ د اگلی بار ایک نوٹس دوں گا اور مالک مکان کو صاو صاف لکھوں گا کہ وہ وجہ جس سے کہ میں مکان چھ ہوں یہ ہے کہ اس میں سونا ناممکن ہے۔ اگر وہ کہیں تو کہتے رہیں۔ اور پھر کہیں گے بھی کس منہ سے

"پاپا سلائس لیجیے گا؟"

"شکریہ بیٹی ۔۔۔" انھوں نے سانس لے لیا اور ایک لمحہ سکون سے گزر گیا۔ لیکن مسٹر لوکس پھر شروع ہو گئے ۔۔۔ "اور میں قریب کے مکان والوں سے ضرور کہوں گا اور خط بھی لکھوں گا۔"

ہاں .... ایتھل بے خیالی والے انداز میں بولی۔ وہ اس فکر میں تھی کہ خط کسی طرح مکان مالک کے ہاتھ میں پہنچے۔

میں نے گورنس سے بات کر لی ہے اور اس نے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ سب ٹھیک کر دے گی۔ اور چچی جولیا کو شور سے نفرت ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اس کی چچی خاندان کی واحد غیر شادی شدہ ممبر ہونے کی وجہ سے آرہی تھیں تاکہ اس کے جانے کے بعد اس کے پاپا کی دیکھ بھال کر سکیں ۔ یہ بات کوئی زیادہ پسندیدہ اور خوش گوار نہ تھی۔ مسٹر لوکس نے ٹھنڈی سانسیں بھرنا شروع کر دیں تبھی رکیں جیسکا کیے نے آواز دی۔

"ارے یہ کیسا پارسل ہے؟" ایتھل چلائی۔ "یہ میرے لیے ہے۔ یونانی ٹکٹ؟ واہ بہت خوب ....."

اُس پارسل میں سمندر پھولوں کی پود تھی جو مسز فوین نے ایتھنز سے بھیجی تھی تاکہ ایتھل انھیں اپنی نرسری میں لگا سکے۔

"ہائے اللہ! اس پودے نے تو بیتے دنوں کی یاد دلا دی۔ آپ کو یاد ہے پاپا وہ سمندر پھول کتنے حسین تھے۔ اور دیکھیے ذرا یہ پودا یونانی اخباروں میں لپٹی ہوئی ہے دیکھوں تو ذرا یونانی اب بھی پڑھ لیتی ہوں کہ نہیں۔ یاد ہے پاپا تب تو میں خوب پڑھ لیا کرتی تھی۔"

وہ تو مسلسل بولتی رہی اس خیال سے بھی تاکہ باہر کھیلتے بچوں کی ہنسی کی آواز اندر نہ آسکے۔ وہ ہنسی جو ناشتہ کے وقت طوفان کھڑا کر سکتی تھی اور مسٹر لوکس کا پارہ چڑھا سکتی تھی۔

"پاپا سنیے تو ایک دیہات میں زبردست حادثہ .....؟ اف یہ تو بڑی افسوس ناک خبر ہے۔ پچھلے منگل کو پیلیناؤں میں جو کہ میسینا کے علاقے میں واقع ہے ایک بڑا دل دہلا دینے والا حادثہ ہو گیا۔ ایک چنار درخت ..... پاپا میں ٹھیک پڑھ رہی ہوں نا ..... رات کے وقت گر پڑا .... اور ذرا ایک منٹ دیکھیے .... اُف کمبخت شہر کے پانچ باسیوں کو موت کے منہ میں پہنچا دیا۔ وہ لوگ سامنے بالکنی میں بیٹھے تھے .... ماریا جو معمر عورت تھی اور اس کی ادھیڑ عمر کی بیٹی جو چھیالیس سال کی تھی۔ ان دو کے جسم تو پہچانے جا سکے جب کہ اس عورت کے پوتے .... اور ..... باقی تو پڑھنا مشکل ہے۔ کاش میں نے یہ خبر پڑھنے کی کوشش ہی نہ کی ہوتی۔ اور ہاں پاپا اسی جگہ تو ہم لوگ ٹھہرے تھے جب بہار کے موسم میں یونان گئے تھے۔ یاد ہے نا ..... !"

ہاں میں نے وہاں دوپہر کا کھانا کھایا تھا" مسٹر لوکس کے چہرے پر دکھ کا ہلکا سا شائبہ تھا۔ اور چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ "ہاں شاید اسی جگہ ترجمان نے ستو خریدا تھا۔"

ہاں ہاں ..... ایتھل گھبرائی گھبرائی سی بولی۔

"ہاں وہی جگہ جہاں ترجمان نے ستو خریدا تھا۔ ہائے کتنا بڑا غضب ہوا۔"

ہاں واقعی غضب ہوا؟" مسٹر لوکس بولے ان کا دھیان برابر باہر شور مچاتے بچوں کی طرف لگا ہوا تھا۔"

"اُف میرے خدا .... پرانا اخبار ہے۔ یہ واقعہ

اپریل میں ہوا تھا۔ یہ حال کا نہیں ہے۔ اٹھارہ تاریخ منگل کی رات۔ اگر ہم رُک جاتے تو اسی جگہ ہوتے "

تو ہم تھے تو وہیں..... انھوں نے کہا۔

ایتھل نے کلیجہ تھام لیا اس سے قطعاً بولا نہیں جا رہا تھا۔ " پیارے پاپا میں تو ضرور کہوں گی یاد کیجیے آپ وہاں رُکنا چاہ رہے تھے۔ اور وہ جنگلی لوگ آپ کو وہاں روکنا چاہ رہے تھے وہ سب مر چکے ہیں۔ خبر کے مطابق وہ پوری جگہ اب ایک کھنڈر بن چکی ہے یہاں تک کہ چشمے نے بھی اپنا راستہ بدل دیا ہے۔ پاپا اگر اللہ مدد نہ کرتا تو ہم سب کے سب ختم ہو گئے ہوتے۔ مسٹر لوکس نے غصے سے اپنا ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔"

" گورنس سے بات کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا میں مکان مالک کو لکھوں گا کہ " جن وجوہات کی بنا پر میں مکان چھوڑ رہا ہوں وہ یہ ہیں۔ " کتا بھونکتا ہے۔ پڑوس کے بدتمیز بچے ناقابلِ برداشت ہیں اور مجھے بہتے ہوئے پانی کی آواز سے سخت چڑ ہے "

ایتھل نے ان کی بکواس پر کچھ بھی نہ کہا وہ توبہت خوف زدہ تھی اس خیال سے کہ وہ لوگ اگر جلد وہاں سے فرار نہ ہوئے ہوتے کیا ہوتا... ہائے تو پھر کیا ہوتا...

اتنی زبردست، حیرت انگیز نجات ہی ہم کو خدا کے وجود میں یقین دلاتی ہے " مسٹر لوکس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، وہ خط لکھنے میں مصروف تھے۔

---

* ڈاکٹر حسینی شاہد، ضیاء الدین قادری ایڈیٹر رہنمائے دکن، محمود انصاری ایڈیٹر منصف، اعجاز قریشی، سر مرتاس الحسنی، امجد باغی، مصطفےٰ کمال، نصرت محی الدین اور دیگر اصحاب۔

<u>(اردو نامہ صفحہ (۴۰) سے آگے)</u>

جی رام ریڈی کو ایک یادداشت حوالے کرتے ہوئے جا
میں آصف سابع چیر کے قیام اور سلطان العلوم یا
نیز نظام ریسرچ فیلوشپ کی تجاویز پیش کیں۔ وائس
ان تجاویز کو عملی صورت دینے کے سلسلے میں اپنی سا
کیا۔ نظام صدی تقاریب مارچ ۱۹۸۳ء میں م
والی ہیں۔ صدر کمیٹی جناب آصف پاشاہ اور معتمد
مظہر الحق قادری نے پریس نوٹ میں اس امر کا

○ ادارہ معراجِ ادب کی طرف سے بزرگ شاعر
کے مجموعہ کلام زودِ سخن کی رسمِ اجرا کا جلسہ اردو گھر میں
حضرت آغا داؤد ثانی نے رسمِ اجرا انجام دی۔ جن
قریشی ایڈیٹر بھارت نیور اور جناب خورشید جنیدی
زور کی شاعری پر اظہار خیال کیا۔ جناب بشیر وارثی۔

۸ ار اکتوبر: یونی ورسٹی آف حیدرآباد کے اردو
کی افتتاحی تقریب کو جس کی صدارت ڈاکٹر گیان چند
شعبہ اردو نے کی۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت اور ڈاکٹر
رضوی کے علاوہ طلبا و قائدین نے مخاطب کیا۔

۲۰ ر اکتوبر: آندھرا پردیش میں اردو کے مل
پر حکومت سے نمایندگی کے سلسلے میں مختلف اردو
کے سربراہوں کا مشاورتی اجلاس اردو ہال میں منع
اور ایک مسودہ تیار کیا گیا جسے ریاستی چیف منسٹر کو
دیا جائے گا۔ اس مشاورتی اجلاس کی صدارت
سید عبد المنان نے کی، مخاطب کرنے والوں میں
حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، اور مسز سکارہ
چندر سریواستو ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی، منوہر را
کے پل ہنمندرا، آصف پاشاہ صدر ریاستی انجم

محمد علی اثر

غواصی کی نودریافت غزلیں

(سلسلہ سب رس ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۲ء سے آگے)

۲۲

معشوق وے جو اس تے کچ ذوق پائے عاشق — دیکھت جمال اس کا بے سُدھ ہو جائے عاشق
معشوق وے جو اس کے عشق ہور وصال پر تھے — ہوتا اپچھے زیادا ہر دم صفائے عاشق
معشوق وے جو اس کے آب حیات ایسے — نرل نچھل ادھر تھے ہو سیر کھائے عاشق
معشوق وے جو آپچھے اس کے مٹھے بچن سُن — سر پانو لگ پگل جا پانی ہو دھائے عاشق
معشوق وے جو زینت ہور زیب دیکھ اس کا — ہر بال کوں زباں کر ہر دم سرائے عاشق
معشوق وے جو اس کے چھند بند دیکھ تلتل — مطلق غواص نمنے حالت میں آئے عاشق

۲۳

صاحب جمالاں یاد جب تج حُسن کا کرتے نمک — لاجوں تھے گلجا آپنا ظاہر کرن ڈرتے نمک
مجنوں ہو سارے قدسیاں گھر گھر اُجاتے شور آج — رخسار حوراں کے اگر ذترا ترا دھرتے نمک
کالے بھنور سے جو الک تیرے چھٹے ہیں دو طرف — سو حُسن کے اسمان کے بادل سو جوں جھرتے نمک
منج عاشقاں کے جیو پر یکد تیر تھے سٹنے بدل — تج لب دو منتر کار ہو تلتل کوں منتر تے نمک
یا بھیک تیرے دان تھے چندا اپتم کا ہر رین — جا گیر ہو اسمان کا تاریاں میں جا بھرتے نمک
دیدے ہو دریائی میرے تج حسن کے دریا پہ چڑ — کشتیاں میں دل ہور جیو کی تج ناز کا بھرتے نمک
غواص یو شیریں غزل بے مثل جو بولیا ہے توں — مطلعے تھے ہے مقطعے تلک اوّل شکر سرتے نمک

۲۴

ٹک ترا گل ہے من مرا بلبل — دیکھ اس گل کوں ہوؤں میں بلبل

مست ڈولتی چمن میں جب توں آئے
رُک چمن کے دیویں سمار

پھول رنگا رنگی جھڑیں کھِل کھِل
جب اُدھر کھول توں ہنسے

چار قل کے بدل سنجے بس ہے
تیرے ہت کی صراحی کا

غمزہ برچھے دل ہوے دلاں کے جب
تج نین ناز کا چھوڑے

منج کوں لبدائیں جو بناں تیرے
گانٹ چولی کے جائیں جب کھُل

کیوں سراوے نہ سب سکیاں میں تج
ہر گھڑی شاہ عبداللہ تجھ

۲۵

اے چھبیلی آج تیرے چھند ہور چھب کو سلام
تج گلابی گال کوں ہور اس میٹھے لب

اس تیرے بالاں کوں ہور اس مست انکھیاں کوں دعا
ہم گھنگھر والے تیرے بالاں کے کھب

ناز سوں گرداں ڈب ڈوگ ڈگ جو آتی ہے ہلوں
اُس ہلوں آنے کی ڈوگ ڈگ ہور اس ڈب

ہے مرا مطلب یہی جو دل میرا لیوے چرا
ہم میرے دل کوں صلا ہم تیرے مطلب

رتیج رج محبوب پر خوش آج غواصی کیا
سر تھے پاواں لگ جتے ہیں چھب تیرے سب

۲۶

گذری ہے آدھی رات اس رات جاؤں پھیر کاں
سنگات تیرے آؤں گا ہے کہہ تیرا مند

بھو تیج ہوا ہے دل میرا منج تھے دیوانا اے سکی
جو کہ رکھوں اس بند کر تج زلف کا زنجیر

دیکھیا ہوں تصویراں بہوت بے مثل تصویراں دلے
اے دھن تیری تصویر سا عالم منے تصو

آچھا نمک تج حسن کا بھید یا ہے من میں خوب سب
جاگا تل اتنا نئیں کہیں بھی میں لگاؤں چیز

سینا کیا ہوں میں ہدف اتنا کے دیکھوں گا ٹک ایک
دھرتا ہے صاقی کس وضا تیرے پلک کا تیر

سب عاشقاں معشوق تھے اپنے ہوے ہیں کیمیا
جو وو ہوے تیوں ہوؤں میں تج عشق کا

عالم بحث کرنے کتے آتا ہے منج غواص سوں
بے شد کروں گا مکہ اسے تج حسن کا تفس

۲۷

نہ کوئی معشوق یاں ایسے جو اس سوں لا تو جا دل میں
نہ کوئی عاشق ہے یاں ایسا جو بیسوں دل سوں

کہاں ہمدرد وو میرا جو تکیں اس سوں ہمدم ہو
ایس پر لیوں کر آسان غربت کا یو مشقت

کسی ڈالی پہ اس بن میں کھلیا وو پھول نیں دستا
بھنور جس پھول کا ہو کر ہوا ہوں خوشحو

بجھانے آرسی میں مکہ اسے عادت ہے کر دائم
رہیا ہوں آرسی کر صاف دل اس کے مق

اردو نامہ

وقار خلیل

اردو کی، علمی، ادبی، تہذیبی خبریں

یکم ستمبر: محترمہ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو حکومت ہند کا روزنامہ منصف کی طرف سے خیر مقدم کیا گیا۔ جناب محمود انصاری ایڈیٹر منصف نے ڈاکٹر فہمیدہ کے ڈائرکٹر ہونے پر جنوبی ہند اور دکن کے اردو والوں کی طرف سے مبارک باد پیش کی۔ صدر جلسہ محترمہ جیلانی بانو نے ڈائرکٹر TUB کی گلپوشی کی۔ ڈاکٹر انور معظم، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر حسینی شاہد اور جناب کے یم خان نے ترقی اردو بیورو کی کارکردگی اور آئندہ کئے جانے والے کاموں پر بے لاگ خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر فہمیدہ بیگم سے اردو بورڈ کے پلیٹ فارم سے اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں فعال کردار ادا کرنے کی توقعات کا اعادہ کیا۔ ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے بیورو کی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتلایا کہ ایک اردو یونیورسٹی کے امکانی قیام کے پیش نظر TUB نے اکنامکس پولیٹیکل سائنس اور طب جیسے موضوعات پر لٹریچر کے ساتھ ساتھ کتابوں کی تیاری میں مصروف ہے۔ اس جلسہ میں اردو انسائیکلوپیڈیا اور لغات کی تیاری کی آواز بازگشت بھی سنی گئی۔

۲ ستمبر: یونیورسٹی آف حیدرآباد کے شعبہ اردو کو ڈاکٹر عنوان چشتی ریڈر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے بعنوان "حسرت موہانی کی شاعری میں روایت اور تجربے" مخاطب کیا۔ پروفیسر گیان چند جین نے صدارت کی اور ڈاکٹر مجاور حسین رضوی نے شکر ادا کیا۔

۶ ستمبر: مرکزی وزارت تعلیم کے باختیار ادارہ ترقی اردو بیورو کے زیر انتظام ادارۂ ادبیات اردو میں قائم شدہ مرکز خوشنویسی میں ۱۰ طلبا و طالبات کو بعد انٹرویو سال اول میں داخلہ دیا گیا۔ ڈاکٹر فہمیدہ ڈائرکٹر TUB نے ۱۳ اگست کو انٹرویو لیا اور یکم ستمبر سے اساتذہ عبدالقادر جاہر رقم اور بدرالدین صاحبان تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔

○ ریاستی اقلیتی کمیشن کے صدر جناب آصف پاشاہ نے بصیر افضل کے ناول "پیاسے پتھر" کی رسم اجرا کے جلسہ کی صدارت کی اور مسٹر یم باگا ریڈی ریاستی وزیر بھاری مصنوعات نے ناول کی رونمائی کرتے ہوئے مصنف کو مبارکباد دی۔ جناب مصطفےٰ شروانی، خواجہ معین الدین اور علی احمد مدنی نے مخاطب کیا۔

۱۱ ستمبر: حیدرآباد کے مشہور افسانہ نگار جناب اکرام جاوید کے افسانوی مجموعہ "خاک گزیدہ" کی رسم اجرا مسٹر یم باگا ریڈی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے صدارت کی۔ جناب آصف پاشاہ، جناب ایم اے عزیز ریاستی وزیر اوقاف، مسٹر یدمہ ویرا ایڈیٹر ملاپ، جناب محمود انصاری ایڈیٹر منصف، ڈاکٹر یوسف سرمست، ڈاکٹر مجاور حسین رضوی، تلگو ملک الشعرا ڈاکٹر داسرتھی، مسٹر چندر سریواستو، محترمہ طیبہ بیگم، جناب بدیع حسینی اور جناب یوسف ناظمی

نے اکرام جاوید کی شخصیت اور فن کو خراجِ تحسین ادا کیا۔

۱۲ر ستمبر: محفل خواتین کا ماہانہ ادبی اجلاس محترمہ عائشہ عبدالقادر کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے تاثراتِ سفرِ پاکستان سنائے۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پر محترمہ شفیقہ قادری نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ خواتین شعراء نے کلام سنایا اور محترمہ فاطمہ عالم علی نے شکریہ ادا کیا۔

۱۴ر ستمبر: ریاستی ہندی اکیڈیمی کی طرف سے "یوم ہندی" کے موقع پر دکن اور ہندی کے زیرِ عنوان سمینار اور سہ لسانی مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس مشاعرہ میں اردو کے ملک الشعراء اوج یعقوبی، شاذ تمکنت، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر غیاث صدیقی، بانو طاہرہ سعید اور صلاح الدین نیر نے کلام سنایا۔ صدر اکیڈیمی راجکماری اندرا دیوی نے شکریہ ادا کیا۔

○ عباس یونین کلب کے زیرِ اہتمام جناب نریندر لوتھر کی صدارت میں کل ہند مشاعرہ ہوا۔ جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست اور مولانا اختر زیدی مہمانانِ خصوصی تھے۔ مہمان شعرا نذیر باقری، علی مہدی وحشت اور ثقلین حیدر کے علاوہ اوج یعقوبی، امیر احمد خسرو، علی احمد جلیلی، خیرات ندیم، رحمٰن جامی، فیض الحسن خیال، صلاح الدین نیر، صادق نقوی، آغا سروش، رشید شہیدی، کیف کرانی، مقصود جاوید اور عزیز النساء صبا نے کلام سنایا۔

۲۶ر ستمبر: اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب عبدالمحمود ڈائرکٹر نظامس اردو ٹرسٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب نیپال سنگھ ورما لکچرار ہندی انوارالعلوم کالج نے ہندی ادب پر اور محترمہ فاطمہ عالم علی نے خواتین کی ادبی خدمات پر مقالے سنائے۔ جناب صلاح الدین نیر نے نظامت کی اور شکریہ ادا کیا۔

۲۹ر ستمبر: حیدرآباد کے نوجوان مصنف اور ادیب جناب مجید بیدار لکچرار مولانا آزاد کالج اورنگ آباد کو دکنی تذکرے مقالے پر پونے یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔

اکتوبر ۱۹۸۲ء

۳ر اکتوبر: برصغیر کے نامور محقق اور ماہر لسانیات ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم بانی ادارۂ ادبیاتِ اردو کی ۲۰ ویں برسی کے موقع پر ادارہ کی طرف سے یومِ زور کا انعقاد ایوانِ اردو میں عمل میں آیا۔ جناب خواجہ عبدالغفور سکریٹری مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی نے صدارت کی۔ جناب میر اکبر علی خاں سابق گورنر یوپی نے بہ حیثیت مہمان خصوصی خطاب کیا۔ ابتداً جناب سید ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) معتمد اعزازی ادارہ ادبیات اردو نے خیر مقدمی تقریر کی۔ ڈاکٹر یوسف سرمست ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونی ورسٹی۔ حضرت علی احمد جلیلی، ڈاکٹر غیاث صدیقی، جناب احمد علی ادیب اور جناب میر احمد الدین علی خاں ریسرچ اسکالر حیدرآباد یونیورسٹی نے مقالوں کے ذریعہ ڈاکٹر زور کی علمی، ادبی اور تحقیقی سرگرمیوں اور ان کی شخصیت کے نقوش کو روشن کیا۔ اس موقع پر گولڈن جوبلی تقاریب ادارہ

۴۸

میں اپنا عشق باطن کا کسے اظہار نا کر سوں ‌‌ درونے میں کے باتاں کیس یکایک بھار نا کر سوں

خوشی تو مکہ دکھائی ہے ولے سوگند کھاتا ہوں ‌‌ کہ جیسی منج خوشی ہوئی بی بغیر از یار نا کر سوں

نہ کر سوں آج تھے رندی نہ پی سوں مد کے پیالے کر ‌‌ کیا تعالیٰ براتؔ توبہ ولے اتبار نا کر سوں

مل اس کے زلف سوں ایک ہور لے منج کاں سکت ہوگا ‌‌ تنگ دبلا کر اس تن کوں جو باریک تار نا کر سوں

خضر کے سار ہووے باج اس امرت چشمے تیئں ‌‌ جھکیئں بدنام اپس کوں میں سکندر سار نا کر سوں

بڑا چنچل وو ہے نقطے تن چیکے سینٹر سے ۔ نا ‌‌ اگر چو ند میرعیں اس کے اپس پرکار نا کر سوں

غواصی شہ کی مجلس میں نہ پاسوں تو تلک زینت ‌‌ جو سر تھے پانو لگ اپسیں دُرِ شہوار نا کر سوں

۴۹

جلالاں شاہ کے چُن چُن بچن نادر لیا ستے ہیں ‌‌ دلاں کے آسماناں کے ہو تارے جگمگاتے ہیں

غزل ہور گیت ہر یک جو کتے ہیں عاشقانہ شہ ‌‌ جھرتے امرت کے ہو عشق بازاں کو جلاتے ہیں

بچن قطب جہاں کا ہر بچن کا پادشہ ہے کر ‌‌ ملک آ عرش کے لک آرزو سوں لگ کہا تے ہیں

لطافت ہور نزاکت سوں بھریا سو شعر سُن شہ کا ‌‌ صفا پا مرحبا بیجیں جکوئی کامل کہا ستے ہیں

علی شاہ ولایت کی عنایت کا نظیر ہے کر ‌‌ نوے مضموں اُبل یوں شاہ کے دل میں تے آتے ہیں

جہاں تاں جگ میں پسرے دیکہ جوتی شاہ کے باتاں ‌‌ رتن کھاناں کے ہور موتی دریا کے رشک کھاتے ہیں

بلاغت اور فصاحت میں نہیں اس شہ کوں جوڑا کر ‌‌ چندر ہور سور فلکے فلک نس دن جا سرا تے ہیں

نہ کیوں قرباں ہووُں اس سجن کے ہر بچن پر میں ‌‌ کر صیقل ہو کے میرے دل کے درپن کو منجاتے ہیں

جہاں لگ اس جگت گرو شاہ کے سارے غلاماں میں ‌‌ یہی دولت منجے بس جو غواصی کوں بُلاتے ہیں

۱۔ اچھنا۔ رہنا ۲۔ دھانا۔ تیزی سے آگے بڑھنا ۳۔ سراہے ۴۔ [illegible] ۵۔ زلف۔ بالوں ۶۔ [illegible] ڈالنے کے بجائے [illegible] دیکھ کر [illegible] درخت [illegible] خوف زدہ [illegible] رہنا [illegible] مکر و فریب [illegible] آہستہ [illegible] عمر [illegible] کہاں [illegible] سچ بس گیا [illegible] پکڑا [illegible] دونوں [illegible] نبھانا۔ مجھ سے دیکھنا [illegible] کر سکوں [illegible] ہونے [illegible] چاروں طرف [illegible] جب [illegible] بھرلے [illegible] ہیں [illegible] کے بجائے گرد۔

National Fine Printing Press, Charkaman, Hyd.

کے اشاعتی پروگرام کے تحت ڈاکٹر زور کی تین مطبوعات "داستانِ ادب حیدرآباد، دکنی ادب کی تاریخ اور تاریخ ادب اردو" کے سکنڈ ایڈیشنوں کی رسم اجرا انجام پائی۔ تذکرہ مخطوطات ادارہ کی چھٹی جلد (مرتبہ پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی اور ڈاکٹر محمد علی اثر) کی اشاعت کی تکمیل کا مژدہ بھی سنایا گیا۔ جناب محمد منظور احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور شکریہ ادا کیا۔

۴ر اکتوبر: عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ۳ نئے لکچراروں کا تقرر عمل میں آیا، یہ تینوں حضرات اردو کے جانے پہچانے ادیب اور شاعر ہیں مختلف کتابوں کے مصنف اور اسکالر ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی اثر اور ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کو پہلے ہی تدریسی تجربہ حاصل رہا ہے نئے لکچرار ڈاکٹر حفیظ الدین حسن (عقیل ہاشمی) ہیں۔

۵ر اکتوبر: ادارۂ ادبیات اردو کے لائف ممبر جناب الحاج محمد ترمیم الدین انصاری بعارضۂ قلب رحلت کر گئے انصاری مرحوم نے اپنی زندگی کا طویل عرصہ ادارہ کی خدمت میں صرف کیا۔ رحلت کی اطلاع ملنے پر ایوانِ اردو احترام اداروں میں ایک دن بند کردیا گیا۔ جناب سید ہاشم علی اختر معتمد اعزازی ادارہ، جناب محمد اکبرالدین صدیقی معتمد کتب خانہ اور ادارہ کے دیگر کارکنوں نے جلوس جنازہ میں شرکت کی اور پسماندوں سے اظہار تعزیت کیا۔

۹ر اکتوبر: محفل خواتین کا ماہانہ اجلاس محترمہ سلمیٰ کمال الدین کی صدارت میں ہوا۔ محترمہ رفیع رؤف لکچرار انوار العلوم ویمنس کالج نے "دلی کی نہ تھیں گلیاں اوراق مصور تھے" کے زیر عنوان خورشید خاکہ اور محترمہ فاطمہ عالم علی نے شاعروں پر انشایہ سنایا۔

۱۰ر اکتوبر: انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے انتخابات میں ڈاکٹر سید عبدالمنان (صدر) پروفیسر حبیب الرحمٰن (نائب صدر) ڈاکٹر حسینی شاہد (معتمد عمومی) جناب مسرت نواس لاہوتی (شریک معتمد) اور مسز نواب میر احمد علی خان، پروفیسر فضل الرحمٰن، ڈی راما نج راؤ، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، پی نرسا ریڈی، سید رحمت علی، کے، ایل جمند را،

منوہر راج سکسینہ، پروفیسر منظور عالم اور غلام یزدانی اراکین عاملہ منتخب ہوئے۔

۱۱ر اکتوبر: سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز کے شعبہ عربی کی طرف سے کل ہند عربک سمینار کے موقع پر بصدارت جناب شاذ تمکنت محفل مشاعرہ آراستہ ہوئی دہلی کے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، کشمیر کے اسلم اصلاحی کے علاوہ حیدرآباد کے شعراء علی احمد جلیلی، کنول پرشاد کنول، سعید شہیدی، خیرات ندیم، امیر احمد خسرو، صلاح الدین نیر، صادق نقوی، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، عزیز النساء صبا، ثریا مہر اور معتمد مشاعرہ ڈاکٹر اشرف رفیع نے کلام سنایا۔

۵ ریاستی اردو اکیڈیمی کی طرف سے جدید نامور شاعر جناب قاضی سلیم رکن پارلیمنٹ اور جناب عزیز قیسی کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ ڈاکٹر غلام خوند میری نے صدارت کی۔ جناب اختر حسن مددگار معتمد اکیڈیمی نے ان اصحاب کے فکر و فن پر عالمانہ اظہار خیال کیا۔ مہمان شعراء نے کلام سنایا۔

۱۷ر اکتوبر: آخری آصفی حکمران میر عثمان علی خان (حضور نظام آصف سابع) کی صدی تقاریب کمیٹی کے وفد نے جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر

(باقی صفحہ (۴۴) پر ملاحظہ ہو)